نیا دور
اکتوبر، نومبر ۱۹۹۴ء
اودھ نمبر
حصۂ دوم

عنوانات

اودھ نمبر حصہ دوم

جلد ۴۹ نمبر ۷، ۸
اکتوبر، نومبر ۱۹۹۴ء
ایڈیٹر
سید امجد حسین
فون : ۲۱۳۴۷۸
معاونین
محمد الیاس خاں ۔ مبین احمد صدیقی
پبلشر
اتل بگائی
(ڈائریکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش)
مطبوعہ : یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس۔ لکھنؤ
شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ، اتر پردیش
زرِ سالانہ : تیس روپے
عام شمارہ : تین روپے
توسیلِ زر کا پتہ
سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ
انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ اتر پردیش لکھنؤ
خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر نیا دور پوسٹ بکس نمبر ۱۴۶ لکھنؤ
بذریعہ رجسٹری
ایڈیٹر نیا دور انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ
اتر پردیش لکھنؤ
سرورق : ابوالفضل ۔ کاتب و تزئین کار : حسن اختر
فوٹوگرافی : عباس حسنین

حرفِ چند

انسان کی تخلیقی قوتوں کا سب سے بڑا کارنامہ زبان کی ایجاد ہے ــــــ زبان نہ ہوتی تو انسانی سماج گونگوں، بہروں کی دنیا میں بدل جاتا۔ یہی زبان ــــ یہی لفظوں کی دنیا جانوروں اور انسانوں میں فرق پیدا کرتی ہے اور یہ بھی زبان ہی کا چمتکار ہے کہ آج تجارت، صنعت و حرفت، ایجادات اور فنونِ لطیفہ اپنا وجود رکھتے ہیں۔ زبان ہی سے تہذیب کی پہچان ہوتی ہے اور تہذیب کے خدوخال ابھرتے ہیں۔

زبان ہی ایک دوسرے کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ زبان کا اصل مقصد دلوں کو جوڑنا اور نفرت کی دیواروں کو توڑنا ہے۔ زندگی میں پیار کی مٹھاس بھرنا اور ہر طرح کی کڑواہٹ کو نکال پھینکنا ہی زبان کا اصلی مقصد ہے چاہے وہ کوئی بھی زبان ہو۔

اُردو زبان بھی پیار، محبت والی یک جہتی اور تہذیب کی زبان ہے۔ اس پر بحث کرنا کہ یہ دکن میں پیدا ہوئی کہ پنجاب میں کہ ہریانہ میں یا پھر یہ کھڑی بولی کا ایک رُوپ ہے ــــ ماہرین لسانیات کا کام ہے۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ یہ زبان اسی دیس کی ہے اور خاص طور سے ہمارے اتر پردیش کی ہے۔ یہ گنگا جمنا گومتی، سرجو کی لہروں سے دُھلی ہے اور اس میں جو خوشبو ہے وہ گلاب کی بھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ بیلا چنبیلی، جُوہی، کیتکی اور تلسی کی بھی ہے۔ یہ ہمارے آبا و اجداد کی عطا کی ہوئی اور شان دار اور قیمتی وراثت ہے جس پر آج ہم فخر کرتے ہیں اور خوشی کی بات ہے کہ اُردو کو اتر پردیش اور اودھ سے خاص تعلق رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اُردو کے حسن میں جو سلونا پن ہے وہ شامِ اودھ کی دین ہے اور اودھی کا جو اثر اس پر نظر آتا ہے اس نے اس زبان کے رُوپ کو اور نکھار دیا ہے۔

ہمیں اس کا احساس رہتا ہے کہ ادب صرف کچھ اچھے اشعار یا کہانیوں کا ہی نام نہیں ہے بلکہ ادب ہی کے ذریعے ہم کسی عہد یا کسی دور کے تہذیبی خدوخال کو پہچان لیتے ہیں اور ادب ہی کے ذریعے سے ہمیں تاریخ کی ان کڑیوں کا بھی پتہ چل جاتا ہے جن پر کبھی کبھی وقت کا پردہ پڑ جاتا ہے۔

کچھ دنوں پہلے ہم نے اودھ نمبر پیش کیا تھا۔ اس کے بعد بھی کچھ مضامین رہ گئے تھے جو بعد کے شماروں میں شائع ہوتے رہے۔ جب میں نے اودھ نمبر کے اس سلسلے کا مطالعہ کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ ؏

ــــ اب بھی کہنے کو بات باقی ہے ــــ بہت سارے گوشے ایسے رہ گئے تھے جن پر لکھا جا سکتا تھا۔ مجھے بیحد خوشی ہے اور اپنے نوجوان ایڈیٹر نیا دور سید امجد حسین پر فخر ہے کہ انھوں نے اس نمبر میں ادب کے جگمگاتے ہوئے ستاروں کو اکٹھا ہی نہیں کیا بلکہ فرمائش کر کے ان ماہرین سے ایسے موضوعات پر مضامین لکھوائے جن پر نہیں لکھا گیا تھا۔

یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اودھ کے سلسلے میں اب کام مکمل ہو گیا ہے لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ یہ ایک ادبی، سماجی اور تہذیبی دستاویز ہے جو آنے والے برسوں میں لوگوں کو روشنی دے گی اور ہم اپنی شان دار تہذیبی وراثت سے واقف ہو سکیں گے اور ہماری یہ واقفیت ہمارے اندر حبُّ الوطنی، قومی یک جہتی اور اپنی روایات اور اپنی تہذیبی وراثت کو سمجھنے کی اور اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلنے کی قدرت و صلاحیت عطا کرے گی۔

ــــــــــــ اَتُل بَگائی
(ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش)

اپنی بات

وقت کے اُفق میں تہذیبیں غروب ہو جاتی ہیں اور تاریخ اُن کے تذکرے کو گمنامی کی چادر اُوڑھا دیتی ہے۔ بس صرف یہ یاد رہ جاتا ہے کہ کلدانی یا سیمورین یا یُونان کی تہذیبیں بڑی حسین و خوبصورت تھیں۔ آج بھی ان کے آثار نظر آجاتے ہیں لیکن یہ وہ تہذیبی اصنام ہیں جو دیکھنے میں تو اچھے لگتے ہیں مگر جن میں نہ حرکت ہے نہ عمل نہ انسانی تہذیبی تاریخ کو کوئی سمت دینے کا حوصلہ یا ولولہ یا شعور! اس کا سبب یہی ہے کہ ان تہذیبوں کی بُنیاد بہت کمزور تھی، ان کے پاس اعلا انسانی اقدار کا کوئی تصور نہیں تھا، شاید اسی لیے اقبال نے کہا تھا ؎

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

اس کا مفہوم یہی ہے کہ بہت ساری عظیم الشان تہذیبوں کے قصر منہدم ہو گئے، لیکن ہندستانی تہذیب اپنی روایات کے تسلسل کے ساتھ آج بھی دنیا کے لئے مشعل راہ ہے۔ اس لیے کہ ہندستانی تہذیب کی بنیاد کچھ آفاقی اقدار پر تھی ایسی اقدار جن میں رواداری، وسیع النظری، عدم تشدد، مظاہر فطرت کا احترام اور خاکساری جیسی قدریں تھیں۔

ہندستانی تہذیب کے جو مظاہر نظر آتے ہیں، چاہے وہ فنونِ لطیفہ کے کسی شعبے سے تعلق رکھتے ہوں، آج بھی ان سے انھیں اقدار پر روشنی پڑتی ہے اس لئے بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ہندستانی تہذیب صرف ایک خطۂ ارض تک محدود نہیں تھی بلکہ وہ ساری دنیا کے لیے ایک پیغام تھی۔

اسی ہندستانی تہذیب کے آب و گِل سے اٹھارھویں صدی کے اواخر میں اودھ تہذیب کی کونپلیں پھوٹی تھیں۔ یہ تہذیب کہنے کو تو ایک علاقہ تک مخصوص کی گئی تھی لیکن سچی بات یہ ہے کہ یہ ایک رُجحان کا نام تھا ــــ ایک رجحان ــــ جہاں انکساری اور خاکساری باہمی احترام کے تصوّر سے گلے ملتے نظر آتے ہیں "پہلے آپ" کا مشہور تکیۂ کلام اسی رُخ کو اُجاگر کرتا ہے۔ اودھ کی تہذیب کا ایک رُخ یہ بھی تھا کہ اس نے زندگی کے جنگجویانہ پہلو کو بھی حُسن عطا کیا تھا۔ ان کا ذوقِ جمالیات اتنا ستھرا تھا کہ وہ تلوار کے میان سے نکلنے کو بھی "کنارِ شوق سے خوبرو کے جُدا ہونے" کو تعبیر کرتے تھے۔ اعتراضوں کی بھیڑ، نکتہ چینیوں، کے انبوہ اور طنز و تعریض کے ازدحام کی پروا نہ کرتے ہوئے اودھ کی اس تہذیب نے خوش ذوقی، نفاست، آرائش، شائستگی اور حُسن شناسی کے ساتھ امن پسندی کا بھی تصوّر دیا تھا جو ہندستانی تہذیب کے مزاج کے عین مطابق تھا۔

اِسی لئے اودھ سے متعلق تہذیبی دستاویز پیش کرتے ہوئے فخر کا احساس ہوتا ہے کہ ڈیڑھ سو برس کے محدود وقفے میں ایک چھوٹے سے خطۂ ارض پر علم و فضل و دانش و تفکّر کے ساتھ موسیقی، رقص، خطاطی، سپہ گری اور دیگر علوم و فنون کی جو شمعیں روشن ہوئی تھیں آج اس سے ہم اکتسابِ نُور کر رہے ہیں۔

تہذیبی قدریں بدلتی رہتی ہیں، لیکن اس کی بنیاد محفوظ رہتی ہے۔ اودھ کی تہذیب کے مظاہر بدل گئے ہیں لیکن اس کی بنیاد میں جو اعلا انسانی اقدار تھیں وہ آج بھی محفوظ ہیں اور آنے والے کل میں بھی محفوظ رہیں گی۔

یہ اُسی تہذیب کی کرامت ہے کہ اُردو صحافت کی تاریخ میں یہ یادگار واقعہ بھی پیش آیا کہ ایک سال کے اندر ایک موضوع پر دُو خاص نمبر اور دُو عام شمارے پیش کیے گئے۔ اس بار بھی جو ہماری روایات رہی ہیں ان کی پاسداری کرتے ہوئے جن ممتاز ماہرینِ علم و ادب کی جو تخصیص تھی اس پر انھیں زحمتِ نگارش دی گئی ہے۔ اس نمبر کے علمی، ادبی وزن و وقار کے بارے میں صرف اتنا عرض کیا جا سکتا ہے کہ بیشتر ممتاز اور بین الاقوامی شہرت رکھنے والے علمار، ادیبوں اور شعرار کا تعاون ہمیں حاصل ہوا۔ ادارہ ان کا بے حد ممنون ہے۔

اِس خاص نمبر کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ کے ڈائرکٹر محترم اتل بگائی نے اس میں خصوصی دل چسپی لی، جس طرح ایک سرکردہ جنرل اپنے سپاہیوں کا حوصلہ بڑھاتا ہے اور مورچے سر کرتا ہے اسی طرح انھوں نے بھی حوصلہ و عزم دیا، رہنمائی فرمائی اور خود اس شمارے کا افتتاحیہ تحریر فرمایا۔ ان کی سرپرستی اور رہنمائی کا اعلان و اعتراف اودھ کی تہذیب کے عین مطابق ہے۔

رفقائے کار اور معاونین میں جناب اسرار سعید اور جناب مُبین احمد صدیقی نے اپنا بھرپور تعاون دیا۔ ان لوگوں نے جس لگن، انہماک، خلوص، تن دہی، انتھک محنت اور اعلا علمی، ادبی ذوق کا مظاہرہ کیا اس کے ثبوت میں اس نمبر کا ہر لفظ گواہی دے گا۔

☐ ۲ر اکتوبر بابائے قوم مہاتما گاندھی کا یومِ پیدائش ہے۔ سچ یہ ہے کہ یہ تاریخ ایک ایسے نظریے کے آغاز کا دن ہے جس نے دُنیائے انسانیت کو عدم تشدد اور اہنسا کا راستہ دکھایا۔ مہاتما گاندھی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ اپنے نظریات پر عمل پیرا رہے اور انھیں نظریات کی حفاظت کے لئے انھوں نے شہادت کا راستہ اختیار کیا۔ آج ان کے ایک سو پچیسویں یومِ پیدائش پر ادارہ انھیں خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔

☐ نومبر کا مہینہ تاریخ کی عظیم شخصیتوں کی پیدائش کا مہینہ ہے۔ ہندستان کے پہلے وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کا یومِ پیدائش ۱۴ر نومبر ہے۔ مورخ، ادیب، اور پنچ شیل کے معمار تیسری دُنیا کے ذریعہ ناوابستگی کا تصوّر دینے والے نہرو نے امنِ عالم کے لئے دُنیا کو مثبت زاویۂ نظر عطا کیا اور عالمی تاریخ میں اپنی جگہ بنائی۔

یہی نومبر کا مہینہ امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد کی پیدائش کا بھی مہینہ ہے۔ مولانا آزاد جہدِ آزادی کے میرِ کارواں تھے ادارہ نیا دور ہندستان کے ان عظیم فرزندوں کو صمیم قلب سے خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔

سید امجد حسین
ایڈیٹر

پیغام

راج بھون
لکھنؤ

श्री राज्यपाल
उत्तर प्रदेश

اودھ کا علاقہ صرف اُترپردیش ہی کے لئے نہیں بلکہ پُورے ہندستان کے لئے تاریخی و تہذیبی اعتبار سے بے حد اہمیت کا حامل رہا ہے۔ عہد آزادی میں اودھ کی قربانیاں ناقابلِ فراموش رہی ہیں، دوسری طرف آرٹ، کلچر، تہذیب اور ادب کو اس علاقے نے جس طرح سے سنوارا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ہماری قومی تہذیب کے لئے اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ پدماوت کے لکھنے والے ملک محمدؐ جائسی اسی علاقے کے ایک ممتاز فرد تھے اور یہیں کے اسٹیج پر پہلی بار رہس لیلائیں اور رادھا کنھیاؔ کا قصہ منظوم شکل میں امانت اور واجد علی شاہ کے زورِ ذکر سے اسٹیج کیا گیا۔

یہاں کا فنِ تعمیر، رقص، موسیقی، یہاں کی صنعتیں ان سب میں پُورے دیش کیلئے ایک سندیش ہے، ایک چھپا ہوا پیغام ہے جو پچھلے دو سَو برس سے آج بھی اور آنے والی صدیوں تک بھی لوگوں کو جگاتا رہے گا اور انھیں اُن کے 'ایک ہونے کا' احساس بھی دلاتا رہے گا۔

مجھے بے حد خوشی ہے کہ ادارہ 'نیا دور' اودھ کے سلسلے میں اپنے اس نمبر کے ذریعہ اپنے اس سفر کو منزل تک لے جا رہا ہے جو اس سال کی ابتدا میں شروع ہوا تھا۔

میری نیک خواہشات اور مستقبل میں ایسے ہی اعلا پائے کے خصوصی نمبر نکالنے کی دُعائیں ادارے کے ساتھ ہیں۔

یکم نومبر ۱۹۹۴ء

(موتی لال وورا)
گورنر اترپردیش

سچیوالیہ انیکسی
لکھنؤ
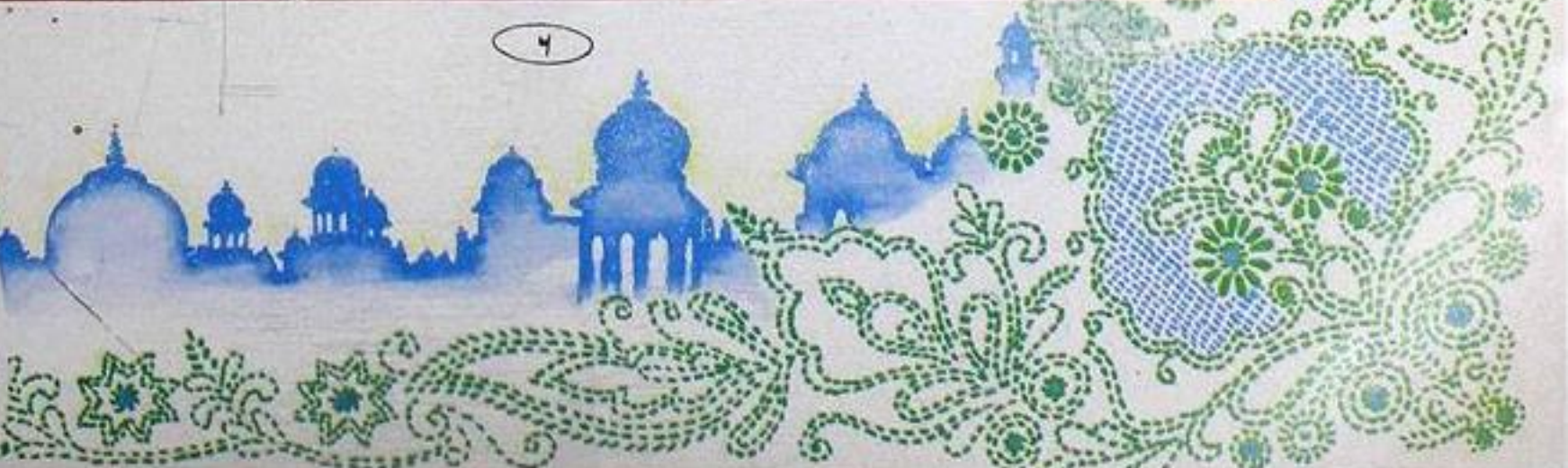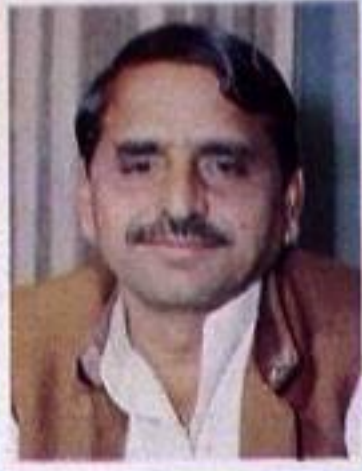
وزیر اعلا
اتر پردیش

۲۶ر اکتوبر ۱۹۹۴ء

پیغام

اُردو کی مٹھاس میں گنگا جمنا کے ساتھ گومتی کا پانی بھی شامل ہے۔ اس زبان نے ہمیں بہت کچھ دیا ہے۔ اُس زمانے میں بھی جب چاروں طرف خوش حالی، فراغت، بھائی چارہ اور امن وامان کا دَور دَورہ تھا اس وقت اس زبان نے اپنے ادب کو مالامال کر کے ہمیں ایک نئی سوچ اور ایک نئے راستے کی طرف توجہ دلائی تھی اور پھر ۱۸۵۷ء میں اور اس کے بعد جب سارا دیش سنگھرش کر رہا تھا، جوجھ رہا تھا، اس وقت بھی اُردو "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ لگا کر ہمارے کام آئی تھی۔

آج بھی پیار و محبّت کی یہ میٹھی زبان دلوں کو جوڑ رہی ہے۔ انھیں ایک کر رہی ہے اس کے ادب کا ہر حصّہ شاعری ہو، نثر ہو اپنا فرض انجام دے رہا ہے لیکن سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ اُردو صحافت بھی پُوری طرح سرگرم ہے۔

ہمارے اخبار اور رسالے اپنا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ خاص طور سے ہمارا محکمۂ اطلاعات جو 'نیا دور' شائع کرتا ہے، اس 'نیا دور' کی اپنی ایک تاریخ ہے یہ ادبی، تہذیبی اور ثقافتی رسالہ ہے اس نے اب تک کئی عنوانات پر نمبر نکالے ہیں۔ پچھلے برسوں میں اس کے دو نمبر بہت مقبول ہوئے۔ 'قومی یک جہتی نمبر' اور 'اردو نمبر' اب پھر مزید پھیلاؤ کے ساتھ، جو جو عنوانات چھوٹ گئے تھے انھیں شامل کر کے نیا دور اردو نمبر نکال رہا ہے۔ میں اس نمبر کا خیر مقدم کرتا ہوں اور مجھے پورا یقین ہے کہ اُردو پریمیوں میں یہ نمبر بہت مقبول ہوگا اور جو ہمارا مقصد ہے یعنی دلوں کو جوڑنا، قومی ایکتا کو بڑھانا، اپنی تہذیبی وراثت سے سبق سیکھنا ــ ان تینوں مقاصد کی تکمیل میں یہ نمبر اپنا تاریخی فریضہ انجام دے گا۔

نمبر کی کامیابی کے لئے نیک تمناؤں کے ساتھ۔

(ملائم سنگھ یادو)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

أبو الحسن علي الحسني الندوي
ندوة العلماء - لكهنؤ - الهند

پیغام

اودھ ہندستان کی علمی، تہذیبی، ادبی و تصنیفی تاریخ میں ایک خاص مقام رکھتا ہے بادشاہِ ہند شاہجہاں اس کو ہندستان کا شیراز کہتا تھا۔ یہاں فضلاء، ادباء، شعراء اس تعداد میں اور اس درجے کے پیدا ہوئے کہ انھوں نے ہندستان کے فکر و ذہن، اظہار بیان کے طریقے اور طرز و اسلوب پر اثر ڈالا، پھر اس کے مرکزی شہر دار السلطنت لکھنؤ نے قدیم دینی، علمی، اخلاقی تعلیم کا وہ نصاب اور تصنیف شدہ کتابیں دیں، جن کو پورے ہندستان نے سینے سے لگایا اور تقریباً برصغیر ہند کے تمام مدارس نے اس کو اپنا نصاب درس بنالیا۔ اب بھی اس خطۂ ملک میں بہت سے ایسے مرکزی ادارے، تعلیم گاہیں اور کتب خانے اور تصنیفی مراکز پائے جاتے ہیں، جن کا حق تھا اور رہے گا کہ اودھ کو تاریخ اور حالاتِ حاضرہ کی روشنی میں تعلیم یافتہ دُنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔

اس بنا پر ہر طرح مناسب تھا کہ رسالہ "نیا دور" جس کا نام ہی حقیقت پسندی کو ظاہر کرتا ہے اور ایک ذمہ داری کا اعلان بھی ہے، اودھ پر خاص نمبر نکالے، جس میں ان سب خصوصیات کو، جن کا تذکرہ کیا گیا، نمایاں طور پر پیش کیا جائے۔ ہمیں معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ اس نے اپنی ذمہ داری کو محسوس کیا اور اودھ پر خاص نمبر نکالا، امید ہے کہ وہ نہ صرف دلچسپی کا باعث ہوگا بلکہ قارئین و ناظرین کی معلومات میں مفید اضافہ کرے گا۔

میں مدیر رسالہ سید امجد حسین صاحب کو اس ادائے فرض اور احساسِ ذمہ داری پر اور اس کے خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کرنے پر مبارکباد دیتا ہوں۔

راقم
ابوالحسن علی ندوی

(مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)
ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۱۲ ربیع الاول سنہ ۱۴۱۵ھ
۱۲ اگست ۱۹۹۴ء

اودھ نمبر

حُسینیۂ ارشادیہ رُدولی
موسوم بہ
امامباڑہ چودھری صاحب
رُدولی

جنگِ آزادی کی یادگار
مُوسیٰ باغ
لکھنؤ

△ ہنومان سیتو مندر۔ لکھنؤ

◁ شری لکشمن جی کا مجسمہ جو لکشمن پارک لکھنؤ میں نصب ہے۔
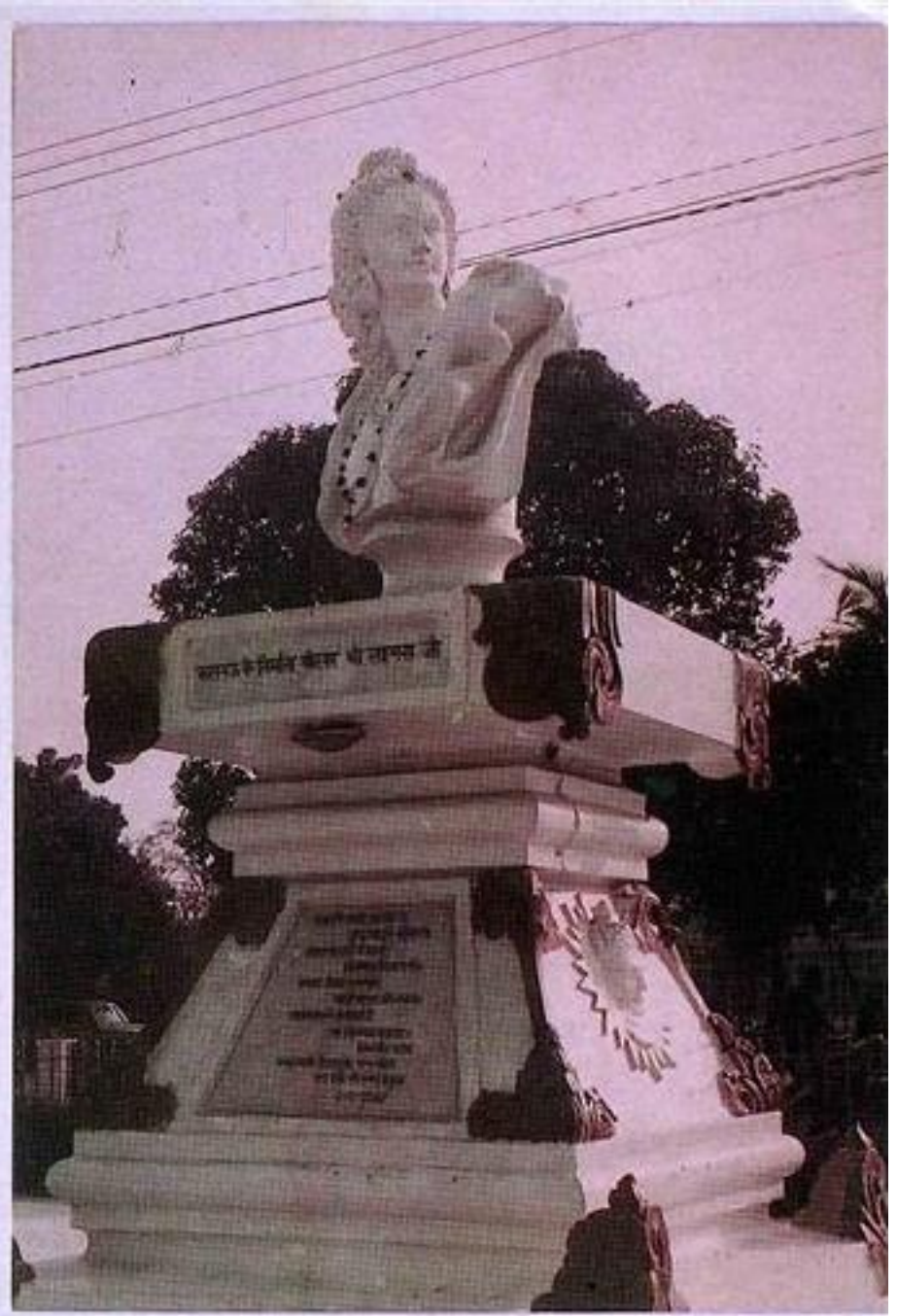
بابا ہزارا کا مندر اور مزار جو تقریباً تین ۳۰۰ سو برس قدیم ہے۔

غزل
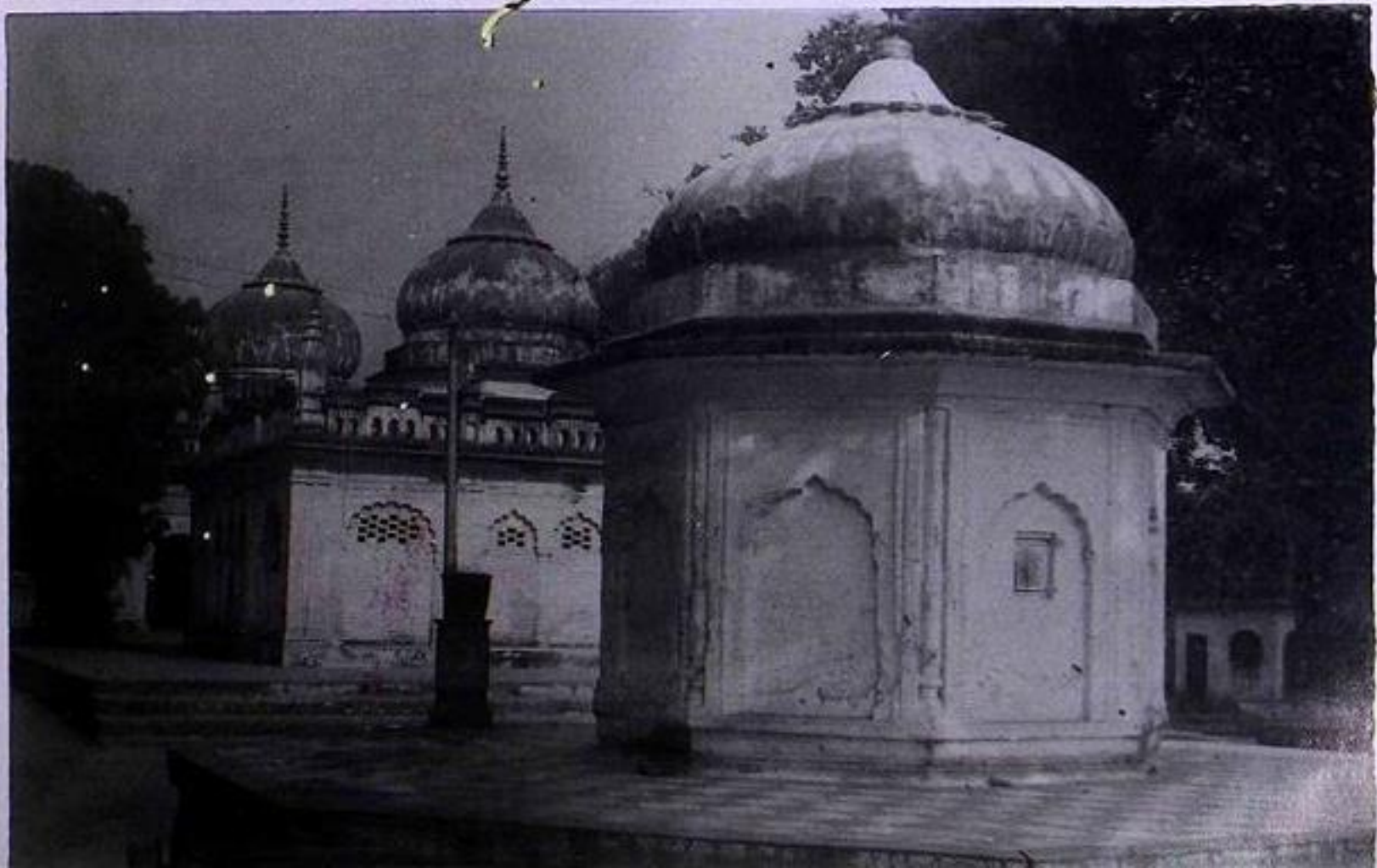
مجھ سے کہا جبرئیلِ جنوں نے یہ بھی وحیِ الٰہی ہے
مذہب تو بس مذہبِ دل ہے باقی سب گمراہی ہے

وہ جو ہوئے فردوس بدر تقصیر تھی وہ آدم کی مگر
میرا عذابِ دربدری میری ناکردہ گناہی ہے

حرفِ طلب سینے میں کچل دو شرطِ وفا ٹھہری ہے یہی
کاٹ کے رکھ دو اپنی زباں یہ حکمِ ظلِّ الٰہی ہے

سنگ تو کوئی بڑھ کے اٹھاؤ شاخِ ثمر کچھ دور نہیں
جس کو بلندی سمجھے ہو ان ہاتھوں کی کوتاہی ہے

پھر کوئی منظر پھر وہی گردش! کیا کیجے اے کوئے نگار
میرے لئے زنجیرِ گلو میری آوارہ نگاہی ہے

بہرِ خدا خاموش رہو بس دیکھتے جاؤ اہلِ نظر
کیا لغزیدہ قدم ہیں اس کے کیا دزدیدہ نگاہی ہے

دور سے اس کو چاکِ ملامت جان کے ناصح خوش ہیں بہت
لیکن میرے گریباں پر تو اس کاجل کی سیاہی ہے

دید کے قابل ہے تو سہی مجروح تری مستانہ روی
گرد ہوا ہے رختِ سفر رستے کا شجر ہمراہی ہے

مجروح سلطانپوری
۶۰۲۔ سی گل 'سی'، شرلے راجن روڈ
باندرہ (ویسٹ)۔ بمبئی ۴۰۰۰۵۰

ممتاز دانش ور، ادیب اور مجاہدِ آزادی

بشمبھر ناتھ پانڈے سے ایک ملاقات

نیا دور کی طرف سے ممتاز دانش ور، ادیب، مفکر، مورخ، صحافی اور مجاہدِ آزادی جناب بشمبھر ناتھ پانڈے سے تاریخی موضوعات اور اودھ کی تہذیبی زندگی سے متعلق چند سوالات کیے گئے۔ ذیل میں ان کے جوابات شائع کیے جا رہے ہیں۔ امید ہے کہ قارئین ان سے استفادہ کریں گے۔

— ایڈیٹر

سوال پانڈے صاحب! آپ ایک بزرگ مجاہدِ آزادی ہیں۔ آپ کی تاریخ اور خصوصی طور پر تاریخ اودھ پر بہت اچھی نظر ہے۔ ذرا بتلانے کی زحمت گوارا فرمائیں کہ نوابین اودھ میں آپ سب سے بہتر کس کو سمجھتے ہیں اور کیوں؟

جواب جہاں تک خدمت کے ساتھ ساتھ حکومت چلانے کا سوال ہے، میں نواب آصف الدولہ کو پہلی جگہ دیتا ہوں، باقی لوگوں کے عہد حکومت میں تو انگریز اس قدر غالب ہو گئے تھے کہ ہر وقت جنگ کا خدشہ لاحق رہتا تھا۔ واجد علی شاہ کے دور میں انگریز اپنی آزاد حکومت قائم کرنا چاہتے تھے جس کے سبب ہر وقت نزح کشی کا خطرہ ہوتا تھا۔ رشوت ستانی کو کام میں لا کر انگریز ریزیڈنسی حاوی ہو گئی تھی جبکہ ان کے سامنے واجد علی شاہ جیسا جواں مرد سورما تھا، جو اپنے ہی رفقاء، مصاحبوں اور وزیروں کی کوتاہیوں کا شکار رہے۔

انھوں نے نواب کا ساتھ نہ دیا ورنہ وہ اودھ سے انگریزوں کے عمل دخل کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتے۔ آخر میں ان کے درباریوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور مجبور کیا کہ انگریز ریزیڈنٹ کے فیصلے کے مطابق کلکتہ چلے جائیں۔ بادشاہ جس وقت لکھنؤ سے جا رہے تھے، عوام زار و قطار رو رہے تھے۔

نواب آصف الدولہ بہت ہونہار تھے اسی لیے تو بہت مشہور ہے "جس کو نہ دے مولا اس کو دے آصف الدولہ"۔

سوال شامِ اودھ کیوں مشہور ہوئی؟ اس کی کیا خصوصیات تھیں؟

جواب شامِ اودھ کی مقبولیت کے بارے میں میرا خیال ہے کہ دہلی کے تباہ ہو جانے کے بعد لکھنؤ فن کاروں، شاعروں، ادیبوں کا ایک ثقافتی مرکز بن گیا تھا۔ جگہ جگہ کے شاعر لکھنؤ میں جمع ہونے لگے تھے۔ مرزا غالب بھی کلکتہ جاتے ہوئے لکھنؤ میں رکے۔ ذوق کو بھی لوگوں نے مشورہ دیا کہ وہ لکھنؤ جائیں ذوق کا جواب تھا کہ

کون جائے ذوق اب دہلی کی گلیاں چھوڑ کر

دن ڈھلتے ہی شاہی دربار کے اردگرد شاعروں کا دربار لگ جاتا تھا۔ ڈھلتی ہوئی شام رنگینیوں سے بھر جاتی تھی۔ گرمیوں میں چاروں طرف خس کی ٹٹیاں لگا دی جاتی تھیں اور بیلے کے ساتھ ساتھ عطر کی خوشبو فضاؤں میں چاروں طرف پھیل جاتی تھی۔ بیلے کے پھولوں کی بہار کی اپنی الگ شان ہوتی ہے، اس لئے لوگ "شامِ اودھ" کو اس طرح یاد کرتے ہیں اور کہتے ہیں "کوئی شہر جہاں میں ایسا نہیں ہے جس کی شام اس قدر رنگینیوں سے بھری ہو۔"

سوال کیا آپ واجد علی شاہ کی فوجی صلاحیت کے سلسلے میں روشنی ڈالنا چاہیں گے؟

جواب جس بہادری کے ساتھ اودھ کے عوام نے اپنی جانیں قربان کیں، جنگِ آزادی میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس وقت لندن کے ایک انگریزی اخبار کے مُدیر نے اپنے اخبار میں لکھا کہ ہندستان کے دوسرے علاقوں کی جنگیں سامنتی تھیں لیکن اودھ کی جنگ انقلابی جنگ تھی۔ اس زمانے کے گیتوں میں اودھ کے سوُرماؤں کی بے حد تعریفیں ملتی ہیں۔

سوال کہا جاتا ہے کہ ناول "امراؤ جان ادا" لکھنوی تہذیب کا دلکش مرقع ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ اس کا قصہ حقیقت ہے یا محض افسانہ؟

جواب میں تو اسے افسانہ ہی کہوں گا۔ یہ تو فلمی لوگوں نے اور ریکھا کی لاجواب اداکاری نے لوگوں کے دلوں پر جادو سا کردیا، لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ لکھنؤ کے رئیسوں میں بے شک ایک گراوٹ آگئی تھی۔ اس لحاظ سے اسے زوال آمادہ تمدن کا ترجمان کہنا غلط نہ ہوگا۔

سوال اب "مرحوم لکھنؤ" کیوں یاد کیا جاتا ہے؟

جواب ١٨٥٧ء کے بعد جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ براہ راست برطانیہ کی حکومت قائم ہوئی تب.... گورنر کا دربار محض خوشامد کرنے والوں کا دربار بن گیا تھا۔ لکھنؤ کا ڈھانچہ رہ گیا تھا اس کی رُوح غائب ہوگئی۔ بقول شاعر ؎

اب پہلے سے ولولے ہیں اور نہ ارمانوں کی بھیڑ

انیس و دبیر کی مرثیہ خوانی اب کہاں؟ اپنے پیچھے ایک نزاکت کی فضا زبان و بیان میں فصاحت و بلاغت تو ہے لیکن زندہ دلی غائب ہوگئی ہے اور اسی لئے شاعرانہ انداز سے لوگوں نے لکھنؤ کو مرحوم کہہ دیا۔

سوال اس بات میں کتنی سچائی ہے کہ نوابینِ اودھ نے کئی مندروں کی تعمیر کرائی؟

جواب تفسیر میں ملتا ہے کہ اورنگ زیب نے بہت سے مندروں کو جاگیریں دیں تو اس کا اثر تمام مسلم حکمرانوں پر پڑا۔ ٹیپو سلطان ١٥٦ مندروں میں ہر سال نذرانہ بھیجتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کچھ مسلمان بادشاہوں کا بھی ایسا ہی دستور تھا لیکن اس سلسلے میں میری معلومات کچھ کم ہیں کہ اودھ کے نوابوں نے کیا کیا۔ لیکن چوں کہ یہ سلسلہ قائم ہوگیا تھا اس لیے انھوں نے اس روایت کو برقرار رکھا ہوگا۔

سوال موجودہ اترپردیش سرکار اُردو والوں کی ہمت افزائی بھی کررہی ہے اور اُردو زبان کی ترقی کے لئے کوشاں ہے۔ کیا اس سے اُردو کو فائدہ پہونچ سکتا ہے۔

جواب یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ کچھ ہندی والوں کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے اُردو کے متعلق گاندھی جی کی صلاح کو نظر انداز کیا گیا گاندھی جی چاہتے تھے کہ ناگری اور فارسی رسم خط میں جو زبان لکھی جائے وہی ہندستانی و ملکی زبان ہو چوں کہ اُردو زبان کا گہوارہ اترپردیش ہے اسی لئے درحقیقت اردو اترپردیش کی بیٹی ہے۔ عوام نے اسے اپنی بول چال کی زبان بناکر بہت آسان کردیا تھا لیکن انگریز نوکر شاہی کے اشارے سے دونوں ہندی اور اُردو زبانوں میں سنسکرت اور فارسی کے الفاظ زبردستی بھر دیے گئے۔

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ پنت جی، سمپورنانند جی اور چرن سنگھ جی کے بعد پنڈت کملاپتی ترپاٹھی جی نے اُردو کے لئے ایک عملی قدم اٹھایا۔ انھوں نے ٦ ہزار اردو اساتذہ مقرر کیے اور صلاح و مشورہ کر کے قانون بنادیا کہ جس مدرسہ میں چالیس لڑکے ہوں اور وہ اُردو کو میڈیم بنانا چاہتے ہوں وہاں ایک اُردو ٹیچر کا تقرر کردیا جائے گا۔ اُردو کتابیں شائع کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ ہندی اکادمی کے ساتھ ساتھ اردو اکادمی بنائی گئی اُردو لیکھکوں کو پُرسکار دیا گیا۔ یہ سلسلہ کملاپتی جی نے شروع کیا تھا۔ وہ اب بھی کم و بیش چل رہا ہے۔ (باقی [illegible])

سید امجد حسین
سوچنا بھون۔ لکھنؤ

تجدیدِ الفت کا ترانہ

آنند نرائن مُلّا سے ایک ملاقات

اُردو شاعری واعظ، ناصح اور مُلا کی دشمن رہی ہے۔ اُردو کو مُلّائیت سے ایک طرح کی چڑ ہے مگر ہر کلیے کا ایک استثنا ہوتا ہے۔ آنند نرائن مُلّا اُردو کے مجاہد بھی ہیں، رہنما بھی ہیں، عاشق بھی ہیں اور اُردو کی جمہوریت کے سربراہ بھی ہیں اور اُردو داں عوام کے محبوب بھی۔ مجھے ناز ہے کہ اُردو کے اس جواں عزم مجاہد سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔

الف ج

(س) آپ کی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی اور آپ کی زندگی کا ایک طویل عرصہ لکھنؤ میں گزرا۔ اس کے بارے میں کچھ ارشاد ہو۔

(ج) میں ۲۴ر اکتوبر ۱۹۰۱ء میں اپنے آبائی وطن رانی کٹرہ میں پیدا ہوا۔ میرا خاندان وکیلوں کا خاندان تھا۔ میرے والد بہت مشہور و معروف وکیل تھے۔ ان کی بڑھتی ہوئی پریکٹس کی وجہ سے انھیں اپنا آبائی مکان کچھ مناسب نہیں معلوم ہوا۔ جب میں تین چار سال کا تھا، وہ نواب غلام حسین خاں کی کوٹھی میں جو کہ شاہ مینا کے مزار کے سامنے ہے جہاں آج غالباً عورتوں کا اسپتال ہے، اس کوٹھی میں کرایہ دار ہو کر آباد ہو گئے۔ اس کوٹھی میں بھی میں کوئی تین چار سال رہا۔ اس کے بعد اپنے پیشے کی ضرورت سے میرے والد نے گولہ گنج میں ایک مکان کرایہ پر لے لیا اور اس مکان میں انھوں نے زندگی گزار دی۔ میں بھی اس مکان ہی میں رہا۔ اور جب ۱۹۵۴ء میں الہ آباد ہائی کورٹ کا جج ہوا تو میں نے وہ مکان چھوڑا اور نمبر ۲ چائنا بازار پر مقیم ہوا۔ گویا قریب پچاس سال اس گولہ گنج والے مکان میں رہا۔ وہ سڑک جس پر وہ مکان تھا اُس وقت سرکلر روڈ کے نام سے مشہور تھی اور اسی کا نام بعد میں جگت نرائن روڈ رکھا گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے والد ایک بڑے وکیل تھے۔

میرے والد لکھنؤ بار کے چیرمین بھی رہے۔ ان کی ایمان داری کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے ایک انچ زمین بھی نہ خریدی ورنہ لوگ محل تعمیر کرتے ہیں۔ میرے پاس یہاں بھی اپنا کوئی مکان نہیں ہے۔ میں سرکاری مکان میں رہ رہا ہوں۔ ایمان داری ہمارا خاندانی کردار رہا ہے۔

(س) آپ نے اپنی شاعری کا آغاز کس زمانے میں کیا۔؟

(ج) میں نے اپنی شاعری کی ابتدا انگریزی زبان میں کی۔

اُردو میں شاعری ۱۹۲۵ء میں شروع کی اور میری پہلی نظم کان پور کے "زمانہ" میں جس کے مُدیر دیا نرائن نگم تھے انھوں نے اپنے نوٹ کے ساتھ شائع کی کہ یہ ایک نیا شاعر ابھر رہا ہے۔ اُردو کے ایک شاعر متور تھے انھوں نے شروع میں مجھ پر ایک نظم لکھی جس کا مفہوم کچھ اس طرح تھا :

"یہ ایک نیا آفتاب افقِ ادب پر نمایاں ہے"۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ جو میری قدر اس وقت ہوئی، شاید وہ قدر اب باقی نہیں ہے[1]

(س) آپ کے زمانے میں ادبی سرگرمیاں کیا تھیں ؟

(ج) ؎ اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

بے اختیار یہ مصرعہ یاد آتا ہے اور ایک دوسرا شعر یاد آتا ہے

آسماں کی کیا ہے طاقت جو چھڑائے لکھنؤ
لکھنؤ ہم پر فدا ہے ہم فدائے لکھنؤ

مجھے لکھنؤ کی ادبی انجمنوں نے اپنی محفلوں میں اعلا سے اعلا مقام دیا۔ لکھنؤ میں شعرا کے دو گروپ ہو گئے تھے۔ ایک پُرانے شاعر نے "انجمن معین الادب" کے نام سے چند شعرا کو یکجا کیا تھا، اور کچھ نئے شاعر "انجمن معراجُ الادب" بنا کر سامنے آئے تھے مجھ کو دونوں انجمنوں نے اونچی سے اونچی جگہ دی اور میں نے کوشش بھی کی کہ یہ دونوں انجمنیں مل جائیں اور میں اس مقصد میں کامیاب بھی ہوا۔ میرے اس دور کے شاعر جو معین الادب میں تھے صفی لکھنوی تھے میں ان کے گھر بھی جایا کرتا تھا۔ انجمن معراج الادب کے جو شاعر روحِ رواں تھے وہ تھے حکیم آشفتہ سراج لکھنوی اور منظر لکھنوی وغیرہ۔ یہ انجمن معراج الادب کے رُوحِ رواں تھے۔ اس میں ایک دلچسپ واقعہ یہ بھی ہے کہ وہ دَور استادی اور شاگردی کا تھا۔ جو باہر کے شعرا تھے ان کو شکایت تھی کہ لکھنؤ والے ان پر اعتراض کرتے تھے۔ لکھنؤ والوں کو اپنی زبان پر اس قدر ناز تھا کہ انھوں نے اقبال پر بھی اعتراض کیا۔ یہی نہیں بلکہ ایک شاعر نے تو اصلاح بھی فرمادی۔ سراج لکھنوی کے اشعار پر بھی اعتراض ہوا۔ افقر موہانی ایک ہفت روزہ نکالتے تھے جس کا نام مجھے یاد نہیں، اس میں انھوں نے ایک مضمون لکھا جس میں ایک غزل کی اصلاح کی اور اس کو یوں شائع کیا کہ گزشتہ دور میں ایک شاعر سراج جھنجھانوی گزرے ہیں اور یہ غزل سراج نے ان سے چُرائی ہے۔ اس کے بارے میں سراج نے مقدمہ دائر کر دیا افقر موہانی کے خلاف۔ اور میں اس میں وکیل تھا۔ یہ مقدمہ سٹی مجسٹریٹ کے یہاں چلا۔ اور مہینوں چلا۔ صفائی میں گواہ پیش کیے۔ ایک کتاب جس میں دس پندرہ غزلیں تھیں اس کو عدالت میں یہ کہہ کے پیش کیا کہ اس میں کچھ حصہ سراج جھنجھانوی کا ہے۔ میں نے ثبوت کی طرف سے اگلی پیشی پر ایک خردہ چھوٹی سی بات آٹھ صفحے کی چیز شائع کی اور کہا کہ اس میں سراج کی غزلیں ہیں۔ اب بے بس ہو گئے اور آخر میں انھوں نے معافی مانگی جب پر مقدمہ ختم ہو گیا۔ اس زمانے میں جگر اور اصغر میرے بہت قریب تھے۔

(س) آپ کے خیال میں ہندستان میں اُردو ادب کا کیا کردار رہا ہے ؟

(ج) ہندستان تو ایک ایسا ملک ہے جہاں شاید سب سے زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں دیگر ممالک تو آسانی سے اپنی ایک زبان رکھ سکتے ہیں لیکن ہندستان کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہندستان میں ایسا ممکن نہیں ہے۔ اُردو مغلیہ دورِ حکومت میں پیدا ہوئی اور انگریزوں کی حکومت تک یہ دہلی اور لکھنؤ میں پروان چڑھ چکی تھی۔ اُردو گویا اتر پردیش میں ہی پیدا ہوئی ہے اور اس زبان کی اس قدر پذیرائی ہوئی کہ یہ سب سے اہم زبان ہو گئی۔ یوں تو انگریزوں کی حکومت کے عہد میں الگ الگ علاقوں میں علاقائی زبانوں کو عروج حاصل ہوا نتیجے میں ہندی کی بھی ترقی ہوئی۔ جب جنگِ آزادی کی ابتدا کے ساتھ ہندی زبان رفتہ رفتہ بامِ عروج پر پہونچنے لگی یہاں ملک کی آزادی تک اُردو ہندی، جو دراصل ایک ہی زبان کی دو شکلیں ہیں، ایک دوسرے کی حریف سمجھی جانے لگیں، پاکستان

---

[1] ادر مجھے ساتھ اختلاف ہے۔ اُردو کی تاریخ میں آپ کی جگہ محفوظ ہے (راج)

کے بٹنے میں اُردو زبان کا سوال بھی اٹھا ۔ آزادی کے بعد ہندی کو اور زیادہ ترقی ملی اور رفتہ رفتہ کچھ ہندی والوں نے یہ مناسب سمجھا کہ اُردو زبان کو مٹا دیا جائے لیکن اُردو عوام کو اس قدر پسند تھی کہ وہ مٹائی نہ جا سکی اس امر میں سب سے بڑا ہاتھ فلمی دنیا کا تھا جس نے اُردو زبان کو زندہ رکھا ۔ آج یہ احساس ہونے لگا ہے کہ اس مشترکہ تہذیب کے دور میں ہر زبان کو اس کا قانونی حق دیا جائے اور کسی ایک زبان کو اس پر مسلط نہ کیا جائے شاید اس کا احساس اب حکومت کو بھی ہو گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ زبان کے معاملے میں اب اتنی تنگ نظری نہیں ہے جو اس سے قبل تھی ۔

(س) اُردو زبان کا ہمارے سیاسی رہنماؤں سے کیا تعلق رہا ہے ؟

(ج) جنگِ آزادی میں ہندی کے مقابلے میں اُردو کی پذیرائی زیادہ ہوئی ۔ گاندھی اور نہرو دونوں کی زبان اُردو سے زیادہ قریب تھی ۔ موتی لال نہرو مکمل طور پر اُردو ہی میں اظہار خیال کرتے تھے

۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں ایک جلسہ ہوا جس میں مجھ سے ایک مشاعرہ منعقد کرنے کی درخواست کی گئی ۔ میں نے اس کے لیے امین سلونوی کو بحیثیت سکریٹری مقرر کیا ۔ مسز نائیڈو اس کی صدر ہوئیں ۔ مشاعرہ ہوا اور اس میں ملک کے نامور شعراء جگر، ساغر وغیرہ نے شرکت کی ۔ سب نے وطن پرستی کی نظمیں سنائیں ۔ میں نے بھی نہرو پر ایک نظم سنائی جو نہرو کو پسند آئی ۔ دوسرے دن وہ نظم میں نے دوبارہ پڑھی ۔

بعد میں ہندی والوں نے بھی ایک کوی سمیلن کیا ۔ لیکن خود منتظمین نے آکر مجھے بتایا کہ کوی سمیلن میں وہ مجمع اکٹھا نہ ہو سکا جو مشاعرہ میں ہوا تھا ۔

مشاعرے کے تمام ٹکٹ جب ختم ہو گئے تو منتظمین کو کاؤنٹر فائل پھاڑ پھاڑ کر بیچنا پڑا ۔

(س) اودھ کے شعراء اور ادیبوں میں آپ سب سے زیادہ کس شاعر اور ادیب سے متاثر ہوئے ۔ ؟

(ج) میں نے اپنی شاعری انگریزی زبان میں شروع کی اور سات آٹھ سال تک انگریزی زبان ہی میں شعر کہتا رہا ۔ مگر میرے دوستوں نے مجبور کیا کہ میں مادری زبان میں شعر کہوں ۔ میں نے اپنے دوستوں کی یہ رائے قبول کر لی اور پہلے پہل ۱۹۲۵ء میں اُردو میں شعر کہنا شروع کیا ۔ ۱۹۲۵ء میں وکالت کا امتحان بھی پاس کر چکا تھا ۔ لہٰذا میرے لیے کسی دوسرے کی مدد لینا ناممکن تھا ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شاگردی اور استادی اُردو ادب میں رائج تھی اور ہر شاعر کے استاد ہوا کرتے تھے اور جو خود بعد میں استاد بن جاتے تھے ۔

میری زندگی کا یہ بھی عجیب واقعہ ہے کہ میں نے غزل سے پہلے نظم کہی ۔ ظاہر ہے کہ اس وقت کسی شاعر سے متاثر ہونا قریب قریب ناممکن تھا ۔ البتہ میں اُردو شاعری میں غالبؔ و اقبالؔ سے بے شک متاثر ہوا ۔

میں اوروں کے اشعار بھی پسند کرتا تھا مگر ان سے متاثر نہیں ہوا ۔ یہاں تک کہ چکبستؔ جو میرے برہمن خاندان کے تھے ان سے بھی متاثر نہیں ہوا ۔ میں نے غالبؔ اور اقبالؔ کی نظموں کا ترجمہ بھی کیا جو شائع بھی ہوئیں ۔ اقبالؔ کی ایک نظم کا میں نے ترجمہ کیا جسے ساہتیہ اکاڈمی نے شائع کیا ۔ غالبؔ کے جن اشعار کا میں نے ترجمہ کیا وہ اس وقت میرے ذہن میں نہیں ہے البتہ ؎

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل

اس کا ترجمہ اب بھی میرے ذہن میں ہے ۔

(س) آپ کا قیام ایک عرصے سے دہلی میں ہے کیا آپ کا دل لکھنؤ جانے کو چاہتا ہے ۔ ؟

(ج) لکھنؤ میں اگر کوئی مکان ہوتا تو ضرور جانا چاہتا ۔ سب دوست ختم ہو گئے ہیں ۔ کچھ عزیز ہیں وہ کبھی دہلی آ جاتے ہیں ۔ اب میں قریب پانچ سال سے لکھنؤ نہیں گیا ۔ میرے لیے لکھنؤ میں کافی ہاؤس میں ایک میز الگ (مخصوص) رہتی تھی ۔ ان میں مجازؔ سلام مچھلی شہری، احتشام حسین، سرور صاحب یہ سب میرے ساتھ بیٹھتے تھے ۔ میں اس زمانے میں ایک بورڈ کا

ممبر میں تھا۔ آزادی سے پہلے جس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو تھے اور علی ظہیر اس کے ممبر تھے۔ اسی کمیٹی کے سلسلے میں پاکستان بھی گیا تھا۔ میری ایک نظم بہت مقبول ہوئی تھی۔ مجھے شوکت تھانوی نے "سفیر اودھ" کا خطاب بھی دیا تھا۔ نظم کا عنوان تھا "سوغات" اس کے کچھ شعر سنو ؎

(ا۔ ح) ارشاد!

(لا مکاں) ؎ پھر ایک تجدید الفت کا ترانہ لے کے آیا ہوں
میں کیا آیا ہوں اک گزرا زمانہ لے کے آیا ہوں
بنام خط اقبال خاک میر و غالب سے
سلام شوق نذر دوستانہ لے کے آیا ہوں
قفس جو ہو چکے تعمیر اک شاخ نشیمن پر
میں دونوں کے لئے پھر آشیانہ لے کے آیا ہوں
میرے اوراق دل کو اب نہ یوں برباد ہونے دو
کہ میں ان میں تمہارا بھی فسانہ لے کے آیا ہوں
مجھے ٹھکرا نہ پاؤگے مجھے اپنا بنالو گے
محبت کی شکست فاتحانہ لے کے آیا ہوں
فقط تھوڑا سا زمزم اسکے بدلے میں مجھے دیدو
میں گنگا کے دہانے کا دہانہ لے کے آیا ہوں

(س) موجودہ حکومت اتر پردیش اردو کی ترقی کے لئے کوشاں ہے آپ کی کیا رائے ہے۔

(ج) ہم اس کے اس کام کی قدر کرتے ہیں اور حکومت سے درخواست کرتے ہیں کہ ہندی کی طرح اردو کو بھی روزگار سے جوڑا جائے اور جو اقدامات ملائم سنگھ کی حکومت نے کیے ہیں اور اردو کو روزی روٹی سے جوڑنے کی جو کوششیں کی جارہی ہیں وہ مستحسن ہیں۔ □□

بشمبھر ناتھ پانڈے ۔۔۔۔ صفحہ ۱۱ کا بقیہ

بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہندی کے کچھ سینک اردو کو ایک زبان ماننے پر تیار ہی نہیں اور لگاتار اس کے خلاف الٹا سیدھا پرچار کر رہے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ اردو شاعروں اور ادیبوں نے نوجوانوں کے دلوں میں آزادی کے لئے جوش پیدا کیا۔ رام پرشاد بسمل اور اشفاق اللہ خاں وطن پرستی کے شعر پڑھتے ہوئے پھانسی پر چڑھے۔

درجنوں اردو اخباروں کو آزادی کے پرچار کرنے کے لئے معتوب کیا گیا، ان کے مالکوں اور مدیروں کو جیل کی سزائیں جھیلنی پڑیں۔ الہ آباد کے اردو ہفت روزہ 'سورج' نے آزادی کی لڑائی میں ایک ایسی مثال قائم کی جس کی دنیا نے تعریف کی۔ ۱۹۱۸ء میں یہ نو مہینے تک شائع ہوا۔ اس کے تیرہ ایڈیٹروں کو قید ہوئی پہلے کو پانچ سال، دوسرے کو سات سال اور اس کے بعد عمر قید، کالے پانی کی سزائیں ہوئیں۔ یکے بعد دیگرے تیرہ ایڈیٹر اسی اخبار کے لئے قربان ہو گئے۔ آخر میں حکومت کو پریس ایکٹ بنا کر اس اخبار کو بند کرنا پڑا۔ اس اخبار کے پہلے صفحے پر ایک اشتہار ہوتا تھا کہ:

"ایڈیٹر چاہیے۔ تنخواہ میں دو سوکھی روٹیاں، ایک گلاس پانی اور عمر بھر کے لئے کالے پانی کی سزا۔"

پولیس نے جب اخبار کے دفتر کی تلاشی لی تو میز کی دراز سے گیارہ درخواستیں ملیں جو ایڈیٹر بننا چاہتے تھے!! ہندستان ہی میں نہیں پوری دنیا میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

یہ بات بڑی افسوس ناک ہے کہ اردو کی ان قربانیوں کو ہندی کے کٹھ ملّے قبول کرنے کو بھی تیار نہیں۔ □□

"اے میرے فرض شناس، جفاکوش، عدالت پناہ اور فقیر منش بادشاہ! اے میرے شرافت سنج ہنرور، نکتہ رس، علم نواز اور ادب پرست شاعر! افرنگی نے آپ کو تباہ بھی کیا اور بدنام بھی۔ آپ جتنے اچھے تھے، اتنے ہی برے بنائے گئے۔"

—— جوش ملیح آبادی (یادوں کی برات صہ ۸۱ تا ۸۳)

قرۃ العین حیدر

جے ۔۱۴۰۔ سیکٹر ۲۵ ۔ نوئیڈا

غازی آباد

شہرِ آرزو

اردو کی کچھ شخصیتیں ایسی ہیں جنھوں نے اپنے عہد میں ہی اساطیری حیثیت حاصل کر لی ہے۔ محترمہ قرۃ العین حیدر صاحبہ بھی ہمارے عہد کی ایسی ہی شخصیت ہیں۔

لکھنؤ اُن کا شہرِ آرزو تھا اور ہے۔ ان کی برہمی اور اُن کا غصّہ اُسی بے پایاں اُلفت کا مظہر تھا جو انھیں اُردو سے ہے۔ پہلے وہ مجھ پر خفا ہوئیں۔ ازراہِ شفقت انھوں نے جو کچھ فرمایا وہ نذرِ قارئین ہے۔ کوئی سوال پوچھنے کا سوال ہی نہیں رہ گیا تھا۔ لکھنؤ کے بارے میں ان سے جو کچھ پوچھنا چاہتا تھا انھوں نے ایک ہی جواب میں سب کا احاطہ کر لیا ہے۔

—— الف ح

میں نے لکھنؤ کے بارے میں پچھلے چند برسوں میں دو ناول لکھے ہیں جن میں ایک ناول "گردشِ رنگِ چمن" ہے جس کا نام اگر انگریزی میں رکھا جائے تو وہ The Death of a City ہوگا۔ میں نے دوسرے ناول "چاندنی بیگم" میں لکھنؤ کے تیزی سے بدلتے ہوئے منظر کو پیش کیا ہے۔

ہمارے یہاں اس وقت خاص طور پر رویّہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ اپنے قومی تہذیبی سرمائے کو برباد کیا جائے۔ دوسرے ملکوں میں یہ سرمایہ سجا کے، سنوار کے بڑی احتیاط سے رکھا جاتا ہے۔ ہم نے اسے ایک سیاسی اکھاڑہ بنا دیا۔ لہٰذا کتب خانے، آرٹ کے ذخیرے، تاریخی عمارتیں، ادبی اور تہذیبی روایات — ان سب کو دھڑلے سے برباد کیا جا رہا ہے۔ جب تاج محل کی حالت ناگفتہ بہ ہو چکی ہے تو لکھنؤ کے امام باڑے کا کیا ذکر کیا جائے۔ میں نے اپنے کسی مضمون میں چند سال قبل لکھا تھا کہ پیرس (Paris) کا پُرانا شہر قانوناً اس طرح محفوظ ہے کہ اس کی ایک اینٹ کو بھی نہیں ہٹایا گیا ہے۔ لکھنؤ میں تاریخی عمارتیں باضابطہ طور پر منہدم کی گئی ہیں بشال کے طور پر روشن الدولہ کی کچہری۔ جو عمارتیں باقی ہیں ان میں نیلے اور پیلے رنگ پوت دیئے گئے ہیں جس طرح پُرانی عمارات کو نئی عمارتوں کے ساتھ طرزِ تعمیر کی مناسبت سے (Blend) کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس لکھنؤ میں انتہائی بھدّی عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں اور افسوس یہ ہے کہ کسی نے اس صورتِ حال پر توجہ نہ کی۔ شاید کسی نے بھی نہیں۔ اس شہر کو جو اہلِ ذوق کے لیے جنت نگاہ تھا، کس بے دردی سے تاراج کیا گیا۔ ایک وقت تھا کہ منشی نول کشور خود بیل گاڑی پر جگہ جگہ دوسرے شہروں میں جاتے تھے اور اپنی کتابیں فروخت کرتے تھے اور اس طرح انھوں نے اردو کی عظیم الشان خدمت انجام دی۔ ایک وقت یہ ہے کہ ان کے وارثوں نے اُردو والوں سے کہا کہ ان کے گودام میں جو کتابیں ہیں "لے لو" اور انھیں محفوظ کر لو۔ لیکن کسی نے پروا نہیں کی۔

آج سے قریب دس سال پہلے کی بات ہے کہ میں نے اُردو اکادمی کے اربابِ اقتدار سے بار بار درخواست کی کہ وہ اس نایاب ذخیرے کو اپنے یہاں منتقل کر لیں۔ مجھے جو جواب ملا، میں سنّاٹے میں آ گئی۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں پُرانے لکھنؤ کی کچھ یادیں تازہ کروں۔

میں موجودہ لکھنؤ کے بارے میں اتنی غم و غصہ میں بھری بیٹھی ہوں کہ میں پرانے لکھنؤ کے بارے میں کیا لکھوں؟ کیا میں یہ بتاؤں کہ میرے بچپن کے لکھنؤ میں پرانے شہر کی گلیاں کتنی صاف ستھری تھیں۔ فرقہ وارانہ تاثرات ناپید تھے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں نظام تعلیم بہت اچھا تھا، پڑھائی ہوتی تھی۔ غنڈہ گردی، امتحان میں نقل کرنا اور نگرانوں کو چاقو دکھا کر بھگا دینا اس قسم کے خواب و خیال کسی کے دماغ میں نہ آ سکتے تھے۔

ابھی کچھ سال پہلے کی بات ہے کہ ایک صاحب نے بتایا کہ وہ شیعہ کالج میں [illegible] کے امتحان کے سنٹر میں نگرانی کر رہے تھے۔ لڑکوں نے ان کو چاقو دکھا کر بھگا دیا وہ اس وقت وہیں سے پریشان حال چلے آ رہے تھے۔ اس صورت حال کا ذمہ دار پورا عمرانی اور اقتصادی انقلاب ہے جس میں بے پناہ بڑھتی ہوئی آبادی اور بے لگام اور بے کار راج نیتی (سیاست) کی وجہ سے ابھی سدھرنے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔

مسئلہ یہ ہے کہ جس نسل نے وہ گزشتہ تہذیب یا ماحول نہیں دیکھا ان کی سمجھ میں نہیں آ سکتا کہ اگلے وقتوں کے لوگ اب کتنے دکھی اور شاکی ہیں۔ آخر اس زمانے کی ایسی کیا بات تھی؟

مجھے بہت افسوس ہوا اور میں نے جب حال ہی میں ایک خاتون نقاد کا مضمون پڑھا جس میں انھوں نے (Generation gaps) کے باوجود میرے لیے ایسا لہجہ اختیار کیا کہ جو میں ذاتی طور پر اپنے کسی بزرگ ادیب کے لئے سوچ بھی نہیں سکتی۔ انھوں نے بڑے استہزا کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ میں تہذیب وغیرہ کے بارے میں لکھتے لکھتے نہیں تھکتی۔ ان کے الفاظ کچھ اسی قسم کے تھے۔ تو بی بی اس طرح تو میں برابر لکھتی رہوں گی اور نہ تھکوں گی۔

ہر مصنف کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنی ترجیحات کے مطابق لکھے اور قاری کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اسے مسترد کر دے، مجھے یاد ہے کہ جمیل مہدی مرحوم (ایڈیٹر عزائم) نے لکھا تھا کہ اب ہم لوگ جس زبان میں بات کرتے ہیں اس کو سمجھنے والا اب کوئی نہیں ہے میں نے امیر الدولہ لائبریری میں نایاب کتابیں باہر پڑی دیکھیں۔

مجھے ایسا لگتا ہے کہ لکھنؤ پر کچھ زیادہ ہی آفت آئی ہے۔ ان حالات میں یہ کون بیٹھ کر سوچے اور تجویز کرے کہ فلاں فلاں مکان اور کوچے ان کی ادبی اہمیت کی وجہ سے محفوظ کر دیئے جائیں۔ مثال کے طور پر میں نے یہ اندازہ لگایا کہ چوک میں پرانی سبزی منڈی کا وہ حصہ جہاں سے کوچہ میر انیس شروع ہوتا ہے شاید یہی مثنوی "زہر عشق" کی جائے وقوع تھی یا بھیم کا اکھاڑہ، سنہٹی وغیرہ کا علاقہ رہی ہے جس کا تذکرہ حسن شاہ کے قصۂ رنگیں میں کیا گیا ہے۔ اس کا ترجمہ نشتر کے نام سے سجاد حسین کسمنڈوی نے کیا ہے۔

گولہ گنج اور بارود خانے میں نواب آصف الدولہ کے زمانے میں انگریزوں نے اپنی پہلی چھاؤنی چھائی تھی اور بحیثیت (Camp Followers) خانم جان کا کنبہ وہیں اترا۔ انگریزوں کا قدیم فوجی قبرستان بھی اسی علاقے میں ہے جو اب گنجان آبادی کا علاقہ ہے اور کلن کی لاٹ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ آس پاس لوگوں نے اپنے مکان بنا لیے ہیں۔ کمپنی باغ بھی اسی طرف ہے یعنی میڈیکل کالج کے آس پاس تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کا جہاں جہاں تسلط ہوتا تھا، عوام کے لئے ایک باغ لگاتی تھی جو کمپنی باغ کہلاتا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں گومتی کے کنارے جو صنعتی نمائش (Industrial Exibition) ہوتی تھی اور غالباً کمپنی باغ تک پھیلی تھی اس میں ایک "پرستان تھیٹر" (Paristan Theatre) تھا اس میں سہگل (Sehgal) اور اختری بائی فیض آبادی نے پارٹ (Part) ادا کیا تھا۔ اس نمائش کے انچارج لکھنؤ کی مشہور شاعرہ محترمہ داراب بانو وفا کے دادا تھے۔

دوسری نمائش جو ۱۹۳۸ء میں لگی تھی وہ بھی گومتی کے کنارے تھی اس زمانے میں لکھنؤ میں پان کی گلوریوں میں کیلیں لگائی جاتی تھیں۔ ہمارے گھر میں پان دان تھا مگر میں نے کبھی پان نہیں کھایا۔ میں اپنی والدہ بھائی اور چند رشتہ داروں کے ساتھ نمائش میں گھوم رہی تھی تو پان کی دکان پر مجھے کسی نے دو بیڑے پان دیئے جن میں لونگ کی جگہ چھوٹی کیلیں لگائی گئی تھیں میں وہ دونوں کھا گئی۔ وہ کیلیں جا کر میری آنتوں میں چبھیں، جان کے لالے پڑ گئے۔ فوراً میڈیکل کالج پہنچایا گیا۔

میں لکھنؤ میں جس اسکول میں پڑھتی تھی یعنی ماسٹر صاحب کا

لکھنؤ: کچھ یادیں کچھ باتیں

جنوں ہر دشت و صحرا میں لیے پھرتا تو ہے ہم کو
مگر اک وادیٔ گل کو برابر یاد رکھتے ہیں

اگست ۱۹۴۶ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کے ریڈر کی حیثیت سے میں نے کام شروع کیا۔ اس وقت مشہور ادیب اور محقق سید مسعود حسن رضوی، صدر شعبہ تھے۔ شعبہ اردو اور فارسی دونوں کا تھا۔ فارسی میں مسعود حسن رضوی کے علاوہ عبدالقوی فانی اور یوسف حسین موسوی لکچرر تھے اور اردو میں میرے علاوہ سید احتشام حسین، نورالحسن ہاشمی اور سید محمد تقی لکچرر تھے۔ تقی صاحب کا چند سال کے بعد انتقال ہو گیا اور ان کی جگہ عبدالاحد خاں خلیل مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں میرا قیام بیرو روڈ (لال باغ) پر تھا۔ یہ حضرت گنج اور یونیورسٹی کے درمیان تھا۔ میں دس منٹ میں سائیکل سے وہاں پہونچ جاتا تھا۔ یونیورسٹی سے پہلے گومتی پر ایک پل تھا جو منکی برج کہلاتا تھا۔ اب اس کا نام 'ہنومان سیتو' ہے۔ میں جب لکھنؤ پہونچا ہوں تو یونیورسٹی کے وائس چانسلر بشیشور دیال تھے۔ بشیشور دیال ایک تعلقدار تھے۔ سال بھر کے بعد آچاریہ نریندر دیو، وائس چانسلر ہو کر آئے۔ میرے لکھنؤ یونیورسٹی میں تقرر کے چند ماہ بعد ہی ایران سے ایک ثقافتی وفد علی اصغر حکمت کی قیادت میں آیا۔ اس سے چار پانچ سال پہلے جب میں علی گڑھ میں تھا، علی اصغر حکمت ایک اور وفد کے قائد کی حیثیت سے ہندستان آچکے تھے اور ان کے وفد کے ایک رکن پور داؤد کے اقبال کے متعلق ایک جملے کی وجہ سے لاہور میں خاصا ہنگامہ ہو چکا تھا۔ انھوں نے اس نشست میں ٹیگور کی بڑی تعریف کی تھی اور انھیں آفاقی شاعر بتایا تھا۔ جب ان سے یہ پوچھا گیا کہ اقبال کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے تو انھوں نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی تھی کہ "اقبال تو ایک مقامی شاعر ہیں۔" بعد میں علی اصغر حکمت کو ایک بیان دینا پڑا تھا جس میں انھوں نے اقبال کی عظمت کا اعتراف کیا تھا۔

غرض جب ۱۹۴۷ء کے شروع میں، غالباً مارچ میں علی اصغر حکمت، ڈاکٹر صادق اور ایک صحافی، ان تین حضرات کا وفد علی گڑھ پہنچا تو وائس چانسلر نے مجھے لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں اس وفد کا سکریٹری مقرر کیا تاکہ میں لکھنؤ میں ان کی ساری مصروفیات کو منظم کر سکوں۔ علی اصغر حکمت کا یونیورسٹی میں ایک لکچر ہوا تھا جس میں مسعود حسن رضوی صاحب نے فارسی میں ان کا تعارف کرایا تھا۔ شام کو ایک استقبالیہ میں جو لکھنؤ کے شہریوں کی طرف سے اس وفد کو دیا گیا تھا، شری پرشوتم داس ٹنڈن نے، جو ایک سینیر کانگریسی ہونے کے علاوہ ہندی کے بہت پرجوش حامیوں میں تھے، مجھ سے کہا کہ:

"میں علی اصغر حکمت سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں، تاکہ ایران میں عربی الفاظ کو خارج کر کے خالص فارسی الفاظ استعمال کرنے کی جو روش عام ہو گئی ہے اس کے متعلق ان سے بات کروں؟"

وفد کا قیام کارلٹن ہوٹل میں تھا اور میں نے دوسرے دن سہ پہر میں ان کے لیے ملاقات کا وقت طے کر دیا۔ لیکن دوسرے دن صبح ہی حکمت صاحب کو ٹنڈن جی کے متعلق اور زبان کے سلسلے میں ان کے نظریے کے متعلق ضروری معلومات فراہم کر دیں۔ بعد میں علی اصغر حکمت نے اس

ملاقات کی رُوداد بتاتے ہوئے کہا کہ حضرت توزبان کے معاملے میں بہت کٹر معلوم ہوتے ہیں۔ ایران میں بلا شبہ اس وقت ایک تحریک چل رہی ہے کہ عربی کے ان الفاظ کی جگہ جو فارسی میں استعمال ہوتے آئے ہیں، خالص فارسی کے الفاظ استعمال کیے جائیں۔ مثلاً شعور، لاشعور، تحت شعور کی جگہ آگہی، ناآگہی، تحت آگہی۔ مگر اس روش کی بعض حلقوں میں مخالفت بھی ہو رہی ہے۔ حکمت نے کہا کہ میں تو دوسری زبانوں کے ان الفاظ کو جو ایک عرصۂ دراز سے ہماری زبان میں رائج ہیں، یک قلم خارج کرنے کے حق میں نہیں ہوں اور یہی مشورہ میں نے آپ کے ٹنڈن جی کو دیا ہے۔

شروع ۱۹۴۷ء میں میں نے شعبہ میں اقبال سوسائٹی قائم کی۔ جس کے لئے پنڈت جواہر لال نہرو، مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر عابد حسین نے خیرسگالی کے پیغامات بھیجے تھے۔ مولوی عبدالحق صاحب کے پیغام کی اہمیت یہ ہے کہ اس سے اقبال کے ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ کے سفر کا ثبوت مل جاتا ہے۔ ڈاکٹر اکبر حیدری نے اقبال کے لکھنؤ کے سفر پر جو شبہ ظاہر کیا ہے وہ بے بنیاد ٹھہرتا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب کے سپرد انجمن کی خدمت جس طرح کی گئی اس کا حال بھی ملتا ہے۔ پیغام یہ ہے:

انجمن ترقی اردو ہند

۱۔ دریا گنج۔ دہلی ۲۲ جنوری ۱۹۴۷ء

۱۹۱۲ء ماہ دسمبر کی آخری تاریخوں میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں ہوا سید حسن بلگرامی مرحوم اس کے صدر تھے۔ ڈاکٹر اقبال بھی اس جلسے میں شریک تھے۔ اہلِ جلسہ نے بہت مجبور کیا تو انھوں نے بھی ایک مختصر تقریر کی۔ حضرت صفی کی نظم کی بہت تعریف ہوئی تھی۔ کانفرنس کے آخری روز شب کے وقت انجمن ترقی اُردو کا جلسہ تھا۔ یہ انجمن کئی سال سے بے غوری کی حالت میں پڑی سسک رہی تھی۔ مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب صدر مجلس تھے اور وہی انجمن کے سکریٹری بھی تھے۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے اپنی تقریر میں انجمن کے سکریٹری کی خدمت کے لئے مجھے تجویز کیا۔ اس بلا کو سب اپنے سر سے ٹالنا چاہتے تھے۔ اب میرے سر منڈھ دی گئی۔ اور بھی دو ایک صاحبوں نے تقریریں کیں۔ سید سجاد حیدر مرحوم نے اپنی تقریر میں بہت افسوس ظاہر کیا کہ ڈاکٹر اقبال جیسا شخص لکھنؤ آیا اور اہلِ لکھنؤ نے کچھ التفات نہ کیا۔ اس پر چند اہلِ لکھنؤ جو اس مجمع میں موجود تھے بہت بگڑے اور اس صحبت میں جو ٹھنڈی پڑ گئی تھی تھوڑی دیر کے لئے گرمی پیدا ہو گئی۔

اب جو آپ نے مجھے بزم اقبال کے قائم کرنے کی اطلاع دی تو معاً یہ واقعہ یاد آ گیا۔ آپ نے بڑا اچھا کام کیا ہے۔ ایک تو ادب کی خدمت کی ہے دوسرے لکھنؤ پر سے الزام رفع ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے آپ دُہرے شکریے کے مستحق ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی نگرانی اور ہدایت میں یہ بزم صحیح ادبی ذوق پیدا کرنے میں کامیاب ہوگی۔"

عبدالحق

۱۹۴۷ء میں آزادی کے بعد جو فسادات شروع ہوئے اُن کا اثر لکھنؤ میں زیادہ نہیں تھا۔ کچھ لوگ جو پنجاب سے لٹ پُٹ کر آئے تھے انھوں نے لکھنؤ میں ہنگامہ کرنے کی کوشش کی مگر لکھنؤ والوں نے ان کی ان کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ ہاں ان لوگوں کو شہر میں سر چھپانے کی جگہ مل گئی اور ان میں سے بہت سے لوگوں نے رفتہ رفتہ اپنا کوئی نہ کوئی کاروبار شروع کر دیا۔ اکتوبر کے آخر میں پنجاب سے آئے ہوئے شرنارتھیوں کی امداد کے سلسلے میں لکھنؤ کے اُردو دوستوں نے ایک مشاعرہ کا اہتمام کیا۔ مشاعرہ کمیٹی میں میں بھی شریک تھا۔ قرۃ العین حیدر اس وقت انگریزی میں ایم اے کر چکی تھیں اور انھوں نے اس وقت مشاعرہ کے ٹکٹ بھی بیچے تھے لیکن مشاعرہ کے انعقاد سے پہلے ہی وہ اپنی والدہ کے اصرار پر پاکستان چلی گئیں۔ مشاعرہ کے چند روز بعد سردار جعفری مجھ سے ملنے بیرورڈ آئے اور مجھے بتایا کہ دسمبر میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی طرف سے ایک آل انڈیا کانفرنس کرنے کا ارادہ ہے جس کے لئے ایک

استقبالیہ کمیٹی کی تشکیل فوراً کرنی ہے۔ سردار نے اصرار کیا کہ میں اس استقبالیہ کمیٹی کا سکریٹری یا یوں کہیے کہ کانفرنس کا کنوینر ہو جاؤں۔ میں نے یہ عذر پیش کیا کہ مجھے لکھنؤ آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا اور ابھی میں لکھنؤ میں ساری اہم شخصیتوں سے رابطہ قائم نہیں کر پایا ہوں، اس لیے کسی اور کو یہ منصب سونپا جائے۔ اس سلسلے میں میں نے احتشام صاحب کا نام لیا۔ لیکن سردار نے بتایا کہ احتشام صاحب تو کسی طرح اس ذمہ داری کے لیے تیار نہیں ہیں اور آپ کے سوا کوئی اور ایسا نہیں جو کانفرنس کے سلسلے میں سارے انتظامات بخیر و خوبی انجام دے سکے۔ بہر حال میں نے ان کی بات مان لی اور انتظامات شروع کر دیے۔ چندہ کی فراہمی کے سلسلے میں تو خود سردار اور سلطانہ دونوں گشت کر رہے تھے اور کانفرنس کے کچھ عرصے بعد ہی دونوں کی شادی کی خبر آگئی۔ کانفرنس بہت اچھی ہوئی۔ سجاد ظہیر پاکستان سے اس میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ قاضی عبدالغفار فراق گورکھپوری، نیاز فتحپوری نے مختلف اجلاسوں کی صدارت کی۔

یہاں یہ لطیفہ بیان کرنا شاید نامناسب نہ ہو کہ جب فراق کانفرنس سے دو دن پہلے مجھ سے ملنے آئے تو میں نے اُن سے کہا کہ اگر آپ کا خطبہ تحریری ہو تو اچھا ہے۔ وہ اس پر کچھ برہم بھی ہوئے تو میں نے ان سے کہا کہ اچھی سے اچھی تقریر بالآخر کچھ عرصے کے بعد لوگوں کے دلوں سے محو ہو جاتی ہے جب کہ تحریر کے ذریعہ سے ان خیالات کی تب و تاب باقی رہتی ہے۔ فراق نے میری اس بات کی صداقت کو تسلیم کیا مگر کہنے لگے:

"بھائی مجھے تو مجمع کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے میں لطف آتا ہے"۔

اور یہ واقعہ ہے کہ فراق کی زبان کے مسئلہ پر یہ تقریر واقعی بڑی شان دار تھی۔ انھوں نے کوئی ایک گھنٹہ تقریر کی ہوگی۔ لیکن لوگ مسحور ہو کر ان کی باتیں سُن رہے تھے۔ عرصے کے بعد جب ۱۹۷۳ء میں رام لعل نے غیر مسلم اُردو مصنفین کی ایک کانفرنس لکھنؤ میں کی تو اس میں بھی فراق کی ایسی ہی شان دار تقریر ہوئی۔ اس وقت تک ٹیپ ریکارڈر کا استعمال بہت کم ہوتا تھا اس لیے افسوس ہے یہ تقریریں ٹیپ نہ کی جا سکیں۔ کانفرنس گنگا پرشاد میموریل ہال امین آباد میں ہوئی تھی۔ عابد سہیل نے نیا دور کے اودھ نمبر (ضمیمہ۔ جون ۱۹۹۴ء) میں یہ صحیح نہیں لکھا کہ اس کانفرنس کا مشاعرہ امبیسڈر ہوٹل میں ہوا تھا۔ مشاعرہ بھی گنگا پرشاد میموریل ہال میں ہوا تھا اور اس کے صدر آثر لکھنوی تھے۔ اسی مشاعرے میں جگر صاحب نے وہ معرکۃ الآرا غزل پڑھی تھی جس کا مطلع ہے ؎

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آجکل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آجکل

اسی مشاعرہ میں سردار جعفری نے "نئی دنیا کو سلام" کا ایک حصہ سُنایا تھا مگر لکھنؤ کے قدامت پرست ماحول میں ان کی یہ آزاد نظم چلی نہیں اور ان پر جب ہوٹنگ شروع ہوئی تو انھوں نے یہ سلسلہ جلد ہی ختم کر دیا۔ ویسے یہ مشاعرہ بہت شان دار تھا اور اس میں اثر لکھنوی اور جگر کے علاوہ اختر انصاری، وامق اور بہت سے ترقی پسند شعرا شریک تھے۔ مگر اس مشاعرہ میں جگر کے سامنے کسی کا چراغ نہ جلا اور اس کا اعتراف سجاد ظہیر نے بھی مشاعرہ کے بعد کیا تھا۔

یاد آتا ہے کہ اُردو کانفرنس کے چند روز بعد ہی دسمبر کے آخر ہفتے میں مسلمانانِ ہند کا ایک بڑا اجتماع بھی لکھنؤ میں ہوا تھا جس کے انتظامات میں حافظ ابراہیم اور قاضی عبدالغفار پیش پیش تھے۔ مولانا آزاد نے اسی کانفرنس میں مسلمانوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ فرقہ پرست سیاست کو چھوڑ کر کسی قومی جماعت کے ساتھ ہو جائیں۔ ان کا مشورہ کانگریس میں شمولیت کے لیے تھا۔

بشیشور دیال سیٹھ کا ٹرم جب ختم ہو گیا تو اچاریہ نریندر دیو کا لکھنؤ یونیورسٹی میں وائس چانسلر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ اچاریہ نریندر دیو سے پہلے میں ۱۹۳۸ء میں فیض آباد میں مل چکا تھا وہاں ایک لکچر کے سلسلے میں گیا ہوا تھا تو وہاں ایک دوست کے ساتھ اچاریہ نریندر دیو کے گھر گیا۔ وہ فیض آباد کے رہنے والے تھے اور وہاں کے مشہور محلے گلاب باڑی میں ان کا مکان تھا۔ اس زمانے میں وہ کانگریس کے ممتاز رہنماؤں میں سے تھے۔

۱۹۴۲ء میں ہندستان چھوڑو تحریک کے سلسلے میں جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد کے ساتھ احمد نگر کے قلعہ میں نظر بند رہے۔ بعد میں انھوں نے کانگریس چھوڑ دی تھی اور سوشلسٹ پارٹی قائم کی تھی۔

اچاریہ نریندر دیو اُردو سے خاصے آشنا تھے اور انھوں نے ایک گفتگو میں مجھے بتایا تھا کہ بچپن میں وہ اپنی نانی کے ساتھ فیض آباد کی زنانی مجلسوں میں جایا کرتے تھے جہاں عام طور پر انیس و دبیر کے مرثیے پڑھے جاتے تھے۔ ان مرثیوں کی وجہ سے وہ اُردو سے اچھی طرح واقف ہو گئے تھے۔ اچاریہ جی پالی کے ممتاز عالم تھے اور ہندی میں بھی وہ ایک صاحب طرز ادیب کی حیثیت رکھتے تھے۔ دلچسپ بات یہ بھی کہ باوجود اس کے وہ ہندستانی کے حامی تھے۔ جب ہندی بولتے تھے تو اچھی خاصی ادبی ہندی ہوتی تھی اور جب اُردو بولتے تھے تو وہ اُردوئے معلّیٰ معلوم ہوتی تھی۔ میں نے ایک دفعہ ان سے دریافت کیا کہ یہ تضاد کیوں ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ بھئی میں نظریاتی طور پر ہندستانی کا حامی ہوں لیکن میرا ادبی ذوق کھچڑی زبان کو پسند نہیں کرتا۔

میں نے اپنی زندگی میں تین ایسے وائس چانسلر دیکھے جنھوں نے اپنے دور میں ان یونیورسٹیوں کو نئی بلندیوں پر پہونچایا جہاں وہ وائس چانسلر رہے۔ اچاریہ نریندر دیو، ڈاکٹر ذاکر حسین اور سی۔ ڈی۔ دیش مکھ۔ (ڈاکٹر نریندر دیو لکھنؤ یونیورسٹی، ڈاکٹر ذاکر حسین علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور ڈاکٹر سی۔ ڈی۔ دیش مکھ دہلی یونیورسٹی کے کارناموں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا) لکھنؤ یونیورسٹی اس زمانے میں ہندستان کی بہترین یونیورسٹیوں میں گنی جاتی تھی۔ وہاں بیربل ساہنی، بہل اور آر۔ جی۔ مشرا جیسے سائنس داں، سدھانت اور سرلیشٹ جیسے انگریزی کے استاد اور ڈی۔ پی۔ مکرجی، وحید مرزا، مسعود حسین رضوی، بی۔ این۔ موجمدار جیسے اساتذہ تھے جن کی شہرت سارے ملک میں تھی۔ ڈی۔ پی۔ مکرجی کے متعلق BEVERLY NICOLS نے کہا تھا کہ انھیں ہندستان میں ایک ہی انٹلکچوئل ڈی۔ پی۔ مکرجی ملے۔

جب تک میرا قیام ۷، بیرو روڈ لکھنؤ میں رہا، ہر اتوار کو یہاں انجمن ترقی پسند مصنفین کا جلسہ ہوا کرتا تھا۔ یہ جلسے اتنی پابندی سے ہوتے تھے کہ "نیشنل ہیرالڈ" کے ایڈیٹر کہتے تھے کہ ہم اس جلسے کی اطلاع ضروری نہیں سمجھتے خود ہی اس کی باقاعدگی کی وجہ سے اس کا اعلان کر دیتے ہیں۔ ان جلسوں میں لکھنؤ کے بیشتر پرانے اور نئے ادیب شریک ہوتے تھے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے استادوں میں جن لوگوں سے میرا ربط و ضبط زیادہ رہا ان میں ڈاکٹر عبد العلیم، سید احتشام حسین، نور الحسن ہاشمی، عبد الاحد خاں خلیل اور احسن فاروقی قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ شعبۂ انگریزی کے شیام کشن نرائن اور دیوکی پانڈے اور شعبۂ اقتصادیات کے ویر بہادر سنگھ اور اودھ کشور شرن اور نصیر احمد خاں اور شعبۂ انگریزی کے ہری کشن اوستھی قابل ذکر ہیں۔

شاگردوں میں آل حسن (بی بی سی والے) حنیف فوق، منظر سلیم قاضی عبد الستار، چودھری محمد نعیم، نادر علی خاں، مسعود عالم، امیر احمد صدیقی، احمد جمال پاشا اور عالیہ عسکری (عالیہ امام) یاد آتے ہیں۔

میں جب ۱۹۵۳ء میں بیرو روڈ سے منتقل ہو کر نعمت اللہ بلڈنگ امین آباد میں آ گیا تو ترقی پسند مصنفین کے جلسے یہاں بھی پابندی سے ہونے لگے۔

لکھنؤ کے قیام میں جن ادیبوں سے ملنے کا موقع ملا، ان میں اثر لکھنوی، آنند نرائن ملّا، کشن پرشاد کول، چودھری محمد علی ردولوی اور حبیب احمد صدیقی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اثر لکھنوی سے سب سے پہلی ملاقات چکراتے کے ڈاک بنگلے میں ہوئی تھی۔ اثر صاحب اس زمانے میں دہرہ دون کے کلکٹر تھے اور دورے پر چکراتے آئے ہوئے تھے۔ میں علی گڑھ یونیورسٹی کے چند ساتھیوں کے ساتھ مسوری سے شملہ کا پیدل سفر کر رہا تھا۔ جب ہم لوگ چکراتے پہونچے تو معلوم ہوا کہ ڈاک بنگلے میں کوئی کمرہ خالی نہیں ہے کیوں کہ وہاں کلکٹر صاحب کا قیام ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کلکٹر جعفر علی خاں اثر لکھنوی ہیں۔ ان کا نام سنا تھا اور ان کے مضامین بھی رسالوں میں دیکھے تھے۔ ہمارے ایک ساتھی کے پاؤں میں چکراتے کے قریب پہونچتے پہونچتے جونکیں لپٹ گئی تھیں اور ان کا جوتا خون سے رنگین ہو گیا تھا۔ اس لئے ہمیں جلد سے جلد کہیں سر چھپانے کی جگہ کی ضرورت تھی۔ میں نے بالآخر ہمت کر کے اثر صاحب سے کہلوایا کہ "ہم لوگ اس حالت میں یہاں

پہنچے ہیں۔ چکرانے میں کسی سے واقف نہیں ہیں اور آپ کے قیام کی وجہ سے ڈاک بنگلے میں جگہ ملنے کا کوئی سوال نہیں کیا۔ کیا آپ ازراہ مہربانی ایک رات ٹھہرنے کا انتظام کروادیں گے۔ صبح ہمیں اگلے پڑاؤ کے لئے چلنا ہے۔"

اثر صاحب نے نہ صرف ہمارے لئے کمرہ خالی کروادیا بلکہ شام کے کھانے کی دعوت بھی دی تھی اور کھانے کے بعد انھوں نے خاصی دیر تک اپنا کلام بھی سُنایا۔ ان سے اس طرح تعارف تو ہو ہی گیا تھا جب میں لکھنؤ پہونچا تو کشمیری محلے میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بڑی محبت سے پیش آئے اور پھر برابر ان سے ملنا ہوتا رہا۔ اس زمانے میں حبیب احمد صدیقی بھی حکومت یوپی میں کسی شعبے کے سکریٹری تھے۔ بجنور کے رہنے والے حبیب احمد صدیقی بہت اچھے شاعر بھی تھے اور ادب کا بڑا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ علی گڑھ سے انھوں نے انگریزی میں ایم۔ اے کیا تھا۔ جب وہ اناؤ کے کلکٹر ہوکر چلے گئے تو انھوں نے اثر صاحب کو اور مجھے ایک اتوار کو اناؤ بلایا۔ ہم دونوں کوئی دس بجے کے قریب اناؤ پہونچے۔ کئی گھنٹے میر و غالب کی شاعری پر ہم تینوں کے درمیان گفتگو ہوئی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد تھوڑی دیر آرام کیا اور سہ پہر میں ہم لوگ لکھنؤ واپس آگئے۔ اب تک میر کے ایک شعر کی تشریح یاد ہے شعر یہ ہے ؎

اُگتے تھے دستِ بلبل و دامانِ گل بہم
صحنِ چمن نمونۂ یوم الحساب تھا

اثر صاحب نے بتایا تھا کہ دستِ بلبل سے مراد وہ ہری پتیاں ہیں جو پھول کے نیچے ہوتی ہیں اور دامانِ گُل سے مُراد پھول کی پنکھڑیاں۔ یہ ہری پتیاں پانچ ہوتی ہیں اور گویا ایک پنجے کی شکل سی ہوتی ہے اس لیے میر نے ان پتیوں کو دستِ بلبل کہا ہے۔ گویا جس طرح مظلوم کا ہاتھ میدانِ حشر میں ظالم کے گریبان پر ہوگا، اسی طرح ان ہری پتیوں کی سی شکل میں بلبل کا ہاتھ پھول کے دامن پر ہے۔ اثر صاحب نے اس موقع پر اپنا کلام بھی سنایا تھا۔ ولی کی مشہور زمین میں ان کا یہ شعر اب تک یاد ہے ؎

مجھے کیا نیند آئے گی کہ ہمدم میں نے دیکھی ہیں
وہ آنکھیں بند ہوتے وقت خواب آہستہ آہستہ

اثر صاحب مجھ پر بڑی عنایت کرتے تھے۔ ان سے مختلف ادبی مسائل پر گھنٹوں گفتگو ہوتی تھی۔ میری دعوت پر لکھنؤ یونیورسٹی کے مشاعرے میں کئی دفعہ شرکت کی۔ اپنے گھر پر کئی دفعہ میری دعوت کی۔ میرے بعض اشعار کی انھوں نے بڑی تعریف کی اور بعض میں انھوں نے اصلاحیں بھی تجویز کیں۔ میں ان کا باقاعدہ شاگرد تو نہیں رہا لیکن ان سے استفادہ خاصا کیا ہے۔ میر کی عظمت کو انھوں نے ادبی دُنیا میں اور واضح کیا، اور "مزامیر" کے ذریعے میر کا ایک بہت اچھا انتخاب پیش کیا۔ جب میں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں اقبال سوسائٹی قائم کی تو اس کے افتتاحی جلسے میں انھوں نے اقبال کے اسلوب پر ایک مضمون بھی پڑھا تھا۔ اثر صاحب نے فیض، سردار جعفری اور بعض دیگر شعراء کے کلام پر قابلِ قدر علمی تنقید بھی کی ہے۔ مجاز کے متعلق ان کا یہ جملہ ایک زمانے میں خاصا مشہور ہوا تھا کہ:

"اردو شاعری نے ایک 'کیٹس' پیدا کیا تھا جسے بعد میں بھیڑیے اُٹھالے گئے۔"

میرے لکھنؤ کے قیام کے دوران میں فراق پر ان کے اعتراضات اور فراق کے جوابات رسائل میں دل چسپی کا مرکز تھے۔ اثر صاحب کو فراق کے کلام کی ناہمواری پر بجا اعتراض تھا اور اسی کے ساتھ ساتھ ان کی رباعیوں میں بعض عُریاں اشعار پر بھی۔ فراق صاحب نے سنجیدہ جواب کے بجائے زیادہ تر اثر صاحب کے کلام کے پھیکے پن پر زور دیا تھا اور ان کی شخصیت کا بھی مذاق اڑایا تھا۔ فراق کے کلام میں یہ ناہمواری اور رُباعیوں میں کہیں کہیں عریانی مسلم ہے۔ "بہاراں" کے نام سے اثر صاحب کے کلام کا مجموعہ بہت سے جواہر پارے رکھتا ہے۔ "فرہنگِ اثر" کے نام سے نوُر اللغات کی جو غلطیاں انھوں نے دکھائی ہیں ان کی اہمیت بھی مسلم ہے۔ لکھنؤی تہذیب اس کی نفاست، وضعداری اور دل کشی اثر صاحب پر ختم ہوگئی۔

پنڈت آنند نرائن مُلا لکھنؤ کی ایک اور اہم شخصیت ہیں جن سے میری خاص قربت رہی ہے۔ وہ میرے یہاں انجمن ترقی پسند

مصنفین کے کئی جلسوں میں شریک ہوئے اور پھر ربط ضبط اتنا بڑھا کہ قریب قریب روزانہ ان سے ملاقات ہوتی رہی۔ وہ لکھنؤ کافی ہاؤس کے بڑے دلدادہ تھے، جب میرا قیام بیرو روڈ پر تھا تو وہ کسی ٹریبونل کے جج ہو گئے تھے جس کا کام ہندستان و پاکستان کے سابق فوجیوں کے واجبات کا معاملہ طے کرنا تھا۔ انھیں خاصی فرصت تھی۔ بارہ دو خانے سے پہلے دفتر جاتے اور پھر مجھے لیکر کافی ہاؤس کا ایک پھیرا کرتے۔ ملّا صاحب بعد میں لکھنؤ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مقرر ہوئے۔ لکھنؤ سے پارلیمنٹ کے ممبر منتخب کیے گئے دو مرتبہ راجیہ سبھا کے ممبر ہوئے۔ انجمن ترقی اُردو ہند کے دس سال تک صدر رہے۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام "جوئے شیر" کے عنوان سے ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا۔ میرا اس پر خاصا مفصل مقدمہ ہے اور میں نے اس میں اس بات پر زور دیا ہے کہ چکبست کے بعد جدید لکھنؤ کی شاعری کی بلندی اور عظمت آنند نرائن مُلّا کے یہاں ملتی ہے چکبست کی نظم "خاک ہند" تو مشہور ہے لیکن مُلّا کی نظم "زمینِ وطن اے زمینِ وطن" اپنی غنائیت کی وجہ سے قومی نظموں میں ایک امتیاز رکھتی ہے۔ مُلّا صاحب کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ "جوئے شیر" کے علاوہ "کچھ ذرّے کچھ تارے"، "سیاہی کی ایک بُوند"، "میری حدیثِ عمرِ گریزاں" اور "مضامینِ نہرو" کے نام سے پنڈت جواہر لال نہرو کے چند منتخب انگریزی مضامین کا اُردو ترجمہ نیز انجمن ترقی اردو ہند کی کُل ہند اُردو کانفرنس منعقدہ جے پور میں ان کا خطبۂ صدارت ہمارا قیمتی سرمایہ ہیں۔ اسی خطبے میں انھوں نے کہا تھا کہ ـــــ

"میں اپنا مذہب چھوڑ سکتا ہوں مگر اپنی زبان نہیں چھوڑ سکتا"۔

ان کے یہ اشعار بھلائے نہیں جا سکتے ؎

لبِ مادر سے مُلّا لوریاں جس نے سُنائی تھیں •
وہ دن آیا ہے اب اس کو بھی غیروں کی زباں سمجھو

"جوئے شیر" کا ایک نسخہ میری نذر کرتے ہوئے انھوں نے یہ رُباعی بھی لکھی تھی ؎

•
یہ حادثہ سالِ چہل و نہ میں ہوا — ہندی کی چھری تھی اور اُردو کا گلا

اُردو کے ادیبوں میں جو مقتول ہوئے
مُلّا نامی سُنا ہے شاعر بھی تھا

یہ بات شاید بہت سے لوگوں کو معلوم نہیں کہ مُلّا صاحب نے اقبال کے ان قطعات کا بھی انگریزی میں ترجمہ کیا ہے جو "لالۂ طور" کے نام سے پیامِ مشرق میں ملتے ہیں۔ ساہتیہ اکاڈمی کے رسالے "انڈین لٹریچر" میں یہ تراجم چند سال ہوئے شائع ہوئے۔

لکھنؤ میں کئی بار چودھری محمد علی سے ملاقات ہوئی، ان کے افسانوں کا مجموعہ "گناہ کا خوف" عرصہ ہوا شائع ہو چکا تھا۔ ان کی دوسری کتاب "کشکول محمد علی شاہ فقیر" میرے زمانے میں شائع ہوئی۔ اس میں بھی "نیلم کا نگ" جیسا افسانہ موجود ہے۔ چودھری محمد علی بڑے باغ و بہار انسان تھے۔ عمر تو اس وقت ساٹھ سے متجاوز تھی مگر اپنی زندہ دلی اور شوخیِ طبع کی وجہ سے مرجعِ خلائق تھے۔ کبھی کافی ہاؤس آجاتے تو تھوڑی دیر کے بعد لوگ اپنی کُرسیاں لے کر ان کی دل چسپ باتیں سننے کے لئے پہونچ جاتے اور پھر یہ عالم ہوتا "وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی"۔ انھوں نے اپنی لڑکی ہما کے نام جو خط لکھے ہیں وہ مکتوب نگاری میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ چودھری صاحب کے یہاں طنز کے مقابلے میں ظرافت زیادہ ہوتی تھی۔ وہ زندگی کے نشیب و فراز پر پرلطف انداز میں تبصرہ کرتے۔ کسی کی دکھتی رگ چھیڑتے تو اس طرح کہ وہ ہنس پڑتا ان کے یہاں طنز کے تیر نہیں ہوتے تھے بلکہ ہلکی سی، ہجو ملیح کی نوک اسی زمانے میں مراد چودھری کی خودنوشت انگریزی میں شائع ہوئی تھی، اس کے بڑے مدّاح تھے، اس لیے کہ اس کتاب میں کسی کو بخشا نہیں گیا تھا۔ اقبال کا یہ مصرع ان پر واقعی صادق آتا تھا۔ ع

جس کی پیری میں ہے مانندِ سحر رنگِ شباب

مولانا عبدالماجد دریابادی سے ملاقات تو رشید صاحب کے یہاں علی گڑھ میں ہو چکی تھی، ان کے علم و فضل کا قائل تھا لیکن ان کے نقطۂ نظر سے کبھی متفق نہیں ہو سکا۔ مولانا عبدالماجد کی ساری زندگی پڑھنے لکھنے میں گزری۔ انھوں نے فلسفے کی بعض اہم کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ "ہم اور آپ" کے نام سے انسانی نفسیات پر بڑی اچھی کتاب لکھی ہے۔ "اکبر کا آخری دورِ شاعری"۔ "اُردو کا ایک

بدنام شاعر"۔ "محمد علی: ایک ذاتی ڈائری" ان کی بہ تصانیف قابلِ ذکر ہیں۔ ان کا اصل کارنامہ "تفسیر ماجدی" ہے۔ ان کی پابندیِ اوقات اور منظم زندگی قابلِ رشک تھی۔ ان کا اپنا ایک اسلوب بھی ہے جس میں رعایتِ لفظی کی چاشنی کچھ زیادہ ہی ہے۔ ایک عرصے تک انھوں نے پہلے "سچ" اور پھر "صدق" نکالا۔

'سچ' اور 'صدق' دونوں کے شذرات میں اکثر مغربی تہذیب کے داغ دھبوں کا ذکر ضرور ہوتا اور ان میں عام طور پر جنسی آزادی اور بے راہ روی کے تذکرے ہوتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا کے کتب خانے میں جنسیات پر بھی خاصا لٹریچر تھا۔ میں جب امریکہ کے سفر سے واپس آیا تو ہماری زبان، میں کئی ماہ تک امریکہ کے قیام کے تاثرات لکھے۔ ایک قسط میں فلپ راتھ کی کتاب PORTNOYS COMPLAINT کا بھی تذکرہ تھا۔ مولانا عبدالماجد نے ایک خط میں اس مصنف کی اور کتابوں کے بارے میں بھی دریافت کیا تھا۔ میرا جی نے اپنی نظم 'لب جوئے بارے' میں جس قبیح عادت کا ذکر کیا ہے، فلپ راتھ نے اس پر ایک پورا ناول لکھ دیا ہے۔ مولانا کی کتاب "محمد علی: ایک ذاتی ڈائری" پر میں نے لکھنؤ ریڈیو سے تبصرہ کیا تھا۔ اور میں نے گفتگو اس طرح شروع کی تھی:

"یہ ایک پارکھ کا نہیں، ایک پرستار کا کارنامہ ہے"۔

اسٹیشن ڈائرکٹر اس جملے پر بہت گھبرایا اور مجھ سے کہا کہ "مولانا ہماری مشاورتی کمیٹی کے ممبر ہیں، ان کے خلاف یہ جملہ یا تو نکال دیں یا نرم کردیں"۔ میں نے جواب دیا کہ حضرت ریڈیو پر فرقہ وارانہ منافرت پھیلانا، جنس کا برملا اظہار کرنا اور حکومت پر اعتراضات ممنوع ہیں۔ ادبی تنقید کب سے آپ نے ممنوع قرار دے دی۔ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں مولانا محمد علی کو مولانا عبدالماجد جیسے پرستار ملے ویسے تو اب پارکھ بھی کسی کو نہیں ملتے۔ مجھے اپنے جملے میں ترمیم منظور نہیں۔" چنانچہ یہ اسی طرح نشر ہوا۔

جوشؔ سے بھی لکھنؤ میں متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ پہلی ملاقات جو علی گڑھ میں ہوئی بہت دل چسپ تھی۔ دسمبر ۱۹۳۸ء میں شعبۂ اردو کی انجمن، حدیقۃ الشعر کی طرف سے مشاعرہ تھا۔ اس انجمن کا میں صدر تھا اور انجمن اردوئے معلّٰی کے رشید صاحب، جاں نثار اختر اس وقت ایم اے فائنل میں تھے اور وہ ہماری انجمن کے سکریٹری تھے۔ احسان دانش پہلی دفعہ علی گڑھ آئے تھے اور بہت مقبول رہے۔ انھوں نے شاید ایک نظم "مزدور کی عید" سنائی تھی۔ جوشؔ اس وقت مشاعرہ کے ہال میں داخل ہوئے جب مشاعرہ شباب پر تھا۔ مجازؔ بھی ان کے ساتھ تھے۔ جاں نثار نے میرے کہنے پر مجازؔ سے فرمائش کی کہ تم "نذرِ علی گڑھ" پڑھو۔ یہی نظم بعد میں علی گڑھ یونیورسٹی کا ترانہ قرار پائی۔ سب سے آخر میں جوشؔ کا نمبر آیا، انھوں نے ایک قطعہ شروع کیا جس کا پہلا اور آخری شعر یہ ہے ؎

مقامِ شیخ سے واقف ہوں میں بھی
کہ یہ پاپڑ بہت بیلے ہوئے ہیں

خدا کو اور پہچانیں نہ حضرت
خدا کے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں

اس پر ہال میں ایک شور برپا ہوگیا۔ ظفر احمد صدیقی (مرحوم) نے جو فلسفے میں لکچرر تھے، اعتراض کیا کہ جوشؔ صاحب نے بزرگانِ دین کی توہین کی ہے۔ میں نے صدر کی حیثیت سے ایک چھوٹی سی تقریر کی اور کہا کہ اردو شاعری میں زاہد اور شیخ پر طنز کی ایک خاصی پرانی روایت ہے۔ اسی سیاق و سباق میں اس نظم کو بھی دیکھنا چاہیے۔ اس کے بعد مجمع خاموش ہوگیا اور میں نے جوشؔ صاحب سے دوسری نظم پڑھنے کی فرمائش کی۔ جوشؔ صاحب نے کہا: نظم کا عنوان ہے "فتنۂ خانقاہ" اور ابھی یہ دو مصرعے پڑھ پائے تھے ؎

اک دن جو بہرِ فاتحہ اک بنتِ مہر و ماہ
پہنچی نظر جھکائے ہوئے سوئے خانقاہ

زاہد نے اٹھائی جھجکتے ہوئے نگاہ
ہونٹوں میں دب کے ٹوٹ گئی ضربِ لاالٰہ

کہ رشید صاحب جو سامنے پہلی صف میں بیٹھے ہوئے تھے، کھڑے ہوگئے اور اس ڈر سے کہ کہیں پھر کوئی ہنگامہ نہ ہو جائے، جوشؔ صاحب سے التجا کی کہ آپ کے خزانے میں تو ہر طرح کے ہیرے جواہرات ہیں ایک موضوع پر نظم ہو چکی اب کسی اور موضوع مثلاً فطرت نگاری یا

انقلاب پر کچھ ارشاد ہو۔ رشید صاحب کی بات سُن کر جوش صاحب خفا ہو گئے اور کہنے لگے :

"میں یہاں تراویح پڑھنے نہیں آیا ہوں"۔

اور یہ کہہ کر اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔ میں نے اس کے بعد روش اور احسان دانش دونوں سے باری باری دوسرے دور کے طور پر کچھ سنانے کو کہا۔ احسان دانش نے تو معذرت کر لی۔ روش نے چند شعر میرے کہنے سے سُنا دیئے اس کے بعد مشاعرہ ختم ہو گیا۔

جوش صاحب سے پھر ۱۹۳۹ء میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں ملاقات ہوئی تھی۔ ڈاکٹر رشید جہاں میرے گھر کے قریب ہی رہتی تھیں اور ان سے اکثر ملاقات ہوتی تھی ایک دن جب وہ آئیں تو کہنے لگیں کہ جوش صاحب آئے تھے میں گھر پر موجود نہیں تھی، چلئے ان سے مل آئیں۔ چنانچہ میں رشید جہاں کے ساتھ مرزا جعفر حسین کے مکان پر بارودخانے میں جہاں جوش ٹھہرے ہوئے تھے، گیا۔ جوش صاحب بیٹھے شغل کر رہے تھے۔ ماتی جائسی، مرزا جعفر حسین، بسمل شاہجہاں پوری اور چند اور حضرات موجود تھے ہنسی اور قہقہے کی آواز آ رہی تھی۔ رشید جہاں کے داخل ہوتے ہی فضا سنجیدہ ہو گئی۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد رشید جہاں نے ان سے تازہ کلام سنانے کی فرمائش کی اور انھوں نے ایک نظم سنائی۔ نظم سننے کے بعد رشید جہاں نے کہا کہ مجھے اپنے کلینک جانا ہے۔ مریض انتظار کر رہے ہوں گے جوش صاحب دروازے تک ان کو پہونچانے آئے۔ مجھ سے جوش نے کہا" ان کو تو کلینک جانا ہے آپ کی تو ایسی کوئی مصروفیت نہیں ہے۔ کچھ دیر اور بیٹھئے۔" چنانچہ میں بیٹھ گیا۔

واپس آ کر جوش نے اطمینان کی سانس لی اور کہنے لگے" بھئی اب مردانہ ہوا"۔ سب لوگ ہنس پڑے۔ اس کے بعد جوش صاحب نے ماتی جائسی کی شان میں فی البدیہہ شعر پڑھنا شروع کر دیئے۔ یہ اشعار فانی کی مشہور غزل ؎

مال سوزِ غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ

کی زمین میں تھے جس کا سامنے کا قافیہ 'مانی' تھا۔

جوش صاحب کئی مرتبہ غریب خانے پر بھی تشریف لائے۔ ایک دفعہ وہ آئے تو انجمن ترقی پسند مصنفین کا جلسہ میرے ہی گھر پر ہونے والا تھا۔ میں نے جوش صاحب سے کہا کہ کیا ہی اچھا ہوتا اگر آپ جلسے میں شریک ہو جاتے۔ انھوں نے معذرت کی کہ بھائی میں اب سرکاری ملازم ہوں اور آپ کو تو معلوم ہے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین حکومت کی نظر میں معتوب ہے اس لیے میری شرکت نہ ہو سکے گی۔ کئی ملاقاتوں میں، میں نے یہ محسوس کیا کہ جوش صاحب معاصرین کے اعتراف میں زیادہ فیاضی سے کام نہیں لیتے تھے۔

اتفاق سے فیض کے یہ دو شعر حیدرآباد سندھ کے جیل سے سجاد ظہیر کے ایک خط کے ذریعے سے لکھنؤ پہونچے تھے میں نے جوش صاحب کو یہ شعر سنائے اور ان کی رائے طلب کی۔ جوش صاحب نے کوئی گرم جوشی نہیں دکھائی اور اتنا کہا 'بہت خوب'۔ ؎

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے

کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا، کہ رکھ دی ہے

ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

ایک دفعہ خبر ملی کہ جوش صاحب آئے ہوئے ہیں اور کارلٹن ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میں پہونچا تو اتفاق سے اکیلے بیٹھے شغل کر رہے تھے مجھے دیکھتے ہی بوتل اُٹھائی اور ایک خالی گلاس میں میرے لئے شراب ڈالنی چاہی۔ میں نے معذرت کی کہ میں تو پیتا ہی نہیں ہوں۔ بوتل رکھ دی اور سگرٹوں کا ڈبہ اٹھایا۔ میں نے پھر معذرت کی کہ میں سگریٹ بھی نہیں پیتا۔ پاس ہی پانوں کی ڈبیا رکھی ہوئی تھی اب کے انھوں نے ڈبیا اٹھائی اور مجھے پیش کی۔ میں نے آداب کر کے ڈبیا میں سے ایک پان لے لیا تو مسکرا کر بولے :

"شکر ہے کہ آپ نے میرے یہاں کی کوئی چیز تو قبول کی"۔

وہ 'آجکل' کے ایڈیٹر تھے اور ایسے ایڈیٹر کہ ان کی فرمائش پر میں نے ایک مضمون رسالہ کے لیے لکھا۔ وہ مضمون رسالہ میں چھپ بھی گیا۔ اب لطیفہ یہ ہوا کہ اسی نشست میں مجھ سے شکایت کی کہ آپ کا مضمون اب تک نہیں آیا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت مضمون تو چھپ بھی گیا۔ اس پر ہنس کر بولے "اے آعرشی نے مجھے بتایا ہی نہیں

۱۹۵۳ء کے شروع میں لکھنؤ ریڈیو سے ایک مشاعرہ ہوا۔ ڈائرکٹر نے مجھ سے کہا کہ میں جوش صاحب کو اور جگر صاحب کو مشاعرہ میں شرکت کے لئے آمادہ کرلوں۔ جوش کو لکھا تو انھوں نے پہلے تو ریڈیو والوں کی خسّت کی شکایت کی پھر آنے پر آمادگی ظاہر کی مگر یہ شرط بھی لگائی کہ میں بسمل سعیدی کو بھی دعوت نامہ بھیجوں گا۔ میں نے بسمل سعیدی کے لیے ڈائرکٹر سے بات کی انھوں نے معذرت کی کہ اب کے حسنِ اتفاق سے جتنے لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا سبھوں نے آمادگی ظاہر کردی ہے۔ اس لئے اضافے کی گنجائش نہیں ہے۔ یہی بات میں نے جوش صاحب کو لکھ دی۔ جوش صاحب نے قدرے برہمی سے مجھے لکھا کہ "مجھے یقین ہے کہ آپ نے سعیِ بلیغ نہیں کی ہوگی ورنہ ڈائرکٹر آپ کی بات کو ٹال نہیں سکتے تھے۔ خیر میں نے وعدہ کرلیا ہے تو بدرجۂ مجبوری آ ہی جاؤں گا۔"

جوش صاحب آئے، جگر بھی موجود تھے۔ جوش صاحب نے جو نظم پڑھی وہ پہلے سے ڈائرکٹر کو دکھائی نہیں گئی تھی۔ عام طور پر ریڈیو کے مشاعرے میں جو کلام سنایا جاتا ہے اس کی نقل پہلے سے بھیج دی جاتی ہے۔ ڈائرکٹر نے مشاعرہ سے پہلے جوش صاحب سے نظم کی نقل مانگی تو انھوں نے کہا کہ آپ مشاعرہ ہی میں سُن لیجیے گا اصرار کرنے کی اس کی ہمت نہ ہوئی۔ نظم کے دو شعر مجھے اب تک یاد ہیں ؎

ٹھیکرے بیچنے والوں کے پُرانے گاہک
بند کرتے ہیں جواہر کی دکاں اے ساقی

جس کے ہر لفظ سے سو پھول مہک اُٹھتے ہیں
کاٹ دی جائے گی شاید وہ زباں اے ساقی

مشاعرے کے بعد جوش تو چلے گئے۔ مگر ڈائرکٹر صاحب بہت گھبرائے ہوئے تھے اور مجھ سے کہنے لگے اب میری خیر نہیں۔ یقیناً مجھ سے جواب طلب کیا جائے گا۔ دیکھئے صرف تبادلے پر بات ختم ہوتی ہے یا نوکری جاتی ہے۔

میں نے کہا حضرت کچھ نہیں ہوگا۔ آپ گھبرایئے نہیں۔ جوش صاحب محکمۂ اطلاعات کے ملازم ہیں۔ اگر آپ سے کچھ پوچھا جائے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ "آجکل" کے ایڈیٹر نے یہ نظم پڑھی تھی۔

لکھنؤ یونیورسٹی کا ایک منظر

بہر حال کچھ نہیں ہوا اور جوش صاحب نے جس دھڑلے سے ریڈیو پر یہ نظم پڑھی، اس سے ہم سب کی بڑی ڈھارس بندھی۔ اسی مشاعرہ کا ایک واقعہ اور یاد آتا ہے۔ مشاعرہ ختم ہونے کے بعد جگر صاحب ایک کونے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ جوش صاحب نے مجھ سے کہا:

"دیکھو! شیر گھاس کھا رہا ہے۔"

اس کے بعد جگر صاحب سے کہنے لگے: "ارے بھائی! اُردو پر عجب زمانہ وقت پڑا اور ہم تم دم بخود بیٹھے ہوئے ہیں۔" جوش صاحب نے جو لفظ استعمال کیا تھا اس کو میں یہاں دُہرانے کی ہمت نہیں رکھتا۔ صرف مفہوم بیان کیے دیتا ہوں۔

جوش صاحب کے مزاج کا ایک رُخ لکھنؤ یونیورسٹی کے مشاعرہ میں سامنے آیا۔ یونیورسٹی کی جوبلی تھی۔ اچاریہ نریندر دیو وائس چانسلر نے اس موقع پر ایک مشاعرہ بھی ضروری سمجھا اور خاص طور پر جوش اور جگر کو سننے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ جوش صاحب عام طور پر مغرب کے بعد ہاتھ نہیں آتے تھے اس لئے کہ یہ ان کے شغل کا وقت ہوتا تھا مشاعرہ نو بجے سے تھا۔ میں نے ان کے دوست حکیم صاحب عالم سے درخواست کی کہ وہ کسی طرح جوش صاحب کو لے آئیں۔ حکیم صاحب میرا بہت خیال رکھتے تھے اس لئے وہ جوش صاحب کو خود پہنچا گئے۔

(باقی صفحہ ۳۴ پر)

علی جواد زیدی
اے ۵/۵ گرین فیلڈ کامپلکس مہاکالی کورس روڈ
اندھیری۔ بمبئی ۹۳

یادوں کی رہگزر

قدیم لکھنؤ میں واقع گورنمنٹ جوبلی کالج میں دو سال گزارنے کے بعد میں نے لکھنؤ کے جدید علاقے میں واقع لکھنؤ یونیورسٹی میں بی۔اے، کے پہلے سال میں داخلہ لیا۔ یہ واقعہ ۱۹۳۶ء کی ابتدا کا ہے۔ ۱۹۳۵ء کی آئینی اصلاحات کے تحت محدود اختیارات کی جمہوری حکومت قائم ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ کانگریس نے برطانوی حکومت سے یہ وضاحت چاہی تھی کہ گورنر حکومت کے عام معاملات میں دخل اندازی نہیں کرے گا طویل گفتگو کے بعد معاملات طے ہوئے اور کانگریس نے محدود خود مختاری قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا اور یہی وہ منزل تھی جب میں یونیورسٹی کے حدود میں داخل ہوا۔

داخل تو ہم پہلے بھی ہوتے تھے لیکن اُس وقت طلبہ کی عام ہڑتالوں میں یونیورسٹی کے طلبہ کی حمایت حاصل کرنے کے لئے اب فضا بدل چکی تھی پھر بھی ہم آزادی کی منزل سے دور تھے، اس لیے حکومت سے ٹکراؤ کی صورت کبھی کبھی پیدا ہو جاتی تھی اور جد و جہد کا وہ تسلسل قائم رہتا جو ہم کالج کے زمانے سے پہلے ہی اپنا چکے تھے۔ ابھی ایک سال پہلے ہی تو ہم نے اسی لکھنؤ کے گنگا پرشاد ورما ہال میں پہلی آل انڈیا اسٹوڈنٹس کانفرنس کا انعقاد کیا تھا، • جس کا افتتاح جوانوں کے ہر دلعزیز رہنما پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا تھا اور صدارت محمد علی جناح نے۔ یہ آخری موقع تھا جب یہ دونوں ہستیاں ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع ہوئیں اور دونوں نے متحدہ قومیت کا پیغام دیا۔ ۱۹۳۶ء کی اس کانفرنس نے یہ فیصلہ کیا کہ طلبا کی ایک کل ہند جماعت بنائی جائے اور اگلے سال لاہور اجلاس میں اس کا نام آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن طے پایا اور اس طرح طلبہ کی منظم تحریک کا آغاز ہوا۔ اسی سال انجمن ترقی پسند مصنفین کی داغ بیل بھی پڑی۔ پہلا اجلاس لکھنؤ ہی کے "رفاہ عام کلب" میں ہوا۔ صدارت منشی پریم چند نے کی اور سجاد ظہیر اور مولانا حسرت موہانی ممتاز شرکا میں تھے، میں ان دونوں ہی تاریخی اجتماعات میں شریک تھا اور دونوں سے عملی دلچسپی کا آغاز اُسی وقت سے ہوا جب میں ابھی جوبلی کالج کا طالب علم تھا۔ اسی نئی بیداری اور گہما گہمی کا کوئی خاموش تماشائی کیسے بنا رہ سکتا تھا۔

پہلی طلبہ کانفرنس کے انعقاد میں خاص کردار ادا کرنے والوں میں پریم نرائن بھارگو اور آئی این ام بدرالدین تھے۔ کانفرنس کے بعد بھارگو نے اپنے مکان میں ایک کمرہ الگ کر دیا تھا جو کئی برس تک طلبہ کی سیاست کا اہم مرکز بنا رہا۔ یہ امین آباد میں واقع تھا۔

یونیورسٹی کا علاقہ اودھ کے شاہی زمانہ میں "بادشاہ باغ" کہلاتا تھا۔ سن ستاون کے ہنگاموں میں اس پر بھی تباہی آئی اور آس پاس کے علاقوں کی بربادی کا اثر اس پر بھی پڑا کیونکہ یہ سکندر باغ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ جہاں لکھنؤ کے آزادی پسندوں نے برطانوی فوجوں سے زبردست مورچہ لیا تھا۔ بادشاہی نام کی یادگار کے طور پر ایک سُرخ رنگ کی بارہ دری اب بھی موجود تھی جس میں یونیورسٹی ریسٹوراں اور اساتذہ کا کلب تھا۔ کھیل کود کے وارڈن کا چھوٹا سا دفتر بھی اسی کے ایک گوشے میں تھا۔ بارہ دری کی شکل و صورت مسخ ہو چکی تھی۔ ایک خشک آبشار اور پشت پر ایک سوکھی نہر ایک اجڑے ہوئے دور کی یاد دلاتی رہتی تھی۔ آج یہ نشانات بھی باقی نہیں ہیں۔

یونیورسٹی کے قیام سے پہلے اس اس عمارت میں کیننگ کالج تھا جو الہ آباد یونیورسٹی سے وابستہ تھا۔ جب لکھنؤ کو اتر پردیش کا دارالحکومت بنایا گیا تو کالج کو بھی یونیورسٹی میں تبدیل کر دیا گیا۔ اجڑی ہوئی اخترنگری میں سچا اقتدار حکومت نہ سہی، لیکن اُس کی کچھ بو باس تو ملی۔ تعلقداران اودھ خوش ہوئے، وہ بھی مسرور ہوئے جو اودھ سے جذباتی وابستگی

رکھتے تھے۔ یہ سب الہ آباد کے خسارے پر ہوا اور انھیں فطری طور سے گراں گزرا۔ اس زمانے میں لکھنؤ اور الہ آباد کی اہمیت پر ثقافتی حلقوں میں کچھ نوک جھونک بھی چلی۔ اس سلسلے میں مشہور رباعی گو شاعر منشی سکھ دیو پرشاد بسمل الہ آبادی نے بہتوں کی دل لگتی بات کہی کہ لوگ لکھنؤ کو لاکھ بڑھائیں مگر ع

وہ گومتی کو تو گنگا بنا نہیں سکتے!

لیکن بنانا بھی کون چاہتا تھا۔ صفی جیسے لکھنوی نے کیا خوبصورت نظم الہ آباد پر لکھی ہے، جس میں انھوں نے گنگا ہی کیا 'تربینی' پر ناز کیا ہے ؎

اے الہ آباد اے جولاں گہہ گنگ و جمن
تیرا دامن تین تربینی کی ہے اک انجمن!

لکھنؤ دارالحکومت بن گیا لیکن قانون و انصاف کا مرکز الہ آباد ہی رہا۔ لکھنؤ کے حصے میں صرف چیف کورٹ آیا، ہائی کورٹ الہ آباد ہی میں برقرار رہا۔ الہ آباد محکمۂ تعلیم، پبلک سروس کمیشن، اکاؤنٹنٹ جنرل وغیرہ کا بھی صدر دفتر بنا رہا۔ الہ آباد میں سر تیج بہادر سپرو (محسن اردو) سر شاہ محمد سلیمان (جو ادب و قانون کا سنگم تھے)، پنڈت موتی لال نہرو، سر وزیر حسن (جو بعد میں لکھنؤ میں چیف جج ہوئے) جیسی عظیم ہستیاں تھیں۔ اور پھر وہ سیاست کا اہم مرکز بھی یہیں الہ آباد میں تھا جو آنند بھون اور سوراج بھون کے نام سے سارے ہندوستان کی توجہات کا محور بنا رہا۔

لکھنؤ کو صوبے کا صدر مرکز بنانے میں گورنر ہارکورٹ بٹلر نے خاص کد و کاوش کی تھی۔ انھیں اودھ سے ثقافتی سطح پر لگاؤ پیدا ہو گیا تھا اور وہ اپنی نجی زندگی میں کبھی کبھی انگرکھا اور دو پلی ٹوپی زیب تن کر لیتے اور سگار کی طرح پیچوان سے بھی لطف لیتے۔ (یہ روایت صرف سنی سنائی ہے، پتا نہیں کہ اس میں صداقت کہاں تک تھی) اتنا یقینی ہے کہ سن ستاون کی تلخیوں کی یادیں کم کرنے کی بٹلر نے کوشش ضرور کی اور لکھنؤ کے تعلقہ داروں نے اس کا بدلہ کئی طرح سے دیا۔ بٹلر روڈ، بٹلر پارک (جہاں ان کا اسپ سوار مجسمہ بھی نصب تھا)، بٹلر پیلس (جو دراصل محمود آباد پیلس تھا، لیکن مرحوم راجہ محمود آباد کی ہجرت کے بعد بحق سرکار ضبط ہو کر سرکاری افسروں کی رہائش گاہ کے طور پر خوبصورت کمپلکس بن گیا ہے) انھیں کی یادگاریں تھیں۔ یونیورسٹی میں ان کے نام پر بٹلر ہوسٹل تھا۔

آزادی کے بعد جب برطانوی یادگاریں ہٹائی گئیں تو یہ نام مٹا دیے گئے اور مجسمہ عجائب گھر کے ایک گوشے میں پہنچا دیا گیا۔ بٹلر ہوسٹل کے بارے میں معلوم نہیں کہ وہ نام بدستور باقی ہے یا وہ بھی بدل دیا گیا۔

یونیورسٹی پہنچ کر جوبلی کالج کے ساتھی کیلاش ورما سے ملاقات ہوئی۔ وہ مجھ سے ایک سال سینئر تھے اور ایک سال پہلے ہی یونیورسٹی پہنچ چکے تھے۔ مشہور سوشلسٹ لیڈر اچاریہ نریندر دیو کے بھتیجے تھے۔ میری ہی طرح طلبہ کی تحریک کے سرگرم رکن تھے، ان سے میری خاصی دوستی تھی افسوس کہ ع

خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

(خوب چمکے مگر جلد بجھ جانے والا شعلہ ثابت ہوئے) کسی شدید بیماری میں ابدی جدائی کا داغ دے گئے۔ ان کے علاوہ کچھ اور دوست بھی ساتھ آئے۔ ان میں ایک تعلقہ دار خاندان کے سیٹھ برادران بھی تھے۔ یہ توأم تھے اور جیسے جڑواں بھائی ہوتے ہیں۔ ان میں مکمل مشابہت تھی۔ کپڑے بھی یکساں اور ایک ہی رنگ کے پہنتے تھے۔ فرق یہ تھا کہ دونوں الگ الگ سکشن میں تھے مگر ایک کے ساتھ تھے۔ اکثر شناخت کا سوال اٹھ کھڑا ہوتا۔ ایک بار میرے کلاس نوٹ دوسرے دن واپس کرنے کا وعدہ کر کے لے گئے ——— دو دن تک نظر نہیں آئے۔ تیسرے دن ملے تو میں نے انھیں یاد دلایا۔ کہنے لگے "میں نے تو آپ سے نوٹ نہیں لیے"۔ میں حیران، میں نے پھر یاد دلانے کی کوشش کی تو بولے "غالباً آپ نے میرے بھائی کو دیے ہوں گے"۔ تھوڑی دیر بعد یہ بھائی صاحب ملے اور وہ نوٹ مجھے واپس کر دیے!! ایسے کئی دلچسپ واقعات آئے دن ہوا کرتے تھے! جوبلی کالج میں دو ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ آیا تھا، عبادت بریلوی اور میرے ماموں زاد بھائی سید خورشید احمد (سابق مدیر نیا دور) یہ دونوں مجھ سے ایک سال جونیئر تھے۔ سال بھر بعد یونیورسٹی آئے، برابر ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں، کیونکہ ہم تینوں قریب قریب رہتے تھے۔

طلبہ کے علاوہ اساتذہ میں پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب اور مولوی سید محمد حسین سے پہلے سے ملاقات تھی۔ مسعود صاحب اس وقت صدر شعبہ مگر ریڈر ہی تھے۔ کیونکہ شعبۂ فارسی و اردو میں پروفیسر کی جگہ ہی نہیں تھی۔ یہ

اردو کی راجدھانی کا حال تھا۔ بیسویں صدی کی تیسری دھائی کے آغاز میں عربی میں ــ ! اور سنسکرت کے شعبوں میں پروفیسر موجود تھے، عربی میں ڈاکٹر وحید مرزا اور سنسکرت میں ڈاکٹر ایر۔ سبب یہ تھا کہ ان دونوں زبانوں کو کلاسیکی زبانوں کا مرتبہ حاصل تھا، اردو کو نہیں ! فارسی کے شعبے میں مسعود صاحب کے علاوہ یوسف حسین موسوی صاحب اور مولوی عبدالقوی فانی تھے۔ وہ فارسی میں شعر بلکہ قصائد بھی لکھتے تھے۔ موسوی صاحب عرفی کے پرستاروں میں تھے۔ تنہا مسعود صاحب کو فارسی جدید پر عبور تھا اور وہی تحقیق کے مردِ میدان بھی تھے۔ اردو میں پہلے احتشام حسین صاحب اور بعد میں آل احمد سرور کی شمولیت سے شہر کے اردو داں حلقوں میں نئی چہل پہل دیکھی گئی۔ عربی میں ڈاکٹر وحید مرزا، ڈاکٹر عبدالعلیم اور انگریزی میں احمد علی صاحب کا اپنا مقام تھا لیکن وہ بھی اردو حلقے ہی میں شامل سمجھے جاتے تھے اور اس میں کیا شک ہے کہ یہاں بھی اُن کا اپنا مقام تھا۔

ہماری یونیورسٹی کی ایک بڑی خصوصیت اس کا بین صوبائی کردار تھا۔ وائس چانسلر ڈاکٹر پرانجپے ریاضی کے ماہر تھے، ان کے علاوہ جنوبی ہند کے ڈاکٹر رام سیاسیات کے شعبے کے صدر تھے ـــــــ اسی شعبے میں ڈاکٹر مینن بھی تھے، جن کی اہلیہ مسز لکشمی مینن بعد میں حکومتِ ہند کی وزارت خارجہ میں وزیر ہوئیں۔ سنسکرت کے صدر شعبہ آگے چل کر وائس چانسلر بھی ہو گئے تھے۔ ریڈر ابیر دادم کا تعلق بھی جنوبی ہند سے تھا۔ اہل بنگال میں مشہور ماہر اقتصادیات ڈاکٹر رادھا کمل مکرجی اور مشہور ترقی پسند استاد ڈی، پی مکرجی کے علاوہ بی بی مکرجی تھے۔ صدر شعبۂ فلسفہ ڈاکٹر این، این سین گپتا تھے۔ انگریزی کے صدر ڈاکٹر سدھانت صاحب تھے جو آکسفورڈ یونیورسٹی سے ایم، اے (انگریزی) تھے۔ شعبۂ کامرس کے صدر داس گپتا صاحب بھی بنگالی تھے۔ تاریخ ہند قدیم کے پروفیسر ڈاکٹر مکُند مکرجی تھے جو اس موضوع پر استناد کا درجہ رکھتے تھے ـــ ڈاکٹر مجمدار اینتھراپالوجی میں امتیازی شان کے مالک تھے۔ پنجابیوں میں پالیو باٹنی میں عالمی شہرت کے مالک ڈاکٹر بیربل ساہنی تھے، جن کی یاد میں اب ایک پالیو باٹنی انسٹی ٹیوٹ بنادیا گیا ہے، اس کے علاوہ فزکس میں ڈاکٹر ولی محمد تھے۔ دلی والوں میں احمد علی صاحب (مشہور ترقی پسند ادیب) انگریزی میں ریڈر ہوئے تھے۔ یوپی والے عربی، فارسی، اردو، ہندی شعبوں میں بھرے پڑے تھے۔ دوسرے اہم شعبوں میں اہم عہدے پر سروزیر حسن کے صاحبزادے ڈاکٹر حسین ظہیر کیمسٹری میں اور۔ پروفیسر سلطان (سیاسیات) کا نام بھی یاد آتا ہے لیکن اِن میں سے کوئی صدر شعبہ نہیں تھا۔ عربی میں صدر شعبہ بے ریش و بروت ڈاکٹر وحید مرزا تھے۔ ان کے علاوہ ریڈر ڈاکٹر عبدالعلیم اپنی ترقی پسندی کی وجہ سے نمایاں تھے۔ سلطان صاحب اور علیم صاحب بعد میں علی گڑھ یونیورسٹی چلے گئے۔ اور علیم صاحب تو وہاں وائس چانسلر بھی ہو گئے۔ غرض لکھنؤ یونیورسٹی کل ہند ادارہ تھی۔ یہی صورت الہ آباد، علی گڑھ اور بنارس یونیورسٹیوں کی بھی تھی، لیکن رفتہ رفتہ علاقائی تصورات غالب آتے گئے۔ اب مشکل ہی سے صلاحیتوں اور مہارت فن کا ایسا بین صوبائی اجتماع کہیں نظر آئے گا۔ معلوم نہیں اور حضرات کیا سوچیں گے لیکن میں علم کی حد بندی اور علاقہ بندی کو پسند نہیں کرتا۔ پھر سوچتا ہوں حافظ شیرازی کی طرح کہ میاں زیدی تم ٹھہرے گدائے گوشہ نشین خواہ مخواہ شور کیوں کرتے ہو؟ نقار خانے میں کون سُنے گا؟

پروفیسر سلطان سیاسیات کے علاوہ کھیلوں کے بھی رسیا بلکہ خود ٹینس کے اچھے کھلاڑی ہونے کی وجہ سے یونیورسٹی میں کھیلوں اور ان۔ سی۔ سی کے انچارج تھے۔ سلطان صاحب تعلقہ دار تھے اور بڑے خوش سلیقہ اور خوش اخلاق اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ یونیورسٹی پہنچ کر، ٹینس کے بین الاقوامی شہرت کے کھلاڑی غوث محمد سے ملاقات ہوئی۔ نام سے واقفیت تو پہلے سے تھی، لیکن ملنے کے بعد میں اس مشہور کھلاڑی کی اخلاقی بلندیوں سے واقف ہوا۔ اس پرخلوص، ملنسار، خوش مزاج ملیح آبادی پٹھان بلکہ تعلقہ دار سے مل کر یہ محسوس ہوا کہ پھل دار شاخیں کیوں جھکی رہتی ہیں۔ ع

نہد شاخ پُرمیوہ سر برزمیں! اُسے نہ اپنے پٹھان ہونے کا گھمنڈ تھا نہ تعلقہ داری اور شہرت کا غرور! وہ تو اس طرح دوستوں میں گھُل مل جاتا کہ بعض وقت ملنے والا سوچنے لگتا کہ یہ واقعتہً غوث محمد ہی ہیں یا کوئی اور ایک دن اپنے ساتھ ملیح آباد لے گئے اور ان کے دولت کدے پر ان کی میزبانی سے ہم لطف اندوز ہوئے۔ کبھی کبھی احمد حسین قدوائی، ٹینس کے دوسرے مشہور کھلاڑی بھی اُدھر آنکلتے۔ یہ ہر قدم اس انداز سے اٹھاتے

گویا یہ کھلاڑی نہیں بلکہ حکمراں نہیں تو حکمراں جماعت کے افرادِ اعلیٰ ضرور ہیں۔ دیر میں کھلے اور جب کھلے تو غوث ہی کی طرح گھُل مِل بھی گئے۔ پھر بھی غوث "چیزے دیگر" تھا! یونیورسٹی سے کچھ اور کھلاڑی بھی ابھرے۔ ان میں آخری انور جبین تھے، لیکن وہ صحافت کی طرف نکل پڑے۔ باتیرہیں کھیل کود کی رپورٹنگ کرتے تھے۔ آخر میں شاید پاکستان چلے گئے۔ کے ڈی سنگھ ہاکی کے مشہور کھلاڑی اسی یونیورسٹی کی دین تھے۔ اب ان کے نام پر ایک اسٹیڈیم بنا دیا گیا ہے۔ میری ان سب سے یاد اللہ تھی اگرچہ کھیل کود سے مجھے کبھی کوئی خاص شغف نہیں رہا۔

اساتذہ ہی کی طرح یونیورسٹی میں طلبہ کا مجمع بھی کُل ہند تھا۔ پنجاب، کشمیر، کرالا، تامل ناڈو وغیرہ علاقوں سے طالب علموں کی بڑی تعداد ہر سال ہماری یونیورسٹی میں آجاتی تھی۔ ان سے ہمارے ہوسٹلوں میں بڑی رونق رہتی۔ اساتذہ اور طلبہ کے اس رنگا رنگ مجمع نے ہماری یونیورسٹی کو ایک چھوٹا موٹا ہندوستان بنا دیا تھا، جس میں صوبوں اور زبانوں کی تفریق مٹ گئی تھی۔ آج معاملہ برعکس ہے۔ باہر کے طالب علم تو درکنار اساتذہ بھی مل جائیں تو ہم اسے خوش قسمتی سمجھیں گے۔ بیرونی طلبہ کی بڑی تعداد اس لیے بھی آتی تھی کہ یہاں ایم اے اور ایل ایل بی دونوں امتحانات ایک ساتھ یعنی دو سال کے اندر پاس کرنے کی اجازت تھی۔ دوسری یونیورسٹیوں میں یہ رعایت حاصل نہیں تھی۔

لکھنؤ یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم (Co-Education) عام تھی۔ یہ بڑی بات تھی، کیونکہ واجد علی شاہ کے لکھنؤ کی مسخ شدہ تصویر پیش کیے جانے کے باوجود لکھنؤ ایک صاف ستھرا، سنجیدہ اور خوش اخلاق معاشرہ تھا۔ یہاں انٹرمیڈیٹ تک لڑکوں اور لڑکیوں کے علیحدہ علیحدہ کالج تھے۔ لڑکیوں کے مخصوص کالج مہیلا ودیالیہ امین آباد میں، کرامت حسین گرلز کالج گومتی پار اور آئی ٹی کالج یونیورسٹی کے آس پاس اہم کالج تھے۔ لڑکوں کے بہت سے کالج تھے۔ آئی ٹی کالج اور بقیہ دو کالجوں میں بی اے کی سہولت بھی تھی لیکن اگر لڑکیاں چاہتیں تو یونیورسٹی میں اسی سطح پر داخل ہو سکتی تھیں۔ ایم اے کی تعلیم صرف یونیورسٹی میں ہوتی تھی، اس طرح یونیورسٹی میں طالبات کی بھی معقول تعداد تھی۔ ان میں مسلمان، کرسچین، ہندو سبھی فرقوں کی لڑکیاں تھیں۔ باہر سے آنے والی لڑکیوں کا قیام لیڈی کیلاش ہوسٹل میں ہوتا تھا

کچھ لڑکیاں میری ہم جماعت بھی تھیں۔ بعض طلبہ کی سیاسیات میں حصہ بھی لیتی تھیں۔ ان میں بھی کئی صوبوں اور تمام مذاہب کی نمائندگی تھی۔ اکثریت یو، پی بلکہ اودھ کی رہنے والیوں کی تھی۔ مسلم طالبات میں ترقی پسند تعلقہ داروں اور اعلیٰ عہدہ داروں یا بڑے زمیندار گھرانوں کی لڑکیاں تھیں۔ سبھی کا تعلق کھاتے پیتے خاندانوں سے تھا۔ دو ایک کا تعلق متوسط طبقے کے خاندانوں سے تھا۔ یہ تانگے سے یونیورسٹی آتی تھیں۔ صرف ایک طالبہ ایسی تھیں جو یونیورسٹی تک یکّہ سے آیا کرتی تھیں۔ ان کے ضعیف باپ بھی ساتھ ہی یونیورسٹی تک پہنچانے آتے اور پھر ساتھ ہی واپس لے جاتے۔ ان خاتون کو سبھی عزت کی نگاہ سے دیکھتے اور ان سے دلی ہمدردی رکھتے تھے۔ یہ سنجیدہ اور کم آمیز تھیں۔ کسی کو بے ضرورت بات کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ برقعہ پوش لڑکیاں بہت کم نظر آتی تھیں۔ پانچ چھ برس کے قیام میں میں نے مشکل سے چار پانچ پردہ پوش طالبات کو یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرتے دیکھا ہوگا۔ یونیورسٹی میں لڑکیوں کی کمی کا ایک سبب شہر میں طالبات کے اُن خصوصی کالجوں کی موجودگی تھی جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

ان میں آئی۔ ٹی کالج سب سے اچھا کالج سمجھا جاتا تھا۔ یہاں کی لڑکیاں خاصی تیز، طرار، ذہین مشہور تھیں، لیکن تیزی اور ذہانت کسی خاص کالج کی اجارہ داری نہیں تھی، اچھی اور تیز لڑکیاں دوسرے کالجوں میں بھی تھیں اور ان کی ذہانت امتحانات کے نتائج میں ظاہر ہوتی تھی۔ آئی ٹی کالج کی لڑکیاں یونیورسٹی سے قربت کی وجہ سے ادھر بھی آنکلتی تھیں، بالخصوص کیلاش ہوسٹل میں تو ان کا آنا جانا برابر ہوتا رہتا تھا۔ دوسرے کالج کی لڑکیوں سے بھی ان کی دوستی تھی۔ اور وہ سیاسی یا عام ثقافتی دلچسپیوں میں شریک ہو جایا کرتی تھیں۔ کیلاش ہوسٹل میں تو کبھی کبھی مختصر اور محدود مشاعرے بھی ہو جایا کرتے تھے۔ ہوسٹل میں لڑکے بھی کبھی کبھی چلے جاتے۔ یونین کے الکشن کے دنوں میں تو ایسا ہونا تعجب خیز نہیں تھا۔ مختصر یہ کہ طلبا اور طالبات کے درمیان وہ نفسیاتی دیواریں دھیرے دھیرے ٹوٹ کر گرنے لگی تھیں جو چھوٹے شہروں میں آج بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ یونیورسٹی میں آئے دن سیاسی ہنگامے یا ثقافتی پروگرام مثلاً مشاعرے، کوی سمیلن، سیاسی مفکرین اور سیاست دانوں کی تقریریں ہوتی رہتی تھیں اور ان میں لڑکیوں کی اچھی خاصی تعداد شرکت کرتی تھی۔ سیاسی جلسوں میں بھی چند لڑکیاں

شامل ہوتیں اور آگے آگے رہتیں۔

لڑکیوں کی باتوں نے کچھ طول پکڑ لیا۔ لطیف حکایت دراز تر ہو گئی لیکن ابھی بہت کچھ کہنا باقی ہے جس کے بغیر اس دور کی یونیورسٹی کی زندگی کی ایک جیتی جاگتی تصویر میں رنگ نہیں بھرا جا سکتا۔ تھوڑی دیر رک کے ذرا ڈے اسکالروں کی باتیں کر لی جائے جو ہوسٹلوں کے باہر رہتے تھے اور شہر کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے تھے۔ میں خود بھی "ڈے" اسکالر یعنی ہوسٹل کے باہر مقیم طالب علم تھا پرانے شہر میں سٹی اسٹیشن کے قریب کمرہ، پھر فلیٹ، پھر مکان کرائے پر لیتا رہا۔ میرے دو ماموں زاد بھائی سید ابو جعفر اور سید خورشید احمد (مدیر نیا دور) اور دو چھوٹے بھائی سید علی بنیاد اور سید علی اعتماد ساتھ رہتے تھے۔ یہ احساس برابر دل میں نشتر چبھوتا رہتا ہے کہ اب ان ساتھ رہنے والے چاروں بھائیوں نے ہمیشہ کے لیے ساتھ چھوڑ دیا صرف ان کی وہ یادیں رہ گئی ہیں جو اکثر و بیشتر پلکوں کو بھگوتی رہتی ہیں۔ میرے حقیقی بھائی تو دونوں ہی مجھ سے عمر میں چھوٹے تھے اور چونکہ ہم سب بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے ہم نے ساتھ ساتھ بہت تکلیفیں جھیلی تھیں اور ہمیشہ ایک دوسرے کے شریک و سہیم رہے تھے۔ آج اس ضعیفی میں وہ میرے قوت بازو ہوتے اور دکھ سکھ بانٹتے۔ لیکن وہ بھی بیچارے مجبور تھے۔ رضاً بقضائہٖ و تسلیماً لامرہٖ!

ہاں تو ہم لوگ اکثر رہائش گاہ بدلتے رہتے۔ آج کل کا سا حال نہیں تھا۔ پہلے چودھری کی گڑھیا، پھر آغا میر کی ڈیوڑھی، پھر گولہ گنج پھر سٹی اسٹیشن کے سامنے حامد پارک میں قیام رہا۔ اُس دور میں کرائے کے مکان آسانی سے مل جایا کرتے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف دو چار تختیاں "مکان برائے کرایہ خالی ہے" کا اشتہار کرتی رہتی تھیں۔ مکان بدلنے سے پہلے ہم لوگ دو چار مکان دیکھ کر کرایہ وغیرہ طے کرتے۔ پرانے لکھنؤ میں دس پندرہ روپے تک خاصا مکان مل جاتا تھا۔ کچھ دنوں بعد خورشید بھائی اور ابو جعفر بھائی ہیوٹ ہوسٹل میں منتقل ہو گئے اور ہم تینوں بھائی کرائے کے نئے مکان میں منتقل ہو گئے۔ ایک باورچی ملازم رکھ لیا۔ کچھ دنوں بعد ہمارے عزیز اور موجودہ دور کے مشہور ترقی پسند نقاد ممتاز حسین بھی ہماری طرف آنکلے اور پھر ہم نے انھیں مہمان بنا لیا اور انھیں کہیں اور نہیں جانے دیا۔ انھوں نے تعلقہ دار کالج میں ملازمت کر لی تھی اور مکان کی تلاش میں تھے۔

ہمارے ہر مکان سے یونیورسٹی کا فاصلہ تین میل سے زیادہ ہی ہوگا۔

کم نہیں۔ اس وقت شہر میں بسیں نہیں چلتی تھیں۔ بسیں تھیں لیکن صرف مضافات تک جاتی تھیں، مثلاً سیتاپور، محمود آباد، کرسی وغیرہ۔ ٹیکسیاں معدوم تھیں، کاریں چند تھیں لیکن تعلقہ داروں یا لکھ پتیوں کے یہاں تانگے اور یکے (تلفظ "اِکّے") کی سواریاں عام تھیں۔ بہت سے طالب علم سائیکلوں پر آتے جاتے تھے۔ اس جاگیردارانہ ماحول میں یکّے کی سواری کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ لیکن عام طالب علم تانگہ، یکہ یا سائیکل کی سواریوں ہی پر قناعت کرنے کے لیے مجبور تھا اور اسی میں مسرور تھا۔ میرے پاس بھی ایک پرانی سی سائیکل تھی جو برسوں بعد مرمت کرا کے اور پرزے بدلوا کے قابل استعمال بنائی گئی تھی۔ میری شاعرانہ بے توجہیوں کے باعث اس کا حال بُرا ہی رہتا۔ کبھی گھنٹی نہیں تو کبھی بریک ندارد، کبھی مڈگارڈ غائب تو کبھی چین کور۔ شام کے بعد اگلے پہیے کے بالائی حصہ میں ایک لیمپ لگا کے چلنا پڑتا تھا جس میں مٹی کا تیل جلتا تھا۔ اگر یہ نہ ہو تو چالان ہو جاتا تھا۔ بعض نفاست پسند بیٹری سے چلنے والا لیمپ لگا لیتے تھے۔ لیکن ان کی حیثیت استثنائی تھی۔ جب میری موسموں کی ماری سائیکل کی حالت سقیم ہوتی، اور ایسا اکثر ہوتا تو میں تانگے سے یونیورسٹی جانے لگتا۔ تانگے والوں سے خاصے مراسم ہو گئے تھے۔ کیونکہ اس زمانے میں کرائے کم ہونے کے باوجود، صرف کھاتے پیتے لوگ ہی علی العموم تانگے پر چلتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ جیب میں پیسے کم ہوتے یا بالکل نہ ہوتے تو ایک خاص تانگے والے کو نوازتا تھا۔ نام اب بھول رہا ہوں اُن سے مراسم اتنے بڑھ گئے تھے کہ کرائے کا حساب ماہانہ ہونے لگا تھا۔ یہ صاحب گھوڑ دوڑ کے شائقین میں تھے، سٹی اسٹیشن، وزیر گنج، گولہ گنج، ڈیوڑھی آغا میر کے آس پاس نوابوں کی خاصی آبادی تھی اور یہ حضرات اسٹیشن کے سامنے حامد پارک والی دکانوں میں ایک ایرانی چائے خانے میں بیٹھ کر گھوڑوں کی باتیں کرتے اور بازیاں لگاتے تھے، انھیں میں ہمارے تانگے والے بھی تھے۔ ہمارے معزز تانگے والے بھی گھوڑ دوڑ (ریس) کے بڑے شوقین اور بٹیر بازی کے رسیا تھے غالباً نوابوں کے کسی لُٹے ہوئے خاندان کے متوسلین میں تھے۔ میرے بار بار احتجاج کرنے کے باوجود مجھے ہمیشہ "نواب صاحب" کہہ کر مخاطب کرتے اور فرشی سلام سے نوازتے تھے۔ راستے بھر نوابوں اور رئیسوں

دونوں کی باتیں کرتے ۔ دل پھینک بھی واقع ہوئے تھے ۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ کرایہ نقد لینے پر اصرار نہ تھا ۔ ان تمام خوبیوں کی وجہ سے سائیکل میں ذرا بھی نقص ہوتا تو میں تانگے پر یونیورسٹی چلا جاتا ۔ نتیجہ ظاہر تھا ۔ تانگے کا ماہانہ بل خاصا بھاری بھر کم ہو جاتا ۔ گھر سے جو بندھی ہوئی رقم آتی تھی اُس میں بجٹ کو متوازن رکھنا مشکل ہوتا تب بجٹ بڑھانے کے لیے لکھنا پڑتا اور "قہر درویش برجانِ درویش" والے انداز میں منظوری بھی مل جاتی !

اُدھار کا سلسلہ یونیورسٹی رسٹوراں میں بھی چلتا تھا ۔ رسٹوراں کے کشمیری مالک بقایا صاحب تھے اور جیسا نام ویسا کام ! ان کے تعلقات سیاسی کارکن قسم کے طلبہ سے کچھ زیادہ ہی تھے ۔ طلبہ کی سیاست میں حصہ لینے والوں کا خاص مرکز یہی رسٹوراں تھا اور اِن کی بدولت بقایا صاحب کی آمدنی خاصی بڑھ گئی تھی ۔ یہ سب ماہانہ حساب رکھتے تھے ۔ یہ بھی ایک ریاست کی شان تھی کہ پیسے ہوں یا نہ ہوں، دوستوں کی خاطر تواضع ہوتی ۔ کشمیر اور پنجاب وغیرہ سے جو طلبہ آتے وہ عام طور سے اچھے گھرانوں کے افراد ہوتے ان کو اچھی خاصی جیبی رقم (پاکٹ منی) ملتی تھی اور وہ خوب خرچ بھی کرتے ۔ بعض تو حضرت گنج کے ہوٹلوں میں شراب نوشی بھی کر لیا کرتے تھے کہ یہ تہذیب جدید کی بھی نشانی سمجھی جاتی تھی اور ریاست کی بھی ۔ جملۂ معترضہ کے طور پر یہ بھی کہہ دینے کو جی چاہتا ہے کہ مطعون واجد علی شاہی ریاستوں میں کئی راجہ نواب ایسے بھی تھے جو کسی عیاشی کے قریب نہیں جاتے تھے ۔ ان میں محمود آباد، پیرپور، سلیم پور کی ریاستیں نمایاں تھیں !

ہم جیسے متوسط طبقے کے طالب علموں کا حال یہ تھا کہ جیب میں پیسے ہوں یا نہ ہوں، بقایا صاحب کے طریق کار کی بدولت، دوست احباب اور سیاسی رفقائے کار کی مدارات ہوتی رہتی تھی ۔ ایک کی جگہ چار خرچ ہوتے تھے ۔ مَیں اس زمانے میں سگریٹ بھی بہت پیتا تھا ۔ رسٹوراں کے سامنے ہی سگریٹ والے کی دوکان تھی اور بغل میں پھلوں کی دوکان تھی، ہر جگہ حساب چلتا تھا، کیونکہ قرض جاگیرداروں کی ایک شناخت بھی تھا ! گھر والے میری فضول خرچیوں سے عاجز تھے ۔ لیکن خدا بخشے والدہ مرحومہ کو کہ ان کا دامن شفقت و کرم میری ساری کوتاہیوں کی پردہ پوشی کر لیا کرتا تھا ۔ میں کتابوں کے نام پر پیسے منگوا لیتا مگر کتاب نہ خریدتا اور ماہانہ بجٹ کے اُتار چڑھاؤ سے نپٹتا رہتا، فیس اور جرمانے کے نام پر مزید رقم کی فرمائش کرتا، دوا علاج کے بہانے سے بھی پیسے منگوا لیتا ۔ مشاعروں سے اور جب ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن کھل گیا تو وہاں کے پروگراموں سے بھی کچھ پیسے ملنے لگے ۔ لیکن اخراجات کی ایک نئی شکل کافی ہاؤس کی شکل میں اُبھر آئی تھی ۔ غرض اخراجات بڑھتے جاتے اور جو کچھ بھی ملتا وہ انھیں دائروں میں خرچ ہو جاتا تھا ۔

لکھنؤ کافی ہاؤس خاصے کی چیز تھا ۔ یہاں بڑے بڑے اخبار نویس جیسے راما راؤ، چلاپتی راؤ، ایس، این گھوش، بڑے بڑے سیاستداں جیسے اچاریہ نریندر دیو، رام منوہر لوہیا، کیشو دیو مالویہ، ترلوکی سنگھ، پی سی جوشی، سجاد ظہیر آیا کرتے ۔ دانشوروں میں احمد علی، آل احمد سرور، ڈی، پی مکرجی اور احتشام حسین، خبر نگاروں میں امین سلونوی، انصار ہروانی، جوالا سنگھ، بھٹا چاریہ وغیرہ اور طالب علموں کی سیاست میں حصہ لینے والوں میں سبطِ حسن، ڈی، پی، ور (درگا پرساد ور) کاشی ناتھ بامزئی، بلرام سنگھ، صدیق احمد صدیقی، وانچو جگدیش و کنت، سید محمد جعفر، راجہ بخش، شفیق نقوی، نریش تیواری، انور جمال قدوائی، خوجہ جمیل الدین اور بہت سے نام ہیں سب جمع ہو جاتے تھے ۔ یہ وہی زمانہ ہے جب علی سردار جعفری، مجاز (اسرار الحق ردولوی) اور قاضی جلیل عباسی اپنی ترقی پسندی کی بدولت علی گڑھ سے نکالے گئے اور ہماری یونیورسٹی میں پناہ گزیں ہوئے ۔ یہ لوگ بھی آ جاتے ۔ سلام مچھلی شہری بھی شامل ہو جاتے ۔ اتنے شاعر جمع ہوں اور شعر خوانی کا دَور نہ چلے یہ ناممکن تھا، غرض وہاں اکثر و بیشتر چھوٹا موٹا مشاعرہ ہو جاتا ۔ ہندی کے مشہور شاعر گرجا کمار ماتھر خاص دوستوں میں تھے وہ بھی آ جاتے تو ملے جلے مشاعرے اور کوی سمیلن کا سماں بندھ جاتا ۔ بیچ بیچ میں سیاسی حالات پر تبصرے اور نظریاتی بحثیں بھی چھڑ جاتیں ۔ انجمن در انجمن کی فضا ہوتی، لیکن شور و غل نہیں ۔ دھیمے لہجوں میں گفتگو ہوتی اور اسی انداز سے شعر بھی سُنائے جاتے ۔ یہ لکھنوی تہذیب کا کرشمہ تھا ۔ اس تہذیب میں شور و غل کو ناپسند کرتے تھے ۔ اس کی جگہ شرک تھی یا سیاسی اجتماعات !

میرے اور میری طرح کے دوسرے دوستوں کے اخراجات کی
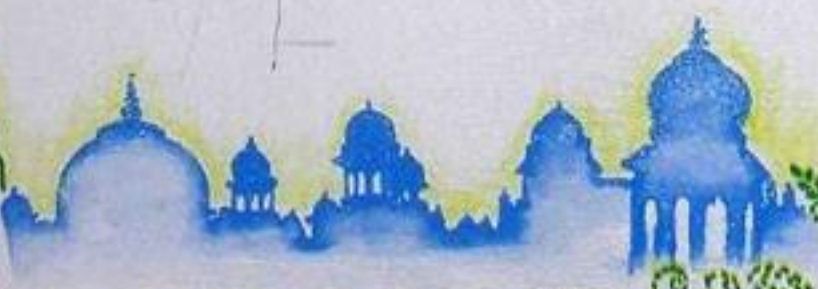
زیادتی کا سبب ثقافت و سیاست سے اس طرح کی دلچسپیاں کبھی تھیں۔ اسٹوڈنٹس فیڈریشن، کانگریس، سوشلسٹ پارٹی (جس میں کمیونسٹ بھی شامل تھے کیونکہ ۱۹۳۹ء تک سی۔پی۔آئی شجر ممنوعہ تھی)، انجمن ترقی پسند مصنفین، کالجوں اور یونیورسٹی کی یونینیں۔ سبھی کے نمائندے جمع ہوتے، چائے، کافی، بلکہ دو سے اور سینڈوچ تک میں ہمسفر اور ہم قلم بھی شریک ہوجاتے۔ میہمانی اور میزبانی کا سلسلہ روز کا تھا اور ہم سب کے یہاں حسابِ دوستاں در دل والا معاملہ تھا۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے دوست اور عزیز تھے اور بہت سے کام! مختصر یہ کہ اخراجات کی کثرت سے ہم اکثر پریشان رہتے ہیں اس کا قطعی حل اُس زمانے میں کیا آج تک ڈھونڈ نہیں پایا ہوں، لیکن شکر ہے کہ قدرت نے ہر حال میں مست رہنے والی طبیعت عطا کی ہے۔ اور چاہیئے بھی کیا!

لباس کے معاملے میں یونیورسٹی میں کافی آزادی تھی۔ زیادہ تر لڑکے سوٹ پہنتے تھے لیکن شیروانی اور تنگ موری کے پائجامے کا رواج بھی خاصا تھا۔ کچھ لوگ جواہر بنڈی، کرتے اور پاجامے بھی استعمال کرتے تھے۔ میں کھدر ہی کے کپڑے بنواتا تھا کیونکہ یہ سیاسی کارکنوں اور آزادی پسندوں کی نشانی تھی اور میں بھی اپنے کو اسی گروہ میں شامل سمجھنے لگا تھا۔ شیروانی شرفاء کا پہناوا تھی۔ ہندو مسلم، شہری دیہاتی ذات پات کی تفریق نہیں تھی، اسکے پرستاروں میں وکیل، بیرسٹر، تعلقہ دار، جاگیردار، مولوی، پنڈت سب تھے۔ انگرکھو کا رواج کم ہو چلا تھا اور یونیورسٹی میں تو اس کا سوال ہی نہیں تھا۔ یہی حال دھوتی کا تھا۔

یونیورسٹی کے طلبہ کے بہت سے نام آگئے۔ لیکن طالبات کی بات بیچ ہی میں رہ گئی تھی۔ یونیورسٹی کی طالبات نے بیداری نسواں میں بڑا حصہ لیا ہے اور اس کا سرسری ذکر بھی نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ طالبات میں منہاج خواہران، مسز سروپ رانی بخشی، تزئین حبیب اللہ، اور رتنا سدھانت وغیرہ کا رجحان سیاست کی طرف شروع ہی سے تھا۔ منہاج خواہران، میں سلطانہ نے (جو اب علی سردار جعفری کی شریک حیات ہیں) طلبہ کی تحریک میں سرگرم حصہ لیا اور یہی حال تزئین حبیب اللہ کا بھی تھا۔ فرق یہ تھا کہ سلطانہ منہاج شروع سے قوم پرور اور ترقی پسند خیالات کی تھیں لیکن تزئین بعد میں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے وابستہ ہو کر عام دھارے سے کٹ گئیں۔ طالبات کو طلبا کی تحریک سے قریب تر لانے کے لیے میری ہی تحریک پر کل ہند طالبات کانفرنس لکھنؤ میں بلائی گئی۔ سلطانہ کو اس میں صدر مجلس استقبالیہ بنایا گیا۔ بعد میں سلطانہ سی۔پی۔آئی سے وابستہ ہو گئیں۔ انھوں نے دلّی اسٹوڈنٹس کانفرنس میں دوسری طالبات کے ساتھ شرکت کی اور لکھنؤ یونیورسٹی کا نام بلند کیا۔ آمنہ اور خدیجہ اپنی بڑی بہن سے مختلف تھیں۔ ان کی دلچسپیاں ثقافتی زیادہ اور سیاسی کم تھیں۔ ان تینوں بہنوں کا ایک ساتھ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا اور حُسنِ ظاہری کے ساتھ حُسنِ باطنی سے آراستہ ہونا ان کے والد منہاج الدین صاحب مرحوم کی مآل اندیشی، وسیع النظری اور حُسنِ تربیت کا نتیجہ تھا۔

تزئین حبیب اللہ فلسفہ کی طالبہ ہونے کی وجہ سے میری ہم جماعت تھیں۔ شیخ حبیب اللہ کی دختر تھیں۔ شیخ صاحب تعلقہ دار تھے، ڈپٹی کلکٹری بھی کی تھی اور ریاست محمود آباد کی مدار المہامی بھی۔ بعد میں لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ہوئے۔ بیگم حبیب اللہ بھی اوسط درجہ کی تعلیم یافتہ تھیں۔ سیاست میں حصہ لیتی تھیں، لیکن ان کا تعلق مسلم لیگ سے تھا۔ فلسفہ کی جماعت میں تھوڑے سے طالب علم ہوتے تھے۔ جن میں طالبات تو اور بھی کم ہوتی تھیں۔ اس مختصر سی کلاس میں اپنی ذہانت اور بچپنی طبیعت کے باعث تزئین نمایاں تھیں۔ ہم جماعت ہونے کی وجہ سے انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ کلاس کے اندر اور کلاس کے باہر بھی ان سے باتیں ہوتیں۔ بحثیں ہوتیں ان کی ذکاوت سے متاثر نہ ہونا ناممکن تھا۔ ترقی پسندانہ خیالات بھی رکھتی تھیں لیکن میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ اُن کی طبیعت میں ٹھہراؤ نہیں ہے۔ بہت جلد اپنی ماں کے سیاسی دباؤ میں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں شامل ہوگئیں اور ناگپور کے اجلاس کی صدارت بھی کر آئیں۔ اس طرح یہ سلطانہ سے مختلف مزاج کی مالک تھیں اور بہت جلد ترقی پسندی سے ہٹ کر لیگی سیاست میں الجھ گئیں۔ پھر وہ بیگم تزئین فریدی ہوگئیں۔ (ہماری یونیورسٹی میں لیگ کا زور نہیں تھا، بس علی رضا مرحوم اس کی نمائندگی کرتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد علی رضا مرحوم کے خیالات میں تبدیلی آگئی۔) تزئین کے شوہر نے چند دن لکھنؤ یونیورسٹی میں فارسی بھی پڑھائی تھی لیکن

جلد ہی انھیں ایک اور اچھی ملازمت مل گئی اور اُس علاقے میں تعینات ہو گئے، جو بعد میں پاکستان بننے والا تھا۔ تزئین بھی وہیں پہنچ گئیں۔ وہاں بھی نچلی نہ بیٹھیں اور اَپوا (آل پاکستان ویمنز آرگنائزیشن) کی صدر بن گئیں۔ بعد میں سُنا کہ سندھ حکومت میں وزارت بھی مل گئی۔ ان کے بھائی جنرل حبیب اللہ ہندوستان ہی میں رہے۔ ان کی بیگم حامدہ حبیب اللہ کانگریس کی سرگرم رُکن ہیں۔ وزیر بھی رہ چکی ہیں۔ انھیں کے دورِ وزارت میں اتر پردیش اردو اکیڈمی قائم ہوئی۔ ان کے صاحبزادے وجاہت حبیب اللہ آئی اے ایس افسر ہیں اور تزئین حبیب اللہ کی صاحبزادی ان کو منسوب ہیں۔ صورت شکل میں تزئین سے بہت مشابہ ہیں۔ پہلی بار ٹرین کے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں ملاقات ہوئی تو میں چونک پڑا کہ تزئین کہاں سے آگئیں۔ تعارف پر معلوم ہوا کہ انھیں کی صاحبزادی ہیں۔

ان فریدی صاحب کے بڑے بھائی ڈاکٹر فریدی شہر کے ممتاز ماہر امراض سینہ تھے۔ سوشلسٹ خیالات رکھتے تھے لیکن اچھے نماز گزار مسلمان تھے۔ آخر دم تک سوشلسٹ بھی رہے اور صوم وصلوٰۃ کے پابند بھی۔ پاکستان بن جانے کے بعد مسلمان سیاسی اعتبار سے پراگندہ خیال ہو گئے تھے۔ ان کو صحیح رہنمائی فراہم کرنے کے خیال سے جو مجلسِ مشاورت بنی، اس میں بھی عملی حصہ لیا۔ ان کو عزیزوں، یار دوستوں نے بہت پاکستان کھینچنا چاہا لیکن یہ ہندوستان کے باہر جانے پر کسی طرح تیار نہیں ہوئے۔ ع وفاداری بہ شرطِ استواری اصل ایماں ہے! بےحد کامیاب ڈاکٹر تھے اور دستِ شفا کے لیے مشہور تھے۔ بہت سے مریضوں کا مفت علاج کر دیا کرتے تھے۔ میرے مستقل معالج تھے۔ یونیورسٹی کی سیاست سے بھی انھیں گہری دلچسپی تھی۔ وہاں چندر بھان گپتا کی مسلسل مخالفت کرتے رہے۔ یہ مخالفت میڈیکل کالج کے معاملات سے شروع ہوئی اور پھر سیاست میں اس نے بڑے بڑے رنگ دکھائے۔ گپتا جی دو بار وزیرِ اعلیٰ رہ چکے تھے لیکن ایک بار فریدی صاحب نے الکشن میں ان کی مخالفت پر کمر باندھی تو پھر ان کے سیاسی حریف ترلوکی سنگھ کو حمایت پر آمادہ کیا اور اپنی ہر دلعزیزی کی بنا پر گپتا جی کو ہرا کے ہی دم لیا۔ اتفاق کی بات کہ ایک مرتبہ فریدی اور گپتا ایک ہی کمپارٹمنٹ میں دلّی جا رہے تھے۔ راستے میں گپتا پر دل کا شدید دورہ پڑا۔ فریدی بھی دل کے مریض تھے اس لیے دوائیں اور انجکشن وغیرہ ساتھ رکھتے تھے۔ فوراً علاج کیا اور اس قابل ہوئے کہ دلّی تک بخیر پہنچ جائیں۔ اسٹیشن ٹیلیفون کر کے کار کا انتظام کر لیا اور باقاعدہ اسپتال پہنچا کے ہی دم لیا۔ کیسی دشمنیاں ایک آن میں دوستیوں میں بدل جاتی ہیں اور ع

عدو شود سببِ خیر گر خدا خواہد

طالبات ہی میں ٹینس کے مشہور کھلاڑی باب کی صاحبزادی ہیزل باب بھی تھیں، بےحد خوش طبع اور خوش اخلاق۔ انھوں نے ایک دن علی سردار جعفری کو نئے سال کی مبارک باد دی تو ان کی وہ نظم وجود میں آئی:

یہ کس نے فون پہ دی سالِ نو کی تہنیت مجھ کو
تصوّر رقص کرتا ہے، تخیّل گنگناتا ہے

سیاست سے دلچسپی لینے والوں میں نشاط حسن اور رتنا سدھانت کا بھی نام لیا جا سکتا ہے لیکن ان کی دلچسپی سطحی تھی ہاں طلبہ کانفرنسوں کے انعقاد میں ان سے اکثر مدد ملتی تھی۔ مسز وجے لکشمی پنڈت کی صاحبزادیاں یونیورسٹی میں تو نہیں پڑھتی تھیں لیکن لکھنؤ میں موجود ہونے کی وجہ سے نین تارا اور چندر لیکھا طلبہ کی سیاست میں بھی کبھی کبھی حصہ لیا کرتی تھیں۔ انھیں کی طرح آنند نرائن ملّا کی صاحبزادی چترا مُلّا کو بھی دلچسپی تھی۔ انھیں ہندوستانی کلاسیکی رقص سے دلچسپی تھی۔ ایک بار ہماری استدعا پر انھوں نے کانفرنس کے موقع پر اپنے رقص کا ایک مظاہرہ بھی کیا تھا۔

یہ فہرست کافی طویل ہو سکتی ہے لیکن فہرست مرتب کرنا مقصود نہیں۔ اتنے ہی تذکرے سے یہ بات سامنے آ جاتی ہے کہ بیداری نسواں کے سلسلے میں یونیورسٹی کے خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ اور ہماری طالبات نے بھی تحریکِ آزادی اور اس کے متعلق خدمات میں عملی دلچسپی لی ہے۔ اُس زمانے میں ترقی کے ہر شعبے میں ہماری یونیورسٹی پیش پیش تھی اور صوبے ہی میں نہیں بلکہ دُور دُور تک اس کی قیادت و سیادت تسلیم کی جاتی تھی۔

طلبہ کی تحریک کے سلسلے میں صرف جلسے جلوس الکشن اور ہنگامے

ہی نہیں تھے بلکہ طلبہ برابر سختیاں جھیلتے تھے۔ انور جمال قدوائی، شفیق نقوی اور بلرام سنگھ کو دو سال کے لیے یونیورسٹی سے خارج کر دیا گیا تھا۔ اسی طرح میرے چھوٹے بھائی سید علی اعتماد مرحوم کو جوبلی کالج سے برطانوی جھنڈا اُتار کر قومی پرچم لہرانے کے جرم میں دو سال کے اخراج کی سزا ملی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ آزادی کی تحریک میں حصہ لینے والوں نے بعد میں انعام بھی پایا۔ یہ بہت ہی غلط تصور ہے یونیورسٹی کے طلبہ میں کسی کو کیا ملا؟ علی جواد زیدی، علی سردار جعفری، سید محمد جعفر، قاضی جلیل عباسی، رامیشور پرشاد مصر، بلرام سنگھ تو جیل بھی گئے لیکن انھوں نے حکومت سے اس کا کوئی بدلہ نہ چاہا خود کنواں کھود تو پانی پیا۔ اسی یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ سیاست دانوں میں سجاد ظہیر، پی، سی، جوشی بھی تھے۔ اگر جگدیش چندر، کنٹنٹ صدر لیجس لیٹو کونسل ہو بھی گئے تو کیا ہوا۔؟ ہاں یہ مقام فخر ہے کہ یونیورسٹی نے ایسے نوجوانوں کی ترتیب کی جو ملک کے لیے باعثِ افتخار ہوئے۔ انھیں میں موجودہ صدر شنکر دیال شرما بھی ہیں، جو میرے ہی زمانے میں زیرِ تعلیم تھے۔ آزادی اور ترقی پسندی کی جب بھی کوئی تاریخ لکھی جائے گی تو یونیورسٹی کے کارناموں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ باقی تفصیلات حسب موقع دوسرے ابواب میں سامنے آئیں گی۔ یہاں اتنے ہی پر اکتفا کرنا مناسب ہوگا۔

□□

حواشی :

۱؎ گنگا پرشاد ورما، جن کی یادگار یہ ہال تھا، کانگریس کے بنیادی ممبروں میں تھے اور اردو کے صحافی بھی تھے۔

۲؎ واجد علی شاہ کا تخلص اختر تھا اس مناسبت سے اسے اختر نگر بھی کہا گیا ہے۔ ۳؎ اسے کرامت حسین نے قائم کیا تھا۔ مسلمان لڑکیوں کے لیے اعلیٰ تعلیم کی ضرورت کا احساس انھوں نے دلایا۔ یہاں پردے کا بھی اہتمام تھا۔ خصوصیت سے پردہ دار اور متوسط طبقے کی لڑکیاں یہیں تعلیم پاتی تھیں۔ اب اس کی ایک شاخ پرانے لکھنؤ میں نخاس کے قریب بھی کھل گئی ہے۔ شیعہ کالج میں بھی بچیوں کے لئے صبح کو علیحدہ تعلیم کا انتظام ہو گیا ہے۔ ۴؎ میں اس اردو لفظ کو کسی قیمت پر بھی کسی اور لفظ سے بدلنے یا ترک کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ ۵؎ "شرفا" سے خاص طبقہ نہیں بلکہ عام تہذیب یافتہ اور تعلیم یافتہ افراد مراد ہیں جو روایت دوست بھی تھے۔

لکھنؤ: کچھ یادیں کچھ باتیں .... صفحہ ۲۸ کا بقیہ

مشاعرہ شروع ہو چکا تھا۔ اتفاق سے جب جوش صاحب پہنچے تو شکیل بدایونی غزل سنا رہے تھے اور داد سے ہال کے در و دیوار گونج رہے تھے۔ اس پر وہ بہت بدحظ ہوئے اور کہنے لگے سرور صاحب! آپ نے مجھے کہاں لا کر پھنسا دیا۔ شکیل صاحب کے بعد ساغر نے اپنا کلام سنایا واقعی تھے مگر شکیل کے بعد کوئی جما نہیں۔ جب آخر میں میں نے جوش صاحب کو زحمتِ کلام دی تو فرمانے لگے۔ بیاض میں بھول آیا ہوں اور زبانی اس لئے کچھ نہیں سُنا سکتا کہ مجھے کچھ یاد ہی نہیں۔ میں نے ان کی کچھ مشہور رباعیاں یاد دلائیں۔ ایک رباعی یہ بھی تھی ؎

غنچے تیری بے بسی پہ دل ہلتا ہے — بس ایک تبسم کے لیے کھلتا ہے
غنچے نے کہا کہ اس چمن میں بابا — یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے

اسی طرح دو ایک رُباعیاں اور میں نے پڑھیں اور جوش نے دُہرا دیں۔ بہر حال مجمع میں بے لطفی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اچاریہ جی نے مجھ سے اشارہ کیا کہ اب تم زیادہ اصرار نہ کرو۔ تھوڑی دیر بعد جوش صاحب تشریف لے گئے۔ اب سوچتا ہوں تو شاید جو داد شکیل بدایونی کو مل رہی تھی وہ ان کو ناگوار ہوئی تھی اور ان کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔

جب میں لکھنؤ سے علی گڑھ آگیا تو ایک دفعہ دہلی جانا ہوا جہاں جوش کے اعزاز میں ایک نشست تھی۔ دہلی کے بعض ممتاز شعرا اور نخشب جارچوی بھی موجود تھے جہاں تک یاد پڑتا ہے شنکر پرشاد اور ولی شنکر کے علاوہ بسمل سعیدی، عرش ملسیانی، جگن ناتھ آزاد، ممتاز مرزا سبھی تھے کھانے کے بعد شعر و شاعری شروع ہوئی، ہم سب کے بعد جوش صاحب کی باری آئی۔ غالباً رات کے گیارہ بجے تھے۔ جب جوش صاحب نے سنانا شروع کیا تھا کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پڑھتے رہے۔ متعدد رُباعیاں اور کئی نظمیں سنائیں۔ آواز میں شروع سے آخر تک وہی طنطنہ جو ان کی پہچان تھا۔ نہ کھانسے نہ کھکھارے، نہ بیچ میں پانی پیا۔ ایک توانا لے میں آخر تک اپنا کلام سناتے رہے اور لوگ داد دیتے رہے۔

(باقی آئندہ)

غزل

وہ جو مست آنکھوں کو مل کر رہ گئے ‏ ‏ کیسے کیسے دور چل کر رہ گئے

آہ جن اشکوں کو پی جانا پڑا ‏ ‏ اُف جو دریا رُخ بدل کر رہ گئے

لغزشیں بے کیف، سجدے بے مزہ ‏ ‏ دل جو بدلا سب بدل کر رہ گئے

ہم تو بہکے عشق میں ناصح مگر ‏ ‏ ہائے رے وہ جو سنبھل کر رہ گئے

وقت کے ہاتھوں ہزاروں کارواں ‏ ‏ منزلیں اپنی بدل کر رہ گئے

شمع جل اُٹھی تو پروانے جلے ‏ ‏ بیشتر ہی کیوں نہ جل کر رہ گئے

مُسکرانے کے اِرادے اے خُمار!
بارہا اشکوں میں ڈھل کر رہ گئے

خُمار بارہ بنکوی
پیر بٹاون۔ بارہ بنکی

پروفیسر نور الحسن ہاشمی
قطب پور، ڈالی گنج، لکھنؤ

لکھنؤ: قصبے سے شہر ہونے تک

لکھنؤ گزیٹیر (مطبوعہ ۱۹۲۲ء) کے صفحہ ۱۴۲ پر مذکور ہے کہ لکھنؤ میں مسلمانوں کی آمد سے کچھ پہلے ٹیلے والی مسجد کے اِرد گرد برہمنوں اور کایستھوں کی مختصر نو آبادی تھی۔ کچھ عرصہ بعد قصبہ بجنور (ضلع لکھنؤ) کے شیخوں کا ایک قبیلہ وہاں آکر بس گیا تھا ان کے بعد رام نگر کے پٹھانوں کا ایک گروہ آکر یہاں اقامت پذیر ہو گیا تھا۔ یہ لوگ ٹیلے والی مسجد سے لے کر موجودہ گول دروازہ تک کے علاقے کو اپنی زمینداری میں شامل بتاتے تھے۔ اس کے جنوب مشرق میں شیخوں کی عملداری تھی جو موجودہ ریزیڈنسی تک پھیلی تھی۔ ان شیخوں کے کارناموں میں سے ایک اہم کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے اس مقام پر جو بعد میں مچھی بھون کہلایا ایک قلعہ بنوایا تھا جو اپنی مضبوطی کے باعث بہت مشہور ہو گیا تھا کہا جاتا ہے کہ اس قلعہ کا معمار خاص ایک ہندو لکھن نامی تھا اس لئے یہ قلعہ لکھن کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ شیخوں کا اثر اور اقتدار تو بڑھتا رہا ان کی آبادی بھی بڑھتی رہی لیکن اس چھوٹے سے قصبہ نے قلعہ لکھن سے لکھنؤ کی صورت کب اور کیونکر اختیار کر لی تواریخ کے صفحات سے اس پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ قیاسات سے البتہ کام لیا گیا ہے اور بہت سے قیاسات اس نام کے بارے میں اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا بھی ایک قیاس ان میں شامل کر لیا جائے شاید یہ ظن غالب مانا جا سکے میرا خیال یہ ہے کہ لفظ لکھن میں لفظ مئو جوڑ دیا گیا ہوگا اور اسی کا نام لکھن مئو پڑ گیا تھا۔ لفظ مئو کے ساتھ اکثر قصبوں کے نام رکھے جاتے تھے جن میں سے کئی اب بھی موجود ہیں مثلاً بالا مئو، گوپا مئو، مئو ناتھ بھنجن یا خالی لفظ مئو۔ لکھن مئو میں چونکہ نؔ اور مؔ کی دو متوازی آوازیں ساتھ میں تھیں کثرت استعمال سے مؔ کی آواز گر گئی یا حذف ہو گئی۔ صرف لکھنؤ رہ گیا۔ اس قیاس کو مانا جائے یا نہ مانا جائے میرا جو ظن غالب تھا تحریر کر دیا۔

مینا نگری

بڑی دقت یہ ہے کہ لکھنؤ کا نام پرانی تاریخی کتابوں میں لودھی دور حکومت میں تو کہیں کہیں مل جاتا ہے اس سے پہلے نہیں ملتا۔ بہر حال اسکا نام لکھنؤ تو چل پڑا تھا لیکن کچھ عرصے کے لئے مینا نگری بھی رہا ہے۔ وہ اس طرح کہ یہاں کے مشہور بزرگ شیخ محمد عرف شاہ مینا پندرھویں صدی عیسوی میں سکونت پذیر تھے۔ یہ حاجی شیخ قیام الدین کے مرید اور خلیفہ تھے۔ حاجی صاحب مذکور ۱۳۹۶ء میں لکھنؤ میں وارد ہوئے تھے۔ شاہ مینا کا لقب انھوں نے اپنے مرید خاص شیخ محمد کو عطا کیا تھا۔ شاہ مینا صاحب مذکور نے اپنے محلہ کا نام مینا نگر یا مینا نگری رکھا تھا جس کا اطلاق کچھ عرصے تک پورے قصبہ لکھنؤ پر بھی ہوتا رہا[۱]۔ ان کا مزار متصل میڈیکل کالج لکھنؤ آج تک مرجع خاص و عام ہے۔

اکبر بادشاہ

لکھنؤ کو ترقی دینے کے سلسلے میں اکبر بادشاہ کا نام بھی لیا جا سکتا ہے کہا جاتا ہے کہ اس کو (۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۵ء) لکھنؤ سے خاصی دلچسپی تھی۔ یہاں اس نے اس ٹکسال کو برقرار رکھا جو تانبے کے سکّے ڈھالنے کے لئے اس سے پیشتر شیر شاہ نے قائم کی تھی۔ اکبر نے چوک کے جنوبی علاقے میں چند محلے بھی آباد کیے تھے۔ یہاں برہمنوں کا وقار بڑھانے کے لئے اس فرقے کو ایک لاکھ روپیہ عطیہ بھی دیا تھا جس کے بعد یہ فرقہ باجپئی برہمن کہا جانے لگا تھا۔ ان کے نام سے ایک محلہ بھی آباد ہوا تھا جو اب معدوم ہو چکا ہے۔ اکبر کو یہ مقام شاید اس لئے بھی یاد رہا ہوگا کہ جب ۱۵۴۰ء میں ہمایوں بادشاہ جون پور میں شیر شاہ سے شکست کھا کر فرار ہوا تھا تو لکھنؤ سے بھی گزرا تھا اور

یہاں صرف چار گھنٹے قیام کیا تھا۔ ان چار گھنٹوں میں یہاں کے شیخوں نے اس کے لئے دس ہزار روپے نقد اور پچاس گھوڑے فراہم کردئے تھے۔

جہانگیر جو اپنی شہزادگی کے زمانے میں مرزا سلیم کہلاتا تھا ایک دفعہ یہاں آیا تھا۔ اور اس نے یہاں مرزا منڈی کے نام سے ایک منڈی قائم کی تھی جس کا کچھ حصّہ مچھّی بھون کے مغرب میں تھا۔

اکبر کے عہد کے آخری زمانے میں یہاں اودھ میں جواہر خاں نامی ایک صوبہ دار کو مقرر کیا گیا تھا اس کے نائب قاسم محمود بلگرامی نے یہاں چوک کے بائیں جانب محمود نگر اور شاہ گنج کے محلے آباد کیے تھے اور چوک کے جنوبی حصّہ میں اکبری دروازہ بنوایا تھا۔ جو آج بھی قائم ہے۔

نوابی دور

۱۷۲۰ء میں محمد شاہ بادشاہ سعادت خاں نیشاپوری کو برہان الملک کا خطاب دے کر پہلے آگرہ کا صوبیدار مقرر کیا، بعد ازاں ۱۷۳۲ء میں اودھ کا۔ (بحوالۂ گزیٹر لکھنؤ) اجودھیا اس کی راجدھانی تھی لیکن لکھنؤ میں بھی اکثر آکر رہتا تھا یہاں اس نے شیخوں سے دو محل (پنچ محلہ اور مبارک محل) کرایہ پر لئے تھے وہیں قیام کرتا تھا یہاں اس نے کئی کٹڑے بھی آباد کئے مثلاً چوک کے اردگرد کٹڑہ سید حسین خاں، کٹڑہ ابوتراب خاں، باغ مہانرائن اور سعادت گنج میں کٹڑہ خدایار خاں اور بزن بیگ خاں اور دولت گنج میں کٹڑہ محمد علی خاں اور سرائے معالی خاں وغیرہ۔ سعادت خاں نے دہلی میں ۱۷۳۹ء میں وفات پائی۔

سعادت خاں کے بعد اس کا بھتیجا اور داماد ابوالمنصور خاں مخاطب بہ صفدر جنگ اس کا جانشین ہوا یہ زیادہ تر دہلی میں ہی رہا۔ اپنی وفات (۱۷۵۴ء) سے کچھ پیشتر یہ اودھ میں مستقل طور سے رہنے کے لئے آگیا تھا۔ اجودھیا کے قریب فیض آباد شہر کی بنیاد ڈالی اور اسی کو اپنا مستقر بنایا۔ لکھنؤ میں اس نے شیخوں کے قلعہ کی جگہ پر دوسرا قلعہ بنوایا جو مچھّی بھون کہلایا۔ یہ علاقہ وہی ہے جہاں اب امام باڑہ آصف الدولہ اور میڈیکل کالج کے چند ہوسٹل کالج کے شمالی حصّہ میں واقع ہیں۔ ۱۷۵۴ء میں وفات پائی۔ اس کی میت دہلی لے جائی گئی اور وہیں تدفین ہوئی۔

صفدر جنگ کے بیٹے شجاع الدولہ نے اپنی سکونت فیض آباد ہی میں رکھی اور اسی شہر کی آرائش و زیبائش میں تاعمر مصروف رہا۔ لکھنؤ سے زیادہ سروکار نہ رکھا۔ نہ یہاں کی عمارتوں میں کوئی اضافہ کیا۔

۱۷۷۵ء میں شجاع الدولہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا آصف الدولہ صوبہ داری اودھ پر فائز ہوا۔ اس نے اسی سال فیض آباد کے بجائے لکھنؤ کو اپنا مستقر قرار دیا اور حقیقت یہ ہے کہ اسی نے ایک بڑے قصبہ کو ایک بڑے شہر کی صورت دے دی۔ اس کو اودھ کی راجدھانی بنایا اور بے شمار عمارتوں محلّوں اور باغوں سے بے حد آراستہ کر دیا۔ ان کی تفصیل کتب تواریخ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

بہر حال یہ اسی کا اور اس کے اخلاف کا بنایا اور آراستہ کیا ہوا لکھنؤ ہے جو آج نہ صرف سرکار یو۔ پی کا دارالحکومت ہے بلکہ ہندوستان کے تمام ممتاز شہروں میں اپنی خوبصورت عمارتوں اپنی مخصوص تہذیب، اپنی قومی یک جہتی اور اپنی فصاحتِ زبان کے لیئے ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔

حواشی

[۱] ملفوظات شاہ مینا کا ایک قلمی (فارسی) نسخہ مولفہ محی الدین بن حسین رضوی امیٹھوی مکتوبہ ۱۱۵۵ھ (از شیخ امان اللہ) لکھنؤ یونیورسٹی میں موجود ہے۔ یہ اواخر انیسویں صدی عیسوی میں مطبع مرقع عالم ہردوئی سے شائع ہوچکا ہے۔ ہاشمی

> "اہلِ لکھنؤ کی زبان اس قدر شائستہ اور شستہ و رُفتہ ہوگئی ہے کہ یہاں کے جُہلا دوسرے شہروں کے اکثر شعراء و فصحا سے زیادہ اچھی اُردو بولتے ہیں اور جو شائستگی اور تمیزداری ان سے ظاہر ہوجاتی ہے کسی اور مقام کے قابل اور ذی علم لوگوں سے بھی ظاہر نہیں ہوسکتی۔"
>
> گزشتہ لکھنؤ ص ۳۲۷
>
> از عبدالحلیم شرر

بادشاہِ اودھ
غازی الدّین حیدر
کے
عہدِ حکومت
کے
سکّے

تاجدارِ اودھ نصیرُ الدّین حیدر فوج کا معائنہ کرتے ہوئے
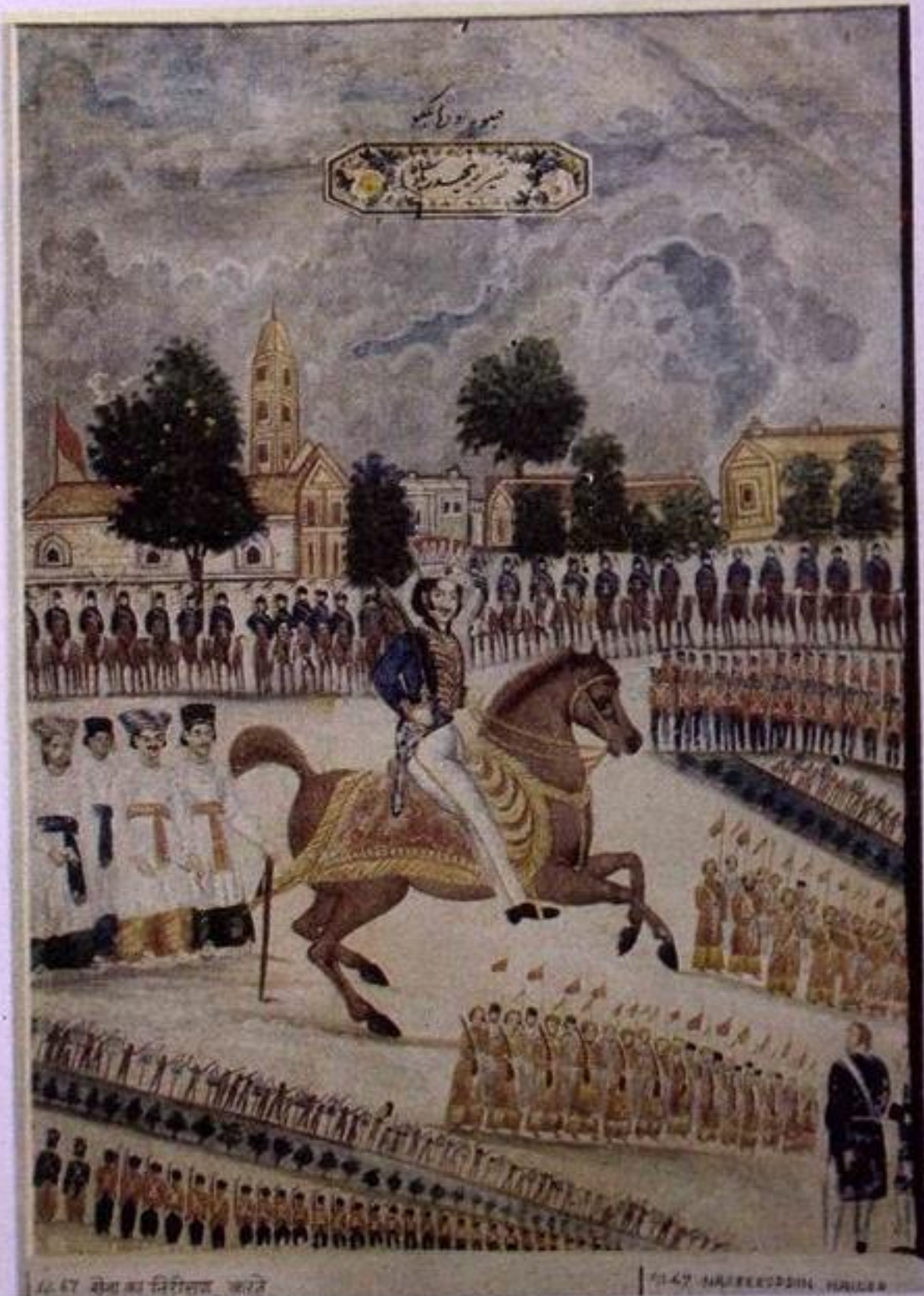
ستکھنڈہ
حسین آباد
لکھنؤ
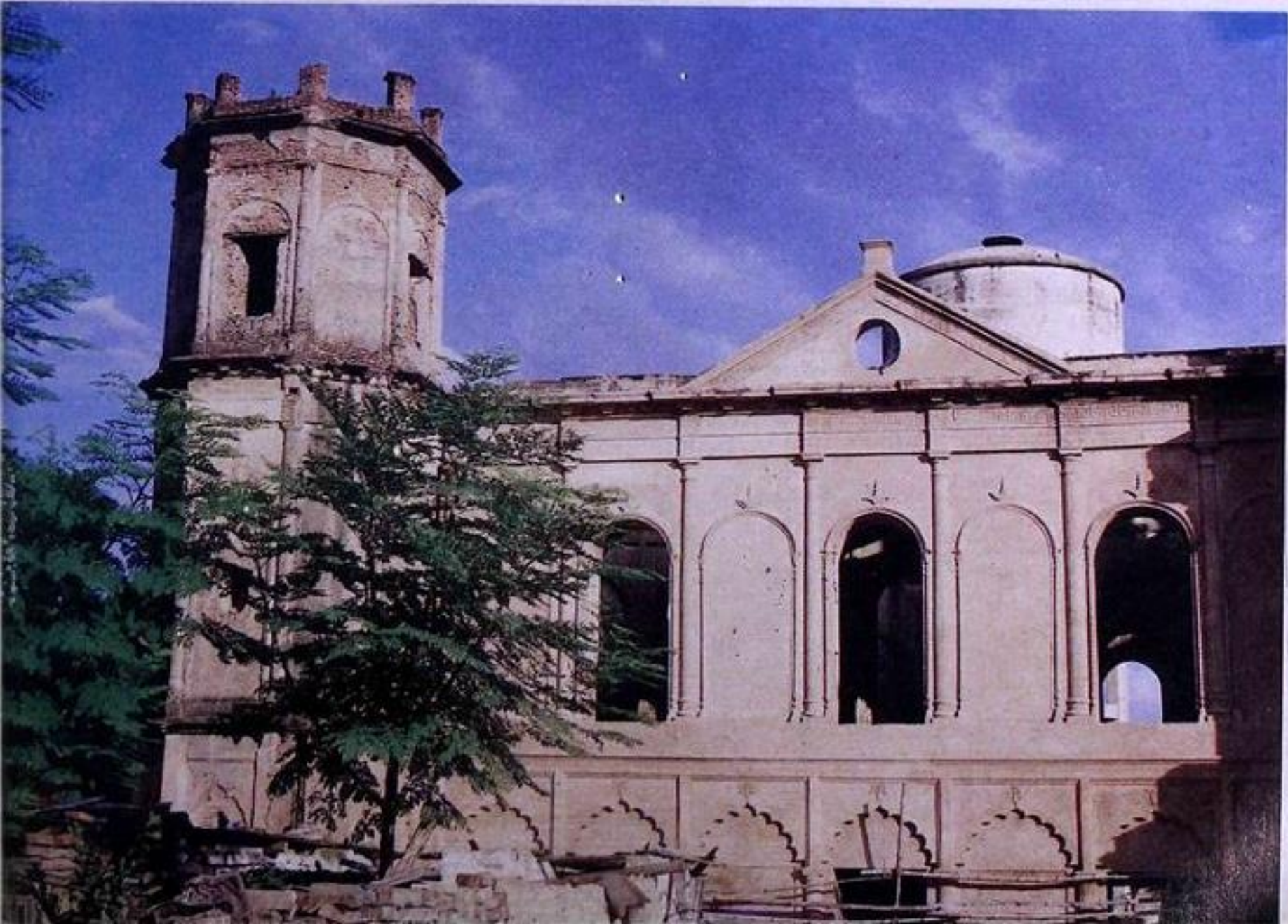
قلعہ
عالم باغ
لکھنؤ

شمس الرحمٰن فاروقی
۲۹۔ سی ہیسٹنگز روڈ۔ الٰہ آباد

داستان امیر حمزہ: بعض ابتدائی باتیں

لکھنؤ نے اردو ادب کو بہت کچھ دیا۔ اگرچہ اس شہر کی اداؤں میں ایک ادا یہ بھی ہے کہ یہ اپنے عاشقوں کو مار رکھتا ہے۔ یا گاڑ کر بھول جاتا ہے۔ لیکن اس کے چاہنے والے اپنی مدت حیات اسکے ناز اٹھانے ہی میں گذار دیتے ہیں۔ آتش و ناسخ، میر و مصحفی کتنے ہی ایسے ہیں جن کی لوح مزار کیا، مزار تک اب باقی نہیں۔ لیکن ان کے بارے میں اتنا تو معلوم ہے کہ یہ خاک لکھنؤ میں آسودہ ہیں (اگر "آسودہ" کا لفظ ایسوں کے لئے مناسب ہو۔) داستان امیر حمزہ (طویل) اور داستان امیر حمزہ (مختصر) کی تخلیق کرنے والوں کے بارے میں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ لکھنؤ میں دفن ہیں یا کہاں دفن ہیں؟ کسی قوم اور کسی تہذیب نے کم ہی اپنے محسنوں کے ساتھ وہ سلوک کیا ہوگا جو اہل لکھنؤ، اہل اردو اور اہل ہند نے داستان امیر حمزہ جیسی عظیم المرتبت کارگاہ نیرنگ کے صانعوں کے ساتھ کیا۔ اگر لکھنؤ کے ادبی کارناموں کی قیمت لگائی جائے تو انیس کے مرثیوں اور ناسخ کی غزلوں کے سوا غالباً کوئی بھی متن ایسا نہ ہوگا جسے داستان امیر حمزہ (طویل) کے مقابل رکھا جا سکے۔

داستان، اور خاص کر داستان امیر حمزہ کے زوال کا سبب صرف ناول کی مقبولیت نہیں۔ اور صرف ناول ہی کیوں، تھیٹر خاص کر پارسی تھیٹر، اور داستان کے آخری زمانے میں خاموش فلموں کا بھی غلغلہ کچھ کم نہ تھا۔ تاہم یہ چیزیں اتنی طاقت ور نہ تھیں کہ سیکڑوں برس کی توانا اور دور رس روایت کو چند برسوں میں اکھاڑ پھینکتیں۔ اصل وجہ تو یہ تھی کہ ہم اپنے ورثے پر شرمندہ اور اپنے تہذیبی مظاہر سے متنفر تھے۔ نصوح نے کلیم کا کتب خانہ بے وجہ ہی نذر آتش نہ کیا تھا۔ اور گلستان سعدی میں "فحش" عناصر کچھ یوں ہی معیوب نہ تھے اپنی بیوی سے اس نے کہا کہ مجھے "گلستان" کے صفحے کے صفحے کاٹنے پڑے، کیوں کہ وہ تمہیں پڑھانے کے لائق نہ تھے۔ یہ ہیں وہ لوگ جو ہمارے بزرگان سلف ہیں اور جن کا نام ہم "رحمۃ اللہ علیہ" اور "شیخ" کہہ کر لیتے ہیں۔ اپنی تہذیبی روایت سے برگشتگی اور اس کی ناقدری اور اس سے تنفر کا دور دورہ ہمارے یہاں اب بھی ہے۔ ایسا کیوں ہے، اس پر گفتگو کبھی اور ہوگی لیکن جب کبھی میں کسی "بزرگ" سے کہتا ہوں کہ میں داستان امیر حمزہ پر کام کر رہا ہوں، تو وہ مسکرا کر کہتے ہیں "ہاں ہم نے بھی بچپن میں طلسم ہوشربا / داستان امیر حمزہ پڑھی تھی۔" یعنی یہ سب پرانے زمانے کے بچوں کا دل بہلانے کی حد تک تو ٹھیک ہے، آج کوئی عمر رسیدہ شخص اسے پڑھے، یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔

"داستان" کے بارے میں فی الحال اتنا کہنا کافی ہے کہ داستان ایسا بیانیہ ہے جو زبانی سنانے کے لئے تصنیف کیا جائے۔ چاہے فی البدیہہ، چاہے سوچ کر، خواہ دن رات محنت کر کے لکھ کر، یا دل میں گڑھ کر اور پھر زبانی یاد کر کے، چاہے لکھ کر چھپوانے کی غرض سے طریقہ "تصنیف" جو بھی ہو، لیکن مقصود یہی ہوتا ہے کہ اسے زبانی سنایا جائے۔ باختن نے لکھا ہے کہ دنیا میں ناول نگار سے زیادہ تنہا کوئی فن کار نہیں۔ کیوں کہ اسکی تحریر پڑھنے والا اجنبی، خالق تحریر سے دور، اور اکثر خالق تحریر سے کوئی مطلب نہ رکھنے والا ہوتا ہے۔ ناول تنہائی میں یا چپ چاپ پڑھا جاتا ہے یعنی وہ ایسا بیانیہ ہے جس کی

Target audience مفقود ہوتی ہے اگرچہ جیرالڈ پرنس Gerald Prince اور بعض دوسرے وضعیاتی مفکرین نے فکشن کے Narratee کا تصور پیش کیا ہے، یعنی ایسے شخص (یا سننے والے/ پڑھنے والے) کا جسے فکشن نگار اپنے مفروضہ قاری کی طرح ذہن میں رکھتا ہے، لیکن بانختن کی بات میں پھر بھی بہت سچائی ہے۔ ناول نگار اور اس کے قاری/سامع کے درمیان براہ راست کوئی رشتہ نہیں قائم ہو سکتا۔ ناول نگار کی مثال اندھیرے میں بیٹھ کر گانے والے کی ہے۔ اسے کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کا گانا کون سن رہا ہے۔ سن بھی رہا ہے کہ نہیں، اور اگر سن رہا ہے تو وہ اسے ناپسند کر رہا ہے یا پسند کر رہا ہے، یا بہت زیادہ متاثر ہو رہا ہے، یا بالکل پہلو تہی کر رہا ہے۔ اس کے برخلاف زبانی بیانیہ اور Target audience کے درمیان فوری عمل اور ردعمل ہوتا ہے۔ اور اگر بیانیہ سنایا نہ بھی جا رہا ہو، لیکن تصنیف اس غرض سے کیا جا رہا ہو کہ اسے زبانی سنایا جائے گا۔ تو بھی اس کی شعریات وہی ہوگی، اس کی بدیعیات Rhetoric وہی ہوگی۔ رسومیات اور انداز وہی ہوں گے جو زبانی بیانیہ کے ہوتے ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر کسی نے کوئی زبانی بیانیہ کبھی نہ سنایا ہو، تو وہ ایسا بیانیہ تصنیف بھی نہیں کر سکتا جسے زبانی بیانیہ oral Narrative کہا جا سکے۔ داستان امیر حمزہ" زبانی بیانیہ کی اعلیٰ ترین مثالوں میں بھی ممتاز تو ہے ہی اسے تحریری یا ریکارڈ کی ہوئی شکل میں موجود دنیا کا طویل ترین زبانی بیانیہ کہا جا سکتا ہے۔

جب ہم اردو میں "داستان امیر حمزہ" کا فقرہ استعمال کرتے ہیں تو اس کے معنی کم از کم مندرجہ ذیل ہوتے ہیں۔

(۱) وہ زبانی (یا زبانی۔ تحریری) بیانیہ جو اردو، فارسی، ترکی، پشتو، سندھی، انڈونیشیائی بھاشا، جارجیائی، بنگالی، ہندی، اور بہت سی دیگر زبانوں میں ہے اور جس میں امیر حمزہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

(۲) وہ داستان جسے خلیل علی اشک نے فورٹ ولیم کالج میں فارسی سے ترجمہ کیا (۱۸۰۱)۔ یہ ایک جلد میں ہے اور اب بھی دستیاب ہے۔ اس کی فارسی اصل کا پتہ نہیں لگ سکا ہے۔

(۳) وہ داستان جسے امان علی خاں غالب لکھنوی نے کلکتہ میں فارسی سے ترجمہ کیا (۱۸۵۵)۔ یہ اب تقریباً نا پید ہے، لیکن نولکشور نے اسے ۱۸۷۱ میں عبداللہ بلگرامی کے نام سے تھوڑے بہت تغیر کے بعد چھاپا۔ یہ بھی ایک جلد میں ہے اور اب بھی دستیاب ہے۔ بلگرامی کے بعد تصدق حسین، اور پھر عبدالباری آسی نے اس میں رد و بدل کیا۔ لیکن عمومی اعتبار سے یہ اب بھی وہی متن ہے جو غالب لکھنوی نے ۱۸۵۵ میں شایع کیا تھا۔ اس کی بھی فارسی اصل کا پتہ نہیں لگ سکا ہے لیکن اغلب یہ ہے کہ اشک اور غالب لکھنوی کے پیش نظر دو الگ الگ نسخے تھے۔ اشک کے سامنے "رموز حمزہ" کا کوئی متن تھا اور غالب لکھنوی کا متن کوئی بالکل مختلف نسخہ تھا۔ اس کا "زبدۃ الرموز" سے بھی کوئی خاص تعلق نظر نہیں آتا۔

(۴) وہ داستان جو چھیالیس جلدوں میں بزبان اردو نولکشور پریس لکھنؤ سے چھپی۔ ۱۸۸۳ سے ۱۹۰۹ کے درمیان پینتالیس جلدیں چھپیں۔ آخری جلد ۱۹۱۷ میں چھپی ____

سہولت کے لئے میں اشک کی داستان کے لئے "داستان (مختصر) مصنفہ اشک"، غالب لکھنوی کی داستان کے لئے "داستان (مختصر) مصنفہ غالب لکھنوی/عبداللہ بلگرامی اور چھیالیس جلدوں والی داستان کے لئے "داستان (طویل)"، کے فقرے استعمال کروں گا۔ اگر لفظ داستان تنہا آئے تو اس سے داستان بطور صنف، یا کوئی خاص داستان جو کسی کتاب/جلد میں مذکور ہو، یا عمومی طور پر داستان امیر حمزہ مراد ہوگی۔ ایسی صورت میں سیاق کلام سے مفہوم متعین ہوگا۔

• "داستان امیر حمزہ" جس شکل میں ہم تک پہنچی ہے (اگر اس کی بے گھری اور نا قدری اور کسی بھی جگہ پر اس کی مکمل جلدوں کا نہ ہونا، ہم تک پہنچنا قرار دیا جائے) اس کے اعتبار سے یہ داستان آٹھ دفتروں اور چھیالیس جلدوں پر مشتمل قرار دی جا سکتی ہے۔ "قرار دی جا سکتی ہے" میں نے اس لئے کہا کہ دفتروں اور جلدوں

کی تعداد میں تھوڑی بحث کی گنجائش ہے۔

سب سے پہلی بات یہ کہ جلدیں چھیالیس ہیں یا زیادہ؟ سراج منیر مرحوم نے مجھ سے بہ وثوق کہا تھا کہ باون جلدیں ہیں۔ میں نے تفصیل چاہی تو انھوں نے کہا کہ کراچی میں ایک صاحب کے پاس تھیں۔ لیکن وہ ان صاحب کا پتہ نشان دینے سے قاصر رہے، اور نہ مجھے ہی میری تلاش کا کوئی پھل ملا۔ نہ ان صاحب کی خبر لگی اور نہ کسی فہرست یا تحریر میں ہی مجھے باون جلدوں کا ذکر ملا۔

علی بہادر خاں نے اکتالیس جلدیں بیان کی ہیں۔ لیکن انھوں نے "آفتاب شجاعت" کو خدا معلوم کیوں ایک ہی جلد قرار دیا ہے۔ لہٰذا ان کے یہاں بھی دراصل چھیالیس جلدیں ہوئیں۔ راز یزدانی نے اپنے ایک مضمون (مطبوعہ "آج کل" دہلی بابت جولائی ۱۹۶۰ء) میں لکھا ہے کہ انچاس جلدیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

> "ہرمز نامہ، آفتاب شجاعت اور گلستان باختر وغیرہ سب کو گنا جائے تو انچاس جلدیں اور تقریباً پینتالیس ہزار صفحات ہوتے ہیں۔"

یزدانی نے جلدوں کی فہرست یا تفصیل نہیں دی ہے۔ لہٰذا ان کے دعوے کو بے دلیل ہی قرار دینا پڑے گا۔ صفحات کا اندازہ البتہ ان کا تقریباً درست ہے کیونکہ صفحات کی تعداد بیالیس ہزار بیٹھتی ہے۔ گیان چند نے پہلی بار تمام جلدوں کی فہرست تیار کی اور ان کا مختصر بیان لکھا ان کے یہاں بھی جلدیں چھیالیس ہی ہیں۔ اپنی حالیہ تحریر میں بھی انھوں نے وہی چھیالیس جلدیں بتائی ہیں۔ (مضمون مطبوعہ "نیا دور"، لکھنؤ، اردو نمبر۔) سینتالیس کا معاملہ یہ ہے کہ ایم۔ حبیب خاں نے اپنی کتاب "اردو کی قدیم داستانیں" میں احمد حسین قمر کی طلسم نارنج" پر مفصل گفتگو کی ہے اور کہا ہے کہ یہ "داستان امیر حمزہ کے پہلے دفتر "نوشیرواں نامہ" کی دراصل ایک کڑی ہے۔" حبیب خاں نے مزید کہا ہے کہ "طلسم نارنج" چونکہ داستان امیر حمزہ ہی کا ایک حصہ ہے، اس لئے جلدوں کی تعداد چھیالیس کے بجائے سینتالیس ہو جاتی ہے۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے، "طلسم نارنج" کا ذکر سب سے پہلے حبیب خاں نے کیا۔ اس کا مفصل تعارف تو یقیناً حبیب خاں ہی نے لکھا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اسے داستان امیر حمزہ کی سینتالیسویں جلد قرار دینا تو الگ رہا، کسی نے طلسم نارنج" کا ذکر حبیب خاں کے بعد بھی نہیں کیا۔ نہ ہی کسی نے حبیب خاں کے اس دعوے کا محاکمہ کیا ہے کہ "طلسم نارنج" کو امیر حمزہ کے سلسلے کی ایک قرارداد دیا جانا چاہئے اور اس طرح جلدوں کی تعداد چھیالیس کے بجائے سینتالیس ٹھہرانی چاہئے۔ "طلسم نارنج" کے بارے میں خاموشی کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ بہت کم یاب ہے۔ حبیب خاں نے انجمن ترقی اردو (ہند) کی لائبریری کے نسخے سے استفادہ کیا ہے۔ ممکن ہے یہ نسخہ اوروں کی دسترس میں نہ ہو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ "طلسم نارنج" میں واقعات، کردار اور عمومی فضا بالکل ویسے ہی ہیں جیسے کہ داستان امیر حمزہ (طویل) کی کسی اور جلد میں۔ پھر یہ بھی ہے کہ داستان (طویل) اور داستان (مختصر) دونوں میں "طلسم نارنج" کے حوالے بھی ہیں۔ "طلسم نارنج" کے شروع ہی میں داستان گو ہمیں بتاتا ہے کہ عمرو بن حمزہ یونانی کی پیدائش کا بیان جیسا کہ "دفتر" میں ہے، درست نہیں۔ بلکہ وہ بیان درست ہے جو زیر نظر داستان میں مذکور ہے۔ یہاں "دفتر" سے مراد "نوشیرواں نامہ"، جلد اول (صفحہ ۴۴۹) یا داستان (مختصر) مصنفہ خلیل علی اشک، جلد دوم (صفحہ ۲۲) ہے جہاں عمرو بن حمزہ کی پیدائش کے بارے میں ایک دلچسپ اور انوکھا واقعہ مذکور ہے۔

"نارنج" کے مصنف احمد حسین قمر کو یہ فکر ہمیشہ رہتی ہے دوسرے داستان گویوں پر اپنی برتری کسی طرح ثابت کریں۔ صفحہ ۱۰ پر وہ دوسرے داستان گویوں کو ناقص بتاتے اور عمرو بن حمزہ کی پیدائش کا ایک اور بیان درج کرتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ عمرو بن حمزہ کی پیدائش کا دوسرا بیان بھی "نوشیرواں" اول میں اسی جگہ (صفحہ ۴۴۹) موجود ہے۔

قمر نے اپنی فوقیت جتانے کے جوش میں "نوشیرواں نامہ" کا مکمل حوالہ نہیں دیا۔ بہر حال، وہ بات الگ ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ "طلسم نارنج" کا مرکزی کردار عمرو بن حمزہ ہے اور اس کی پیدائش کے واقعات داستان (مختصر) اور داستان (طویل) دونوں میں موجود

ہیں۔ عمرو بن حمزہ کے ہاتھوں "طلسم نارنج" کی فتاحی کا بیان بھی "نوشیرواں" (اول) میں موجود ہے۔ "طلسم ہوشربا" (چہارم) کے صفحہ ۱۲۰ پر بھی طلسم نارنج" کا حوالہ ہے۔ اور ایک بندریا کا ذکر ہے جس کا نام دم خبیثہ تھا اور جو بڑی ساحرہ تھی۔ دم خبیثہ کی تفصیلی روداد "طلسم نارنج" میں ہے۔ "ہوشربا" (پنجم اول) میں بھی نارنج جادو کا ذکر ہے۔ داستان (مختصر) مصنفہ غالب لکھنوی / عبداللہ بلگرامی میں بھی طلسم نارنج کا سرسری حوالہ ہے۔ غرض کہ اس بات میں کوئی شک ہی نہیں کہ داستان طلسم نارنج اپنی تفصیلات میں اور عام نقشے کے اعتبار سے بھی اور طرز بیان کے اعتبار سے تو بالکل سو فی صدی) داستان (طویل) کا حصہ قرار دی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ بھی بالکل یقینی ہے کہ کسی نے اسے داستان (طویل) کا حصہ قرار نہیں دیا۔ گیان چند کی کتاب کے تازہ ایڈیشن کی کتابیات میں "طلسم نارنج" اور حبیب خاں کی کتاب "اردو کی قدیم داستانیں" دونوں درج ہیں۔ لیکن نفس کتاب میں "طلسم نارنج" پر ایک جملہ بھی نہیں۔ داستان امیر حمزہ کا جتنا تفصیلی اور محتاط محاکمہ گیان چند نے کیا ہے۔ اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ دریں صورت انھوں نے اگر "طلسم نارنج" کو نظرانداز کیا تو اس کی وجوہ ہونگی افسوس کہ انھوں نے اس بحث کو چھیڑا ہی نہیں۔

میرا خیال ہے کہ "نارنج" کو داستان (طویل) کا حصہ قرار دینا غلط ہوگا۔ یعنی داستان (طویل) کی کل جلدیں چھیالیس ہی ہیں سینتالیس نہیں۔ "نارنج" کو داستان (طویل) سے الگ رکھنے کی وجہیں حسب ذیل ہیں۔

(۱)۔ قمر نے اپنے معمول لاف وگزاف اور اپنے معاصروں کو نیچا دکھانے کی کوششوں کے باوجود یہ دعویٰ کہیں نہیں کیا کہ "نارنج" بھی داستان (طویل) کی جلدوں میں سے ایک ہے۔ یہ داستان انھوں نے بالکل آخری زمانے میں لکھی تھی، اس وقت تک ان کا رنگ خوب جم چکا تھا۔ ان کے صاحب زادے اشتیاق حسین سہیل نے "نارنج" کے آخر میں جو تقریظ لکھی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قمر نے "ہومان نامہ" انھیں دنوں ختم کی تھی اور اس وقت وہ "جمشیدی" پر کام کر رہے تھے۔ "اور جوش طبع عالی اسی طور پر ہے اور فرماتے ہیں کہ اگر کوئی قدرداں بقدردانی لکھوائے تو دس بیس جلدیں مثل بوستان خیال کے لکھوں کہ کچھ رنگ طبیعت ظاہر ہو۔ ان دو تین جلدوں میں کیا جودت طبع کم ہو۔ اس طلسم کو ملاحظہ فرما کر ناظرین بہت خوش ہوں گے کہ نوشیرواں نامہ میں نہیں تحریر ہوا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ داستان گو، اور ان کے بیٹے دونوں ہی کی نظر میں "نارنج" داستان (طویل) کا حصہ نہ تھی۔ اگر ہوتی تو وہ بہ بانگ دہل اعلان کرتے۔ وہ ایسے چوکنے والے لوگ نہ تھے۔ جیسا کہ ہم ابھی دیکھ چکے ہیں۔ قمر نے عمرو بن حمزہ یونانی کی پیدائش کا بیان تصدق حسین (نوشیرواں اول) کے یہاں سے بے کھٹکے اپنا مال بنا کر لے لیا اور تمام داستان گویوں (بہ شمول تصدق حسین) کو مطعون بھی کیا کہ وہ "خلاف امر" روائتیں بیان کرتے ہیں، اصل روایت تو میں بیان کر رہا ہوں۔ خود قمر نے "نارنج" کے آخر میں یہی کہا ہے کہ "طلسم حقیر نے تمام کیا۔ اب آگے داستان صاحب قران کا ذکر ہے... اگر ناظرین وسامعین اس طلسم کو ہاتھوں ہاتھ خریدیں گے تو آئندہ اس کو بھی تحریر کروں گا۔ یعنی انھوں نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں نے داستان (طویل) کی ایک جلد لکھی ہے۔ داستان (طویل) کی جلدیں تو وہ نولکشور کیلئے لکھ ہی رہے تھے یہاں انکو غالباً یہ امید تھی کہ اگر "ناظرین وسامعین" اصرار کریں گے۔ تو انھیں نوشیرواں جیسی داستان الگ سے لکھنے کا موقع مل جائے گا معلوم نہیں "نارنج" کے ساتھ "ناظرین وسامعین" نے کیا سلوک کیا؟ یہ داستان شاید مقبول نہ ہوئی۔ کیوں کہ یہ کم وبیش گم نام رہی ہے۔ بہر حال قمر کی بھی عمر نے وفا نہ کی، اور "نارنج" کی اشاعت کے تھوڑے ہی عرصے بعد وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

(۲)۔ خود پبلشر کی کسی فہرست یا اشتہار میں "طلسم نارنج" کا ذکر داستان (طویل) کے حصے کے طور پر نہیں ہے۔ شروع داستان کی جلدیں جو میرے پاس ہیں، ان میں "نارنج" کا اشتہار کیا، اور داستان (طویل) کے حصے کے طور پر اس کا ذکر کیا، فہرست تک میں اس کا نام نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پبلشر اس داستان اور داستان (طویل) کے درمیان واضح امتیاز رکھنا چاہتا ہے۔ اشتہار اور فہرست سے نام غائب رہنا بھی "نارنج" کی گمنامی کا ایک سبب یقیناً رہا ہوگا۔

(۳)۔ داستان (طویل) کی جلدیں اوسطاً نو سو صفحے یا کچھ زیادہ کی ہیں۔ (بوستان خیال) کی جلدیں اوسطاً بڑی تقطیع کے سات سو صفحات یا کچھ ہیں۔ یہ اوسط دہلوی اور لکھنوی دونوں "بوستان" کا ہے۔) اس سے معلوم ہوا کہ طوالت اور ضخامت بھی داستان کی شرط ہے۔ "نارنج" کی ضخامت ۲۰۸ صفحات ہے، یعنی یہ اتنی چھوٹی ہے کہ اس جیسی چار داستانیں بآسانی داستان (طویل) کی کسی جلد میں سما سکتی ہیں۔

مندرجہ بالا محاکمے سے یہ بات کم و بیش ثابت ہو جاتی ہے کہ نارنج کو داستان (طویل) کی سینتالیسویں جلد قرار دینے کی کوئی معقول وجہ نہیں، اور جلدوں کی صحیح تعداد چھیالیس ہی ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان ہوا، داستان (طویل) کی چھیالیس جلدیں آٹھ دفتروں میں منقسم ہیں۔ یہ دفتر کس نے بنائے اور دفتروں کی تعداد کس نے متعین کی۔ ان سوالوں کے جواب فی الوقت ممکن نہیں۔ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ دفتروں کی یہ تقسیم اتنی قدیم نہیں جتنی نولکشوری بیانات، یا داستان گویوں کے مفروضات سے مترشح ہوتا ہے۔ "رموز حمزہ" میں دفتروں کا پتہ نہیں۔

راز یزدانی نے لکھا ہے (نگار لکھنؤ بابت ستمبر ۱۹۵۹ء) کہ انھوں نے "رموز حمزہ" مطبوعہ تہران ۱۲۷۵-۱۲۷۸ھ دیکھی ہے۔

(برٹش لائبریری میں جو نسخہ ہے اس کی تاریخ طباعت ۱۲۷۴-۱۲۷۶ھ ہے۔ ممکن ہے راز یزدانی نے دوسرا ایڈیشن دیکھا ہو)۔ اس مضمون میں انھوں نے دفتروں کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ کتابوں کا ذکر کیا ہے جن میں "رموز حمزہ" منقسم ہے۔ وہ لکھتے ہیں: اس "رموز حمزہ" کو سات جلدوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر جلد کو "کتاب" کہا گیا ہے۔ لیکن "آج کل" دہلی بابت جولائی ۱۹۶۰ء والے مضمون میں وہ کہتے ہیں کہ اس میں "صرف تین دفتروں کا نام ملتا ہے۔ نوشیرواں نامہ۔ ایرج نامہ اور صندلی نامہ" اصل کتاب دیکھے بغیر میں نہیں یقین کر سکتا کہ اس میں دفتر ہوں (جب کہ راز صاحب خود بھی "کتابوں" کا ہی ذکر کر رہے ہیں) "رموز حمزہ" مطبوعہ بمبئی ۱۹۰۹ء میرے سامنے نہ اس میں اور نہ "قصۂ حمزہ" مرتبہ جعفر شعار (تہران ۱۹۶۸ء ۱۹۶۹ء) میں دفتر ہیں۔ موخر الذکر بھی میرے سامنے ہے۔ "زبدۃ الرموز" میں بھی دفتر نہیں ہیں۔ لیکن اس کا امکان ہے کہ اٹھارویں صدی آتے آتے داستان اتنی پھیل گئی ہو کہ اس کے کئی حصے یا دفتر ہو گئے ہوں جیسا کہ فرینس پرچٹ نے لکھا ہے کہ غالب نے ۱۸۶۱-۱۸۶۲ کے زمانے میں میرن صاحب کو جب یہ لکھا کہ "مولانا غالب علیہ الرحمۃ ان دنوں میں بہت خوش ہیں۔ پچاس ساٹھ جزو کی کتاب امیر حمزہ کی داستان کی... آگئی ہے..." تو ممکن ہے کہ وہ "کتاب رموز حمزہ" مطبوعہ تہران ۱۸۵۷-۱۸۵۹ کا ذکر کر رہے ہوں، کیوں کہ اردو یا فارسی میں اس وقت کسی اور داستان امیر حمزہ کا پتہ نہیں چلتا جو اس حجم کی ہو۔ راز یزدانی نے اپنی دیکھی ہوئی "رموز حمزہ" کا جو حجم بتایا ہے وہ غالب کے بیان کردہ حجم سے مطابقت رکھتا ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ داستان (مختصر) مصنفہ خلیل علی اشک (۱۸۰۱) اور داستان (مختصر) مصنفہ غالب لکھنوی (۱۸۵۵) دونوں میں داستان کی چودہ جلدوں کا ذکر ہے۔ اگرچہ یہ دونوں کتابیں خود بالترتیب ۴۳۳ اور ۴۹۲ صفحات پر مشتمل ہیں لیکن دونوں میں تاثر اس بات کا پایا جاتا ہے کہ اصل داستان بہت طویل ہے

داستان کے آٹھ دفتروں کے سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کی ترتیب وہی ہے جو خود قصے کی ترتیب ہے۔ یعنی

داستان کا آغاز "نوشیرواں" اول میں ہوتا ہے، بعد کے دفاتر جس ترتیب سے رکھے گئے ہیں، اسی ترتیب سے واقعات پیش آتے ہیں اور "لعل نامہ" دوم میں امیر حمزہ اور عمرو کی موت پر داستان تمام ہو جاتی ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ داستان کی بہت سی جلدیں، یا بہت سے اجزا کو پبلشر (نولکشور) نے دفتروں کا حصہ نہیں قرار دیا ہے۔ چنانچہ "ہفت پیکر"، "نور افشاں"، "سکندری" وغیرہ کسی دفتر کا حصہ نہیں قرار دیا گیا۔ "آفتاب شجاعت" کو ہمیشہ "دفتر آفتاب شجاعت" کہا گیا۔ (یعنی عملاً آٹھ کے بعد نواں دفتر جاری کیا گیا۔) "گلستاں باختر" کو "آفتاب" کے سلسلے کی داستان (لہذا "دفتر" آفتاب شجاعت" کا حصہ) بیان کیا گیا۔ تیسری اہم بات یہ ہے کہ دفتروں کی داستانیں، اور ان کی جلدوں کی تعداد، دونوں باتیں دفتروں کی تحریر کے پہلے کم و بیش متعین ہو چکی تھیں اس تیسری بات سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا داستان گو/پبلشر کو پورا اندازہ تھا کہ تحریری شکل میں کون داستان کتنے صفحے لے گی اور کون سے دفتر میں کتنی جلدیں ہوں گی؟ ظاہر ہے کہ بات بالکل قرین قیاس نہیں۔ لہذا قوی امکان اس بات کا ہے کہ پبلشر اور داستان گو مل کر طے کر لیتے ہوں گے کہ کس دفتر میں کتنی اور کون سی جلدیں ہوں، اور اگر کوئی نئی داستان (یا پرانی داستان کی توسیع) ہو تو اسے کس دفتر میں رکھا جائے۔ لہذا یہ بات بھی پوری طرح ممکن، بلکہ اغلب معلوم ہوتی ہے، کہ پوری داستان (یا کم سے کم وہ حصے/جلدیں جو آٹھ دفتروں تک محدود تھیں) زبانی شکل میں کم و بیش مستقل صورت اختیار کر چکی تھی معرض تحریر میں آنے کے بعد صحیح پتہ لگتا تھا کہ کوئی داستان کتنی جلدوں میں سمائی ہے۔ لیکن دفتروں کے بارے میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ اور یہ ممکن ہے کہ فارسی میں بھی (ہندوستان کی حد تک) یہ اپنی اصل سے بہت زیادہ پھیل چکی ہو۔ "بہار عجم" اور "چراغ ہدایت" میں بعض داستان الفاظ کا اندراج اس خیال کو مستحکم کرتا ہے۔

اس موضوع پر گفتگو آئندہ ہوگی۔ فی الحال آٹھ دفتروں پر کچھ مزید غور کرتے ہیں۔ "نوشیرواں" اول (جون ۱۸۹۳) کے سرورق پر نمایاں الفاظ میں حسب ذیل اعلان ہمیں ملتا ہے: "... اس کے آٹھ دفتر ہیں اور بعض دفتر کی کئی جلدیں حسب تفصیل ذیل۔" اس کے بعد چوکھٹے میں جلدوں اور دفتروں کے نام یوں درج ہیں:۔

تعداد دفتر	نام داستان	تعداد جلد	تعداد دفتر	نام داستان	تعداد جلد
اول	نوشیرواں نامہ	۲ جلد	پنجم	طلسم ہوشربا	۷ جلد
دوم	کوچک باختر	۱ جلد	ششم	صندلی نامہ	۱ جلد
سوم	بالا باختر	۱ جلد	ہفتم	تورج نامہ	۲ جلد
چہارم	ایرج نامہ	۲ جلد	ہشتم	لال (کذا) نامہ	۱ جلد

"ہوشربا" (پنجم اول) کے ایک نسخے کی داشت میرے پاس ہے۔ یادداشت کے مطابق اس کے صفحہ ۷۶۰ پر ایک اشتہار ہے جو ۱۸۹۱ء کی اشاعت (یعنی اول اشاعت) میں مندرج اعلان کی من و عن نقل ہے۔ جون ۱۸۹۳ کی منقولہ بالا فہرست بھی بالکل وہی ہے جو ۱۸۹۱ کے اشتہار میں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ۱۸۹۱-۱۸۹۳ میں یہ بات طے نہ تھی کہ "لعل" کی دو جلدیں ہوں گی۔ نہ ہی "ہومان" اور "ہرمز" کی اشاعت کی کوئی تجویز نظر آتی ہے، اور نہ بقیۂ طلسم ہوشربا کی دو جلدوں کی۔ ہاں "ہرمز" کی اشاعت اول (۱۹۰۰) میں "(لال کذا) نامہ" کی دو جلدیں بتائی گئی ہیں۔ اشتہار میں "ہرمز" نامہ متعلقہ نوشیرواں نامہ" اور "ہومان نامہ متعلقہ نوشیرواں نامہ" کا اعلان ہے۔ "آفتاب" کا اشتہار "جمشیدی" دوم اور سوم (۱۹۰۲) "سلیمانی" دوم (۱۹۰۵) میں بھی نہیں، اور جب ہے تو الگ "دفتر" کی حیثیت سے ہے۔

اس بحث کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پبلشر (اور شاید داستان گو بھی) دفتروں کی تعداد میں اضافہ نہ کرنا چاہتے تھے۔ اور نئی داستانوں کی تصنیف یا تحریر اور پھر اشاعت کے مشتاق بھی تھے۔ "ہومان" اور "ہرمز" کو تو انھوں نے دفتر میں شامل کر لیا کہ ان کا تعلق براہ راست "نوشیرواں" سے تھا، اور شاید یہ داستانیں پہلے سے موجود بھی تھیں اور "بقیۂ ہوشربا" کو دفتر میں ڈالنا کچھ مشکل نہ تھا۔ لیکن بقیہ داستانوں کے بارے میں ان کا رویہ گومگو کا رہا۔

یہاں ہمارے لئے مشکل آپڑتی ہے کہ ہم داستان (طویل) کو ایک داستان کہیں، یا دو کہیں، اگر ایک کہیں تو دفتر کے باہر والی داستانوں کو کہاں رکھیں؟ اور اگر دو کہیں تو اس کے لئے جواز کیا ہو، جب کہ داستان گویوں اور پبلشر، کسی نے بھی کبھی نہیں کہا کہ دو داستانیں معرض وجود میں آرہی ہیں۔ گیان چند نے اس معاملے کو یوں حل کیا ہے کہ گیارہ گیارہ دفتروں اور انتیس انتیس جلدوں کے دو سلسلے قائم کئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جلدیں چونکہ صرف چھیالیس ہیں اس لئے دونوں سلسلوں میں کئی جلدیں مشترک ہیں۔ گیان چند کہتے ہیں کہ اس ترکیب کو اختیار کرنے کے باعث "کڑی سے کڑی ملتی چلی گئی ہے اور جنہیں ایک مربوط داستان قرار دیا جاسکتا ہے۔" گیان چند کی یہ ترکیب ہے تو دلچسپ، لیکن اس میں کئی قباحتیں ہیں۔

پہلی بات تو یہ کہ جلدوں کی تکرار کے باعث Symmetry غائب ہوگئی ہے اور مطالعہ مشکل ہوگیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ دفتروں کی تعداد آٹھ سے گیارہ ہوگئی ہے۔ تیسری بات یہ کہ ایک کی جگہ دو سلسلے ہوگئے ہیں، ا پھر بھی جلدوں کی تعداد چھیالیس نہ رہ سکی، اٹھاون ہوگئی۔ میرا خیال ہے کہ آٹھ دفتروں کی ترتیب کو قائم رکھتے ہوئے ایک ہی سلسلہ وضع کیا جاسکتا ہے، اور ربط بھی پہلے سے زیادہ پیدا ہوسکتا ہے۔ ملحوظ رہے کہ مکمل ربط اور کامل طور پر ہر واقعے کی منطقی اور زمانی ترکیب داستان کے لئے نہ ضروری ہے نہ ممکن، ضروری صرف یہ ہے کہ ربط بیش از بیش ہو اور اہم واقعات و اشخاص کے بارے میں معلوم ہوسکے کہ وہ کس وقت کہاں ہوں گے گیان چند کی ترتیب کے نتیجے میں داستان کا ربط زائل ہوجاتا ہے کیوں کہ انھوں نے سلسلۂ اول میں "لعل"، "بہر"، "آفتاب"، اور پھر "گلستان" کو رکھا ہے۔ حالانکہ "لعل" میں حمزۂ اول، حمزۂ ثانی اور عمرو، سب کی موت ہوجاتی ہے۔ یہ داستان بہرحال "داستان امیر حمزہ" ہے، داستان حمزۂ ثالث و رابع نہیں، اور نہ ہی امیر حمزہ و حمزۂ ثانی و ثالث و رابع ہے۔ اس داستان کا اختتام بہرحال امیر حمزہ اول کی موت پر ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ داستان گو ان کی موت کا بیان نہ کرے، اور ان کی زندگی کے واقعات کو طویل سے طویل تر کرتا جائے۔ لیکن اگر وہ امیر حمزۂ اول کی موت کا بیان کرتا ہے تو داستان وہیں ختم بھی کرتا ہے۔ داستان (مختصر) کی دونوں روایتیں (اشک اور غالب لکھنوی/عبداللہ بلگرامی) امیر حمزۂ اول کی موت پر ہی ختم ہوتی ہیں۔

بنیادی بات جو ذہن میں رکھنے کی ہے وہ حمزۂ ثانی کا ظہور ہے (صندلی نامہ) اس کا مطلب یہ ہے کہ صاحب قران (امیر حمزہ) مرسکتے ہیں، لیکن صاحب قرانی باقی رہتی ہے۔ یعنی صاحب قرآن تو اور بھی ہوں گے (اگر خدا چاہے) لیکن صاحب قرآن وقت کو موت بھی ہے۔ اور عزل بھی۔ یعنی وہ اپنی زندگی ہی میں صاحب قرانی کسی اور کو منتقل کرسکتا ہے۔ لہذا "صندلی" کو داستان (طویل) کا خط انقسام کہنا چاہئے۔ صندلی کے بعد کی جلدیں حمزۂ اول، حمزۂ ثانی، صاحب قران ثالث (بدیع الملک) اور صاحب قران رابع (عادل کیواں شکوہ) کے کارناموں کے اعتبار سے مرتب ہوں گی۔

داستان (مختصر، اشک) اردو میں داستان امیر حمزہ کی قدیم ترین تحریری شکل ہے۔ اس کی جلد دوم صفحہ ۱۹۱ اور "رموز حمزہ" صفحہ ۹۷ پر لکھا ہے کہ قضا و قدر نے امیر حمزہ کی عمر ایک سو بچانوے برس دو پہر لکھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ امیر حمزہ کی مدت حیات میں بہت کارناموں اور واقعات کی گنجائش ہے۔ اور ایسا نہیں ہے کہ داستان (طویل) کے داستان گویوں کو وقت کا احساس نہ تھا۔ ایک جگہ ایک پہلوان کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کی عمر ایک سو بیس برس ہے اور یہ نوشیرواں نامے کے وقت سے جنگوں میں شریک رہا ہے۔ طلسم ہوشربا میں کتنی مدت گذرتی ہے، طلسم ہفت پیکر میں کتنا عرصہ لگتا ہے، ان سب باتوں کا ذکر داستان (طویل) میں ہے۔ تفصیل اپنے وقت پر بیان ہوگی۔

□□

شاعری وہ جادو یا اعجاز ہے جس کا کرشمہ یہ ہے کہ انسان کے خیالات و احساسات اس کے جذبات دل کے سانچے میں ڈھل کر زبان سے نکلتے ہیں اور ایک عالم تصویر پیدا کردیتے ہیں۔

برج نرائن چکبست

نیّر مسعود
"ادبستان" دین دیال روڈ
لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

اودھ میں فنِ سپہ گری

انگریز سیاح ولیم ناٹن نے نصیر الدین حیدر کے عہد کا لکھنؤ دیکھا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

"ڈریسڈن، ماسکو، قاہرہ، جس سے چاہیے لکھنؤ کو مشابہ قرار دیجیے، مگر میرے نزدیک لکھنؤ کی ایسی عجائب روزگار چیزیں ان مقامات میں سے کہیں نظر نہ آئیں گی۔

اوّلاً لکھنؤ کے ایسے ہتھیار بند آدمی اِن شہروں میں کہیں نہ دکھائی دیں گے۔ ماسکو کے باشندے صرف چھری باندھتے ہیں اور قاہرہ کے لوگوں کے ہاتھ میں کچھ ہتھیار کبھی کبھی دکھائی دیتے ہیں، برخلاف اس کے لکھنؤ کے باشندے بالعموم اور بچے بنے نظر آئیں گے، ان کے پاس ڈھال، تلوار اور بندوق یا پستول ضرور ہوگی۔ حتّیٰ کہ وہ لوگ جو کاروبار روزمرّہ کرتے ہیں وہ بھی تلوار تو ضرور باندھتے ہیں، اور کوچہ گرد حضرات جب سَرگشت کو نکلتے ہیں تو چاہے کیسی ہی ذلیل پوشاک کیوں نہ پہنے ہوں مگر طمنچے کی جوڑی اور ڈھال ضرور لگائے ہوں گے۔ بھینسے کی کھال سے منڈھی ہوئی ڈھال جس پر پیتل کے پھول لگے ہوتے ہیں اکثر بائیں جانب کاندھے پر پڑی ہوتی ہے۔ بڑی بڑی مونچھوں والے مہیب صورت راجپوت اور پٹھان اور سیاہ داڑھی والے مسلمان ڈھال تلوار سے لیس تنتے بڑھتے نظر آتے ہیں اور اہلِ لکھنؤ کے پندارِ خودی و خود پسندی اور جوشِ نبرد آزمائی کو بخوبی ظاہر کرتے ہیں۔

یہ امر کہ کیوں اہلِ لکھنؤ بالعموم سپاہیانہ وضع رکھتے ہیں، تعجب خیز نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ کمپنی کے فوجی صیغے میں اَودھ کے ہی پرورش یافتہ بکثرت ہوتے ہیں اور احاطۂ بنگالہ کی فوج تمام تر یہیں کے باشندوں سے مملو ہے۔

باشندگانِ لکھنؤ میں اسلحہ کا مذاق بچپنے ہی سے پیدا کر دیا جاتا ہے۔ تیر اور برچھے یہاں کے لڑکوں کے معمولی کھلونے ہیں اور جس طرح پر کہ انگریز دائیاں بالعموم بچوں کے ہاتھوں میں جھنجھنے دیتی ہیں، اسی طرح یہاں چھوٹے چھوٹے طمنچے اور کاٹھ کی تلواریں کھیلنے کو پکڑا دی جاتی ہیں۔"[1]

اودھ کی جس پُر تکلف، نرم و نازک تہذیبی فضا کا نقش ہمارے ذہنوں میں راسخ ہے، ناٹن کی پیش کی ہوئی فضا اس سے بہت مختلف نظر آتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ فن سپہ گری سے دل چسپی اور واقفیت اودھ کی تہذیب کا ایک اہم عنصر تھی اور یہاں کے بیشتر شہری اس فن میں دخل ضرور رکھتے تھے خواہ وہ اہلِ قلم ہوں یا اہلِ علم ہوں یا اہلِ حرفہ۔ اسی لیے یہاں کے ادب، خصوصاً داستان اور مرثیے میں، رزمیہ عناصر کو بڑی اہمیت اور مقبولیت حاصل تھی۔ اس پرانے دور کے کئی ادبی مشاہیر فنِ سپہ گری سے خاص ربط رکھتے تھے۔ مرزا رجب علی بیگ سرور اپنے بارے میں بتاتے ہیں:

"ہم بھی کبھی ڈھال تلوار باندھتے تھے اور وہ کام کرتے تھے جس میں صد ہا مرتے بچتے، ہاتھ منھ کٹتے تھے۔"[2]

غالباً اسی شوق کا شاخسانہ تھا کہ سرور قتل کے الزام میں ماخوذ ہو گئے

تھے اور ان کو لکھنؤ سے جلاوطن ہونا پڑا تھا۔[۳۵]

خواجہ آتش کی سپاہی مزاجی اور بانکی طبیعت مشہور تھی۔ ایک بار وہ ایک مشاعرے میں بھری ہوئی قرابین لے کر گئے تھے اس لیے کہ انھیں اطلاع ملی تھی کہ اس مشاعرے کے بانی نواب صاحب اس موقع پر ان کے ادبی حریف ناسخ کو خلعت دیں گے اور اس طرح آتش کی سبکی ہوگی۔ آتش کے تیور دیکھ کر نواب صاحب کو اسی وقت ان کے لیے بھی خلعت کا انتظام کرنا پڑا۔[۳۶] ایک اور موقع پر انھوں نے تلوار کھینچ کر فقیر محمد خاں گویا کے سے زبردست سپہ گر کو مقابلے کے لئے للکار دیا تھا۔[۳۷]

خود گویا اودھ کے نامور ترین سپہ گروں میں تھے۔ نصیر الدین حیدر کی بادشاہی اور منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں کی وزارت کے زمانے میں فوجی افسروں کو ہتھیار باندھ کر دربار میں آنے کی ممانعت ہوئی تو گویا نے کہا:

"میں اہلِ جنگ کے زُمرے میں ملازم ہوں، اگر ہتھیار کھول دوں گا تو کیا طبلہ اور سارنگی لے کر دربار میں حاضر ہوا کروں گا؟" اور دربار میں جانے سے انکار کر دیا۔ آخر ان کو اس حکم سے مستثنیٰ کیا گیا [۴۶]

میر انیس فنِ سپہ گری میں عملی مہارت رکھتے تھے۔ شہسواری اور سیف زنی کے علاوہ وہ بنوٹ کے بھی ماہر تھے۔ اس فن میں ان کے استاد میر امیر علی کا کہنا تھا کہ "اگر میر انیس کے ہاتھ میں ایک گز لٹھے کے رومال میں محمد شاہی یا بھوپال کے چار پیسے والا پیسا بندھا ہوتا تو وہ دس لکڑی پھینکنے والوں سے بھی چوٹ نہ کھا سکتے تھے اور ان کی چوٹ کو بنوٹ جاننے والوں کے سوا کوئی روک نہ سکتا تھا۔" [۴۷]

سید سخی حسن نقوی نے مراثیِ انیس کے رزمیہ حصوں کا مطالعہ کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ انیس تمام رائج الوقت ہتھیاروں اور ان کے استعمال سے واقف تھے [۴۸] اس زمانے کے پسندیدہ ترین ہتھیار تلوار کی تعریف انیس اور دوسرے مرثیہ نگاروں کے یہاں اس طرح ملتی ہے جیسے غزل میں معشوق کی تعریف کی جاتی ہے۔ ایک مجلس میں انیس نے خواجہ آتش کو خاص طور پر متوجہ کر کے جب تلوار کی تعریف میں یہ بیت پڑھی ؎

اشراف کا بناؤ، رئیسوں کی شان ہے
شاہوں کی آبرو ہے، سپاہی کی جان ہے

تو آتش وجد میں آ کر نصف قد سے کھڑے ہو گئے۔ [۴۹]

علمائے دین بھی سپہ گری کے ذوق سے بے بہرہ نہیں تھے اور ان میں سے کئی اس فن میں استادی کا درجہ رکھتے تھے، لیکن ظاہر ہے وہ اس کی برسرِ عام نمائش نہیں کرتے تھے۔

بعض خواتین نے بھی سپہ گری میں مہارت بہم پہونچائی تھی۔ لکھنؤ کی ایک بیگم کا قصہ مشہور ہے کہ رات کو ان کے گھر میں چور اتر آئے تھے انھوں نے مزاحمت کی تو چوروں نے ان پر تلوار سے حملہ کر دیا۔ بیگم نے لوٹنے پر وار کو روک کر ایسی ضربیں لگائیں کہ ایک ایک چور بے ہوش ہو گیا۔

لیکن سپہ گری میں افسانوی شہرت حاصل کرنے والا طبقہ بانکوں کا تھا جن کی وضعداریوں اور دبدبے کے بہت واقعات مشہور ہیں۔ بانکوں کا اس سماج میں بہت لحاظ کیا جاتا تھا اور بڑے بڑے صاحبانِ اقتدار بھی ان کو طرح دے جاتے تھے۔ بانکوں کی یہ ساکھ ان کی سپہ گری پر قائم تھی۔

اودھ میں جس طرح ہر فن میں باریکیاں پیدا کی گئیں اسی طرح فنِ سپہ گری میں بھی طرح طرح کے کمالات دکھائے گئے۔ میرے لڑکپن تک ایسے بزرگ موجود تھے جو ان کمالات کے چشم دید گواہ تھے۔ کمان سے ایک تیر چلانا اور دوسرے تیر سے اُسے ہوا ہی میں اڑا دینا۔ چارپائی کے نیچے جنگلی کبوتر کو چھوڑ کر چارپائی کے ہر طرف اس تیزی سے لاٹھی چلانا کہ کبوتر کسی بھی طرف سے باہر نہ نکل سکے۔ لکڑی کے تختے پر پان کا پتا رکھ کر اس پر تلوار کا ایسا سدھا ہوا ہاتھ لگانا کہ پتا کٹ جائے لیکن تلوار تختے سے چھونے نہ پائے۔ تلوار سے دوسرے کی آنکھ میں بحفاظت سُرمہ لگا دینا، لیموں پر خط دے کر اُسے اوپر اُچھالنا اور ٹھیک خط کے مقام پر سے دو ٹکڑے کر دینا، کھیرے کو ہوا میں اُچھالنا اور اسے زمین پر گرنے سے پہلے پہلے چھیل دینا وغیرہ اودھ کی بادشاہی ختم ہونے کے بعد تک کے عام تماشے تھے۔

سپہ گری کے آخری کامل اُستاد مُبارک حسین (وفات جنوری ۱۹۹۰ء) نے اپنی کتاب "فنِ سپہ گری" میں اس فن کے مختلف شعبوں کا ذکر کیا ہے، مثلاً تیر اندازی، نیزہ بازی، تبر کی لڑائی، شمشیر زنی، (بانک خنجر کی لڑائی)، لاٹھی، بانا، بنیٹھی، تیغہ، رُومال کی لڑائی، ٹھگوں کی گھڑیا کُشتی، پٹا، گرز کی جنگ، لکڑی یا بھالی، شیر پنجہ۔ استاد نے ان شعبوں کے داؤں پیچ بھی لکھے ہیں [۵۰]

اسلحہ سازی میں بھی اودھ کو امتیاز حاصل تھا۔ قدیم زمانے میں یہاں کے بنے ہوئے تیر ہندستان بھر میں مشہور تھے [۵۱] ۱۸۸۵ء میں اودھ کی صنعت و حرفت کی نمائش کے لئے اشیا کی طلب میں ایک اپیل شائع کی گئی تھی، اس میں بتایا گیا ہے:

"اودھ مدتوں سے ڈھالوں اور بھالوں اور برچھوں اور توڑے دار بندوقوں کے واسطے مشہور ہے.... اب بھی بہت سے عمدہ نمونے اودھ اور ممالکِ مغربی و شمالی میں ہیں" [۵۲]

مطلوبہ اسلحہ کے ذیل میں لکھا ہے:

"کل اسلحہ اور زرہ جو کہ نہایت مشہور زرہ سازوں کے بنائے ہوئے ہوں یا جو کہ بڑے نامی جنگ جو اور نبرد آزما بہادروں اور تواریخی معزز اشخاص کے ہوں، زیادہ مطلوب ہیں۔ نیز ایسی زرہ بختر (بکتر) اور چار آئینے وغیرہ جن پر طلسماتی اور سحری تحریر کندہ ہو..... ایک کامل عمدہ مجموعہ کل ایسے آلات کا جو کہ مختلف اودھ کے مشہور اسلحہ سازوں کے بنائے ہوئے ہوں، نہایت پسندیدہ اور دل چسپ ہوں گے"۔ [۱۳]

اس اپیل میں مطلوبہ ہتھیاروں اور سپہ گری کے دوسرے لوازم کی فہرست بھی دی گئی ہے اور اس سے پہلے یہ صراحت کر دی گئی ہے:

"ہم اس موقع پر بطور اختصار صرف چند اسلحہ کے نام لکھنے پر قناعت کرتے ہیں۔ ایک پوری فہرست لکھنے میں بہت وسعت چاہیے"۔ [۱۴]

یہ فہرست (چند اضافوں کے ساتھ) درج ذیل ہے:

"کمان۔ تیر۔ تبر۔ ترکش۔ ترسول۔ گرز۔ چکر۔ پیش قبض۔ بچھوا۔ چُھری۔ سروہی۔ جمدھر۔ خنجر۔ قردلی۔ چاقو۔ نیمچہ۔ نیپالی کھکری (نیپالی بھجالی)۔ کلہاڑی۔ بانکا۔ پھرسا۔ تیغہ۔ دو ہتھی تیغہ۔ کھانڈا بلم۔ برچھا۔ بھالا۔ نیزہ۔ برچھی۔ شمشیر۔ کٹار۔ کٹاری گپتی۔ کورا۔ پتیسہ۔ سوسن پتا تلوار۔ بندوق توڑے دار۔ بندوق جوہردار۔ بندوق پتھردار۔ طپنچہ۔ شیر پنجہ۔ قرابین۔ سنگین۔ کربستہ۔ رنجک دانی۔ بارود کے سینگڑے۔ زنبورک۔ بگھنک (شیر پنجہ)۔ کمند۔ بانا۔ پٹا۔ بنیٹھی۔ لاٹھی۔ پھری۔ گدکا (گتکا)۔ غلیل۔ چلک۔ پتھری۔ ڈھال۔ ناگ پھنی ڈھال۔ ماڑو۔ ٹوپ۔ خود۔ دستانہ۔ زرہ۔ بکتر۔ چار آئینہ۔ جوشن۔ پیٹی۔ جھلم۔ چلتہ۔ تحت الحنک۔ لیزم۔ مگدر۔ کھڑگ۔ رام داؤں۔ تیغ جلاد۔ "چھوٹے چھوٹے اوزار جو قوم مرہٹہ کی عورتیں اور لڑکے استعمال کرتے تھے"۔ رومال۔ توپ۔ شترنال۔ (ہاتھی گھوڑے اونٹ کو بھی سامان سپہ گری میں شمار کیا جاتا تھا)۔

ان اسلحہ وغیرہ کی مختلف قسمیں، وضعیں اور الگ الگ حصے ہوتے تھے، اور ان سب کے الگ الگ نام تھے، ان کی تفصیل کاغذات میں درج کی جاتی تھی اور دفتری اصطلاح میں "چہرہ" کہلاتی تھی۔ کچھ اشیا کے چہرے دیکھیے:

تلوار کا چہرہ

(۱) "تیغہ انگریزی، طرح المانی، ہر دو جانب نقاشی آب طلا، قبضہ مع دو قرص طلا مُرصّع یاقوت، زمرّد و الماس، بر نتھنی نقرہ ملمع طلا، تہنال و دو حلقہ مینا کاری، سلک آہنی کوفت طلا، دستکی قور نقرہ"۔ [۱۵]

(۲) "تیغہ ولایتی، طرح جنوبی، دونوں طرف اوپر پیٹھ کے خط ہندی اور نادِ علیؑ اور آیۃ الکرسی تمام سونے سے طُغریٰ میں لکھی ہے، اور قبضہ ولایتی، سادہ یا پولادی یا ملمع کار یا کوفت مینا کاری کا، یا تہنال فولادی ملمع سونے کا"۔ [۱۶]

کمان کا چہرہ

"کمان لاہوری، سبز رنگ، دو ٹانک، بند سرخ، شنگرفی لاہوری، چلّہ ریشم سُرخ و سفید، بالا بیچ طلال و در گوشہ خم دار، قبضہ گرد خوش آیند یکساں"۔ [۱۷]

(ایک ٹانک: ساڑھے تین سیر۔ دو ٹانک کی کمان کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس کے چلّے میں سات سیر کا وزن لٹکا دیا جائے تو کمان کے دونوں سرے آپس میں مل جائیں گے [۱۸])

بندوق کا چہرہ

"نال آہنی یا برنجی، قدّ دریا ہشت پہل، رومی یا لاہوری یا داغستانی یا رام پوری یا ولایتی یا انگریزی، توڑے دار، گل ہاتھی دانت یا شاخ آہنی یا نقرہ یا برنجی، یا مسی، سات بند یا دس یا گیارہ بند، برنجی یا نقرئی یا کسواری، دو کڑی برنجی یا آہنی ملمع کی یا کوفت کی یا فولادی یا نقرہ، تسمہ چرمی مع غلاف بانات یا مخمل یا اطلس کے، یا بندوق چقماقی، ولایتی یا رومی یا انگریزی یا عملی، کندے میں ایک ڈبیا کھدی ہوئی"۔ [۱۹]

بکتر کا چہرہ

"بکتر زرہ آہنی، گریبان مخمل سرخ مع تسمۂ چرمی، دامن از عقب چاک، وزن دس سیر" ۲۰ے

خنجر کا چہرہ

"تیغۂ فولادی، دستہ سنگ یشم، مرصع کاری طلا، دانۂ یاقوت چوں دانہ ہاے زمرد کوچک سفید، دانہ ہائے یاقوت پیوستہ خانہ و دو خانہ خالی و یک پیوستہ طلا" ۲۱ے

گھوڑے کا چہرہ

"اسپِ سرنگ دور کابہ و چار سال، سیاہ چشم، شاہ گام، داغ سنگ ریزہ بر کلا جانب راست و داغ سفید مقدار برگِ پان بر پیشانی و مقدار دو انگشت متصل سم پائے راست پیشین و داغ سین بر کفل جانب چپ" ۲۲ے

سید اسرار حسین خاں نے اپنی کتاب "قدیم ہنر و ہنرمندان اودھ" میں اودھ کے مندرجۂ ذیل مشہور سپہ گروں کا ذکر کیا ہے :

۱۔ مرزا محمد امیر خیرآبادی (بانک)، ۲۔ مرزا ذوالفقار بیگ (لکڑی، بنوٹ)، ۳۔ بھوانی سنگھ چھتری (لکڑی)، ۴۔ محمد خاں (بانا، پٹا)، ۵۔ بادل خاں (بانا، پٹا)، ۶۔ سردار سنگھ چندیر (بانا، پٹا)، ۷۔ شیخ محمد مہدی (بانک)، ۸۔ میر لنگرباز (رستم خانی)، ۹۔ میر نجم الدین (لکڑی)، ۱۰۔ میر علی (پھکیت)، ۱۱۔ اصالت خاں بکیت، ۱۲۔ خلیفہ ملھے پٹیت ۱۳۔ گوری پٹے باز ۱۴۔ میر فضل علی (بانک)، ۱۵۔ منصور علی خاں (بانک)، ۱۶۔ یحییٰ خاں (بانک، رستم خانی)، ۱۷۔ نواب فتح یاب خاں (رستم خانی) ۱۸۔ شیخ نجم الدین (بانک)، ۱۹۔ ولی محمد خاں (بانک)، ۲۰۔ میر بہادر علی (بانک)، ۲۱۔ میر جعفر علی (بانک)، ۲۲۔ محمد مہدی (بنوٹ)، ۲۳۔ محمد علی خاں (علی مد)، ۲۴۔ مرزا احمد بیگ کٹیا کٹیا (تلوار)، ۲۵۔ میر ولایت علی ڈنڈا توڑ (پٹا)، ۲۶۔ وزیر علی فرزند آصف الدولہ، ۲۷۔ میر عشرت علی (پھکیت)، ۲۸۔ شیخ ببر تنا (پھکیت)، ۲۹۔ مرزا حبیب (بانک وغیرہ) ۳۰۔ بھوانی بخش دریا بادی (کشتی)، ۳۱۔ سید مشرف علی عرف جھنڈا میاں (کشتی)، ۳۲۔ مہاراجا ڈگبجے سنگھ (نیزہ بازی وغیرہ)، ۳۳۔ میر کلو (نیزہ بازی)، ۳۴۔ میر اکبر علی (نیزہ بازی)، ۳۵۔ نواب قائم خاں بنگش (نیزہ بازی)، ۳۶۔ طالب شیر خاں (تلوار)، ۳۷۔ فیض بخش (تیر اندازی)، ۳۸۔ نواب آصف الدولہ (تیر اندازی وغیرہ)، ۳۹۔ نواب علی محمد خاں روہیلہ (تیر اندازی)، ۴۰۔ ہادی یار خاں (تیر اندازی)، ۴۱۔ میرن صاحب پنج بھیجے (بندوق)، ۴۲۔ ٹھاکر فضل علی خاں (بندوق)، ۴۳۔ نواب جہاں پناہ محل (بندوق، شہ سواری)، ۴۴۔ شہزادی سمان آرا بیگم (شہ سواری، بندوق) ۴۵۔ پرنس مرزا محمد سکندر قدر تیموری (بندوق)، ۴۶۔ حکیم محمد رشید فتح پوری (بندوق)، ۴۷۔ راجا محمد کاظم حسین خاں (طپنچہ)، ۴۸۔ نواب سعادت علی خاں (شہ سواری)، ۴۹۔ نواب حیدر خاں بنگش (شہ سواری)، ۵۰۔ فتح خاں (شہ سواری)، ۵۱۔ دلاور خاں (شہ سواری)، ۵۲۔ نواب علی نقی خاں وزیر اودھ (نیزہ بازی، شہ سواری)، ۵۳۔ رجب خاں (شہ سواری)، ۵۴۔ شیخ ببر علی (شہ سواری)، ۵۵۔ ممن خاں (شہ سواری)، ۵۶۔ سید صادق حسین (شہ سواری)، ۵۷۔ پورن لکھنوی (شہ سواری)، ۵۸۔ پہاڑ خاں لکھنوی (شہ سواری) ۵۹۔ سلطان العلما مولانا سید محمد مجتہد (شہ سواری وغیرہ) ۲۳ے

اودھ میں سپہ گری کے اخلاقی ضابطے بھی تھے۔ اچھا سپہ گر بالعموم
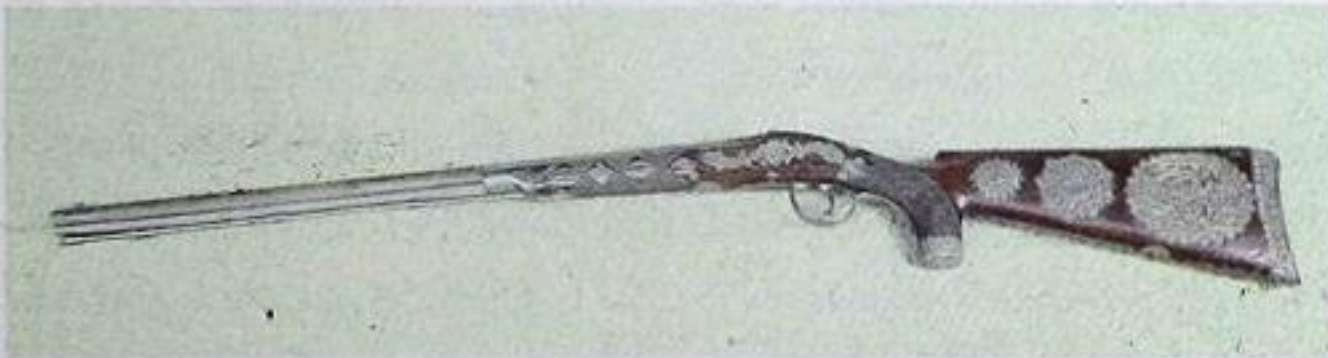
خوش اخلاق، منکسر مزاج، غصّہ کو ضبط کرنے والا اور مظلوموں کا حمایتی ہوتا تھا۔ اد عائیت اور اپنے کمال کو جتانا اوچھا پن سمجھا جاتا تھا۔ خصوصاً بنوٹ کے ماہر اپنی وضع قطع یا کسی بھی ادا سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ اس فن میں دخل رکھتے ہیں۔ یہ دیکھنے میں ثقہ اور سیدھے سادے لوگ ہوتے تھے، ہتھیار کے نام پر رومال میں بندھا ہوا پیسا یا تسبیح میں ایک بڑا دانہ لوہے کا رکھتے تھے اور اپنے فن کا استعمال صرف اسی وقت کرتے تھے جب زندگی اور موت کا سوال پیدا ہو جائے۔ ایسے موقعوں پر خاموشی کے ساتھ پیسے یا تسبیح کے دانے کی ایک ہلکی سی ضرب سے حریف کو مفلوج بلکہ ہلاک تک کر دیتے تھے اور گردن جھکائے ہوئے آگے بڑھ جاتے تھے۔

اودھ کے سپہ گروں کی بہادری اور اعلیٰ ظرفی کے بہت سے واقعات مشہور ہیں۔ کچھ لکھے بھی گئے ہیں۔ مثلاً کتاب "وضع دارانِ لکھنؤ" میں مفتی گنج کے میر مصطفےٰ حسین خاں کا واقعہ لکھا ہے کہ انتزاع سلطنت اودھ سے کچھ پہلے ایک دن چوک میں ان سے کچھ لوگوں سے تکرار ہو گئی۔ بات اتنی بڑھی کہ تلواریں نکل آئیں۔ میر مصطفےٰ حسین تن تنہا اس پوری جماعت کے مقابلے پر ڈٹ گئے، لیکن مخالف جماعت کے ایک صاحب نے کہا "بھئی ایک سے ایک ہی کو لڑنا چاہیے" اور خود میر صاحب کے مقابلے پر آ گئے۔ لڑائی میں میر صاحب زخمی ہو کر گر گئے۔ اس عرصے میں وزیر اودھ نواب علی نقی خاں کے بہنوئی محمود حسین خاں کو اس فوجداری کی خبر ہو گئی۔ وہ میر مصطفےٰ حسین خاں کے عزیز ہوتے تھے، فوراً ہاتھی پر سوار ہو کر سپاہیوں کی ایک پلٹن لیے ہوئے موقع واردات پر آ پہونچے لیکن میر صاحب نے انھیں کوئی کارروائی کرنے سے روک دیا اور کہا کہ مجھ سے صرف ایک آدمی نے مقابلہ کیا ہے۔ اچھا ہو جاؤں گا تو خود اس سے بدلا لوں گا۔ اگر اس وقت تم لوگوں نے مداخلت کی تو مجھے ایسا صدمہ پہونچے گا کہ زندہ نہ بچوں گا۔

"آخر یہ لوگ حریفوں سے بغیر کچھ باز پرس کیے، میر مصطفےٰ حسین خاں کو گھر اُٹھا لائے۔ ابھی وہ اچھے بھی نہ ہونے پائے تھے کہ مخالف صاحب مزاج پرسی کے لیے تشریف لائے..... بعد صحت کے پردہ ہوا۔ میر صاحب کے پاس بیٹھ گئے اور مزاج پرسی کی۔ میر صاحب نے جواب دیا کہ اب اچھا ہوں اور ان شاء اللہ ایک ہفتے میں صحتِ کلی ہو جائے گی، پھر میرے آپ کے مقابلہ ہوگا۔ حریف صاحب نے کہا کہ بھائی اب تو میں تمھاری بہادری اور منصف مزاجی کا قائل ہو چکا۔ تم پر میرا ہاتھ نہیں اُٹھ سکتا، یہ کہہ کر رخصت ہوئے۔ بعد غسلِ صحت خود میر صاحب اُن کے مکان پر گئے اور بہت کچھ تانا، لیکن انھوں نے سوائے سر جھکا دینے کے کوئی جواب نہ دیا۔ ہمیشہ یہی کہا کیے کہ یہ سر حاضر ہے، میں تو آپ کو بھائی کہہ چکا۔ آخر میر صاحب نے بھی بھائی کہہ کر گلے سے لگا لیا اور جب تک زندہ رہے بھائی ہی سمجھتے رہے"۔ [۲۳]

گزشتہ سطور میں استاد سیّد مبارک حسین اور ان کی کتاب "فنِ سپہ گری" کا ذکر آیا ہے۔ لکھنؤ میں سپہ گری کے واقف کاروں کا کہنا تھا کہ عہد شاہی میں بھی، جب سپہ گری کا دورِ عروج تھا، مبارک حسین صاحب کا سا کامل استاد شاید ہی کوئی ہوا ہو۔ اُستاد سپہ گری کے قریب قریب سب شعبوں میں منتہی کا درجہ رکھتے تھے۔ وہ چھوٹے قد اور ہلکے ڈیل ڈول کے آدمی تھے اس لیے بھاری گُرز اور بڑا کھانڈا تو شاید نہ چلا سکتے ہوں، باقی تمام ہتھیاروں کے استعمال پر انھیں پوری قدرت حاصل تھی۔ میرے چچا ڈاکٹر سید آفاق حسین رضوی صاحب نے گھر پر ایک ورزش خانہ اور اکھاڑا بنا رکھا تھا جہاں شریف نوجوانوں کو کسرت کرانے کے علاوہ سپہ گری اور کشتی سکھائی جاتی تھی۔ عمدہ قسم کے ہتھیار بھی بہت سے تھے (جو ۱۹۴۷ء کے بعد اسلحہ پر پابندیوں کی وجہ سے زمین میں دفن کر دیے گئے اور زنگ انھیں کھا گیا) یہاں استاد مبارک حسین بھی تعلیم دینے آتے تھے اور میں نے اس زمانے میں ان کے ایسے ایسے کمالات دیکھے ہیں کہ آج ان پر یقین کرنا مشکل ہے۔ استاد کا تفصیلی تذکرہ ان شاء اللہ کسی علاحدہ مضمون میں کیا جائے گا۔ یہاں صرف دو تین واقعات درج کیے جاتے ہیں:

ایک بار کسی دوسرے شہر کے ایک صاحب سجّادہ بزرگ اپنے مریدوں کے ساتھ لکھنؤ تشریف لائے۔ ان کو سپہ گری کا ایسا ذوق تھا کہ اُسی

شخص کو مُرید نہیں کرتے تھے جو اس فن میں کسی شعبے سے عملی واقفیت نہ رکھتا ہو۔ انھوں نے لکھنؤ کے کسی سپہ گر کا کمال دیکھنے کی خواہش کی۔ ان کو اُستاد مُبارک حسین کا نام بتایا گیا، اور ہمارے ہی گھر پر استاد کا مظاہرہ قرار پایا۔ شاہ صاحب اپنے آٹھ دس مُریدوں کے ساتھ تشریف لائے۔ اُستاد نے ان سے پوچھا: آپ کو زیادہ دل چسپی کس ہتھیار سے ہے؟ شاہ صاحب نے نیزے کا نام لیا اور بتایا کہ ان کے سب مُرید نیزہ بازی سے واقف ہیں۔ اُستاد نے سب مُریدوں کو ایک ایک لاٹھی تقسیم کرادی اور کہا کہ لاٹھیوں کو نیزوں کی طرح استعمال کیجیے۔ میں خود چوٹ نہیں کروں گا، لیکن آپ لوگ اس کا خیال رکھیے گا کہ آپ کے ہاتھ سے آپ کا کوئی ساتھی چوٹ نہ کھائے۔ اس کے بعد اُستاد خالی ہاتھ دیوار سے پیٹھ لگا کر کھڑے ہو گئے۔ مُریدوں نے حملہ کیا۔ اُستاد بجلی کی طرح چمکے۔ کئی لاٹھیاں دیوار پر پڑکر رہ گئیں، ایک حریف کی لاٹھی اُستاد کے ہاتھ میں نظر آئی اور خود اس حریف کی گردن میں ہاتھ ڈال کر انھوں نے پیچھے کی طرف اس طرح جھکایا کہ وہ بے دست و پا ہو کر رہ گیا اور استاد اس کے پیچھے تقریباً چھپ گئے۔ حریفوں نے دوبارہ حملہ کیا تو کچھ کے سامنے یہ انسانی ڈھال آگئی اور کچھ کے وار اُستاد نے اپنی چھینی ہوئی لاٹھی سے کاٹ دیے۔ اس کے بعد استاد نے اس حریف کو چھوڑ کر لاٹھی اسے واپس کردی اور کہا کہ ابھی تک میری پشت پر دیوار کی حفاظت تھی، اب میں کھلے میں نہتا آتا ہوں، اور دیوار کے پاس سے ہٹ کر بیچ احاطے میں کھڑے ہو گئے۔ اب حریفوں نے ان کو ہر طرف سے گھیر کر ایک ساتھ حملہ کیا۔ استاد پھر بجلی کی طرح چمکے اور آناً فاناً ان کے ہاتھوں میں دو حریفوں کی گردنیں آگئیں۔ ایک پہلے کی طرح ان کے سامنے اور دوسرا ان کی پیٹھ پر ڈھال بن گیا۔ اُستاد نے آواز لگائی:

"خیال رہے یہ دونوں آپ کے آدمی ہیں۔"

اس کے بعد استاد پر جتنے وار ہوئے ان کے نشانے پر یہی دونوں آدمی آتے اور حریفوں کا ہاتھ رُک جاتا۔ شاہ صاحب کو یہ مظاہرہ اتنا پسند آیا کہ انھوں نے اپنے گلے سے نگوں کی ایک مالا اُتار کر اُستاد کو پہنادی، اعتراف کیا کہ ایسا باکمال انھوں نے ہندستان بھر میں کہیں نہیں دیکھا اور فرمائش کی کہ استاد ان کی خانقاہ میں رہ کر ان کے مُریدوں کو کچھ سکھائیں۔

علی ظہیر عُرف پیارے جانی لکھنؤ کے نامی زور آور تھے۔ وہ ہمارے یہاں ورزش کرنے آتے تھے اور ان کے بارے میں مشہور تھا کہ ایک بھینسے کے برابر قوت رکھتے ہیں۔ ایک بار اُستاد نے ان کے ہاتھ میں خنجر دے کر اس کی دھار چٹکی سے پکڑ لی اور کہا کہ خنجر کو میرے ہاتھ سے چھڑا لو۔ پیارے جانی نے خنجر کو طرح طرح سے جھٹکے دیے، اُستاد کے ہاتھ کو مروڑنے کی کوشش کی، یہاں تک کہ جس طرح دھوبی کپڑے کو پھٹکتے ہیں اسی طرح استاد کو پھٹکنے لگے لیکن خنجر کو ان کی چٹکی سے چھڑا نہیں سکے۔

استاد مبارک حسین نے لمبی عُمر پاکر انتقال کیا۔ بڑھاپے میں ان کی صحت خراب اور بینائی بہت کمزور ہو گئی تھی۔ اُسی زمانے میں ایک دن جھٹ پٹے کے وقت ہم لوگوں نے دیکھا کہ استاد سڑک کے کنارے کھڑے کچھ بڑبڑا رہے ہیں اور ان کے پیروں کے پاس ایک بائیسکل پڑی ہے۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ کسی سائیکل سوار نے ان سے ٹکرا کر انھیں اندھا کہہ دیا تھا۔ اُستاد نے جواب دیا کہ "میں تو واقعی اندھا ہو رہا ہوں۔ تم کو اللہ نے بڑی بڑی آنکھیں دی ہیں، تم نے کیوں نہیں دیکھا کہ بڈھا آدمی راستے میں ہے۔" سوار کو اور غصہ آیا۔ آخر اس نے استاد پر بائیسکل چڑھادی۔ ہم لوگوں نے حیرت سے پوچھا:

"اُستاد، آپ پر بائیسکل چڑھادی؟ پھر کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا۔" استاد نے جواب دیا۔ "بائیسکل یہ پڑی ہے اور خود بدولت اُدھر کپڑے جھاڑ رہے ہیں۔"

اور ہم لوگوں نے دیکھا کہ واقعی سڑک کے دوسرے کنارے پر ایک ہٹا کٹا جوان کھڑا کپڑے جھاڑ رہا ہے۔ پھر وہ لنگڑاتا ہوا ہم لوگوں کی طرف آیا، خاموشی سے بائیسکل اٹھائی اور استاد سے کترا کر نکل گیا۔ استاد نے معلوم نہیں کیا داؤں کیا تھا کہ غریب نے سڑک کے اس پار جا کر پٹخنی کھائی تھی۔

عہد شاہی کے اودھ کی سپہ گرانہ فضا اور فن سپہ گری سے عام واقفیت کا ذکر شروع میں آچکا ہے۔ اس وقت یہاں بہت بڑی تعداد میں ایسے افراد موجود تھے جو انفرادی طور پر اس فن میں درجۂ کمال کو

پہنچے ہوئے تھے لیکن یہ انفرادی کمال اجتماعی قوت کا بدل نہیں بن سکتا تھا۔ ایک بانکا شہر کی فوجداریوں میں دس حریفوں کو ضرور مار گرا سکتا تھا لیکن میدان جنگ میں دو سو بانکے ایک منظم دستے کی طرح یک جان ہو کر دو سو تربیت یافتہ فوجیوں کی پلٹن کو فنا نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے کہ انھیں اجتماعی فوجی تربیت حاصل نہیں تھی۔ شجاع الدولہ کے بعد انگریزوں نے ایک لشکری قوت کی حیثیت سے اودھ کو پنپنے نہیں دیا۔ یہاں کے حکمرانوں کو صرف "بقدر ضرورت" تھوڑی سی فوج اور سامانِ جنگ رکھنے کی اجازت تھی۔ اس صورت میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں پورے ہندستان کی طرح اودھ بھی انگریزوں سے شکست کھا گیا۔ البتہ اس پر تعجب کیا جا سکتا ہے کہ اس جنگ میں انگریزوں کی سب سے سخت مزاحمت اودھ نے کی بلکہ کچھ عرصے کے لئے ان سے اپنی سلطنت واپس چھین کر یہاں برجیس قدر کی حکومت قائم کرا دی۔

اس سلسلے میں اودھ کے آخری حکمراں واجد علی شاہ کا پس پردہ کردار بڑا پُراسرار معلوم ہوتا ہے۔ سلطنت اودھ کا خاتمہ انھیں کے زمانے میں ہوا اس لئے ان کا نام عیش کوشی اور ناکارگی کی علامت بنا دیا گیا۔ لیکن واجد علی شاہ نے تخت نشین ہوتے ہی کوشش شروع کر دی تھیں کہ اودھ کی فوجی قوت انگریزوں سے بڑھ جائے۔ برائے نام فوج رکھنے کے بجائے وہ بڑی تعداد میں سپاہیوں کو بھرتی کرنے لگے۔ وہ خود روزانہ کئی گھنٹے تک ان سپاہیوں کو فوجی مشقیں کراتے تھے۔ آخر گورنر جنرل کو رپورٹ کی گئی کہ بہ قدرِ ضرورت تھوڑے آدمیوں اور سامان کی جگہ اب واجد علی شاہ کی فوج میں چار سو توپیں، پانچ ہزار توپچی، چار ہزار سوار اور چالیس ہزار پیادے ہیں۔ گورنر جنرل نے مداخلت کر کے اس فوج کی تعداد میں بہت تخفیف کرا دی[۲۵]

واجد علی شاہ نے اپنے بعض فوجی دستوں کے عجیب غیر سپاہیانہ نام رکھے تھے مثلاً "ترچھا رسالہ"، "گلابی پلٹن"۔ کچھ کے نام پھولوں پر رکھے مثلاً: داؤدی، جعفری، عباسی۔ ان کے سپاہیوں کی وردیاں بھی عام فوجی لباس کے برخلاف رنگ برنگے مخمل اور بانات وغیرہ کی تھیں۔ فوجی علم بھی خوب رنگین اور زرنگار تھے[۲۵] غرض ان دستوں پر فوج سے زیادہ کسی برات کا دھوکا ہوتا تھا۔ شاید اسی لئے انگریزوں نے ان میں سے کچھ دستوں کو بے ضرر سمجھ کر شاہی ملازمت میں باقی رہنے دیا تھا لیکن اس رنگین پردے کے پیچھے تربیت پانے والے سپاہیوں نے ۱۸۵۷ء میں غیر معمولی حربی لیاقت دکھائی اور اپنی شجاعت اور مہارت سے انگریزوں کو عاجز اور حیران کر دیا۔ واجد علی شاہ نے حبشی سپاہیوں کا بھی ایک دستہ تیار کیا تھا۔ کرنل سلیمن نے گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی کو اودھ میں فوجی مداخلت کا مشورہ دیتے ہوئے اس دستے کا یوں ذکر کیا ہے:

> "سب سے مقدم یہ ہے کہ (واجد علی شاہ کی) حبشیوں کی فوج کو، جو تین سو آدمی ہیں، غیر مسلح کرنا پڑے گا ....
> ان حبشی قاتلوں کی لکھنؤ میں موجودگی سے نہ ریزیڈنٹ اور نہ ریزیڈنسی (کا کوئی رکن) محفوظ ہو گا۔"[۲۶]

ولی عہدی کے زمانے میں واجد علی شاہ نے اپنے پہرے کے لئے تیس عورتوں کو ملازم رکھ کر انھیں فوجی تربیت دی تھی۔ ۱۶ نومبر ۱۸۵۷ء کو سکندر باغ کے خونیں معرکے میں "لیفٹننٹ کرنل گورڈن الگزنڈر نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مقتولین میں کچھ قوی ہیکل حبشنیں تھیں جو جنگلی بلیوں کی طرح لڑی تھیں اور جب تک وہ ہلاک نہ ہو گئیں یہ شبہ بھی نہیں ہوا کہ وہ عورتیں تھیں۔ سارجنٹ فوربس میچل ایک عورت کا ذکر کرتا ہے — جو سکندر باغ کے صحن میں پیپل کے ایک بڑے درخت پر بیٹھی ہوئی کئی انگریز فوجیوں کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنا چکی تھی، اور آخرکار خود بھی گولی سے ہلاک ہوئی۔"[۲۷]

□□

حواشی:

۱۔ شباب لکھنؤ (ترجمۂ پرائیویٹ لائف آف این ایسٹرن کنگ: ولیم نائٹن) ترجمۂ محمد احد علی۔ الناظر پریس لکھنؤ ۱۹۱۲ء ص ۲۰۳

۲۔ انشائے سرور: مرزا رجب علی بیگ سرور۔ مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۹۱۶ء رقعہ ۴۹

۳۔ رجب علی بیگ سرور: نیر مسعود۔ شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی ۱۹۶۷ء ص ۸۵

۴۔ آب حیات: محمد حسین آزاد۔ آزاد بکڈپو لاہور ص ۶۵-۳۶۴

۵۔ گویا۔ صاحب سیف و قلم: جعفر ملیح آبادی: ناشر مصنف، لکھنؤ ۱۹۶۸ء ص ۱۰۶

۶۔ تاریخ اودھ (حصہ چہارم) نجم الغنی۔ مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۹۱۹ء ص ۷۱-۲۷۰

۷۔ حیات انیس: امجد علی اشہری۔ مطبع آگرہ اخبار، آگرہ ۱۳۴۳ھ ص [illegible]

پروفیسر جعفر رضا
صدر شعبۂ اُردو، الٰہ آباد یونیورسٹی

اودھ میں عزاداری

ہندوستان میں عزاداری کا اہم ترین مرکز اودھ رہا ہے۔ اودھ میں عزاداری کو دہلی یا دکن کے مقابلہ میں مختلف و متنوع جہات حاصل ہوئے۔ انھیں حکمرانوں کے علاوہ عوامی سطح پر بھی مقبولیت حاصل ہوئی۔ سماج کے مختلف طبقوں کے لوگ اپنے طور پر عزاداری کرتے، جن میں کسی خاص عقیدہ کی پابندی ضروری نہیں تھی۔ اہل اسلام ہی نہیں غیر مسلموں میں بھی انتہائی خلوص و عقیدت سے عزاداری کا رواج تھا۔ اودھ میں عزاداری کو قومی شناخت حاصل تھی۔ محرم کا چاند دیکھتے ہی عزاداری کا آغاز ہو جاتا اور دسویں محرم کو تکمیل کو پہنچتا۔ نوابینِ اودھ نے ایامِ عزا کو سرکاری تعطیل قرار دے دیا تھا۔ اس دوران کسی طرح کی تقریبات مسرت منعقد کرنے کی ممانعت تھی[1]۔ اس اجمال کی تفصیل جاننے کے لیے ذیل میں بعض حقایق پر توجہ کی جاسکتی ہے۔

شمالی ہند میں تبرکاتِ عزا کے طور پر علم حسینی برآمد کرنے کا سلسلہ حضرت شاہ اشرف جہانگیر سمنانیؒ سے شروع ہوتا ہے۔ انھوں نے پہلی بار محرم کے موقع پر علم حسینی برآمد کیا اور اس کے زیر سایہ قیام کیا۔ ان کا دستور تھا کہ سبزوار کے طریقے پر علم اور زنبیل تیار کرتے۔ زنبیل کے ساتھ سادات اور متقی و پرہیزگار لوگوں کو اطراف و جوانب میں بھیجتے۔ بسا اوقات یہ فرض اپنے خلیفۂ ارشد حضرت شاہ سید علی قلندرؒ کے سپرد کرتے[2]۔ حضرت شاہ سمنانیؒ ۱۳۸۰ء میں ہندوستان تشریف لائے۔ اس طرح علم برآمد کرنے کا سلسلہ اس کے گرد و پیش شروع ہوا ہوگا۔ ان کے ملفوظات[3] میں درج ہے کہ موصوف درمیان عشرہ محرم اچھا لباس زیب تن نہیں کرتے تھے، کسی تقریب مسرت میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ آٹھویں اور دسویں محرم کے درمیان کی تاریخوں میں آرام ترک کر دیتے تھے۔ تیس برس تک، خواہ سفر میں ہوں یا حضر میں کبھی غم حسینؑ سے غافل نہیں ہوئے۔

اودھ میں عزاداری کی ابتدا فیض آباد کی مشہور بابری مسجد کے چبوترے سے ہوئی۔ عشرۂ محرم کے دوران مسجد کے چبوترے پر ایک تعزیہ بنا کر رکھا، جس کے بعد فیض آباد میں عزاداری شروع ہوگئی ہے[4] لیکن یہ صرف نقش اولیں تھا۔ عزاداری کا باقاعدہ رواج اس وقت ہوا کہ جب فیض آباد میں پہلا امام باڑہ نواب صفدر جنگ کی اہلیہ صدر جہاں بیگم نے شہر کے مشہور موتی باغ کے عقب میں ۱۷۴۴ء میں تعمیر کرایا اور اسی سے ملحق ایک مسجد بھی تعمیر کرائی[5]۔ یہ عمارتیں ہنوز موجود نہیں۔ فیض آباد میں دوسرا امام باڑہ شجاع الدولہ کی اہلیہ بہو بیگم کا تعمیر کردہ ہے جس کی شہ نشین اور دیواریں عظمت پارینہ کی داستان کہتی ہیں۔ شجاع الدولہ نے بیاد تشنگان کربلا سبیل تعمیر کرائی جرأت نے تاریخ کہی:

پانی جو اس کا قاسم کوثر کو ہے نثار
جو پیوے اس کو ہر دو جہاں میں سبیل ہے
جرأت نے کی جو فکر میں تاریخ چاہ کی
آئی ندا کہ "ذکرِ حسینی سبیل ہے"

۱۱۷۵ھ (مطابق ۱۷۶۱ء)[6]

نواب شجاع الدولہ کو عزاداری سے خصوصی شغف تھا۔ اگر کسی جنگی مہم کے دوران عشرہ محرم پڑ جاتا تو ایام عزا میں جنگ کو ملتوی رکھتے۔ فوجی خیموں میں مجلس عزا ہوتی۔ سپاہی تعزیے بنانے کے لیے بانس اپنے ساتھ لے جاتے[7]۔ ایک بار ۱۷۶۰ء میں پانی پت کی مہم درپیش ہونے کی بنا پر شجاع الدولہ کا قیام نواح

دہلی میں تھا کہ محرم شروع ہوگیا۔ موصوف سیاہ پوش ہوگئے۔ دیگر ماتم داروں کے ہمراہ علم بردوش، سروپا برہنہ ماتم کرتے ہوئے احمد شاہ کی قیام گاہ کے سامنے سے گزرے۔ اس واقعہ کا بیان سید غلام علی خاں کی زبانی سنیے

"سیہ پوش شدن نواب والاقدر است در محرم الحرام و گذشتن باجماعہ سیہ پوشان از پیش درخانہ بادشاہی بایں ہیہات کہ ہر یک از انہا سروپا برہنہ علم بردوش گرفتہ سر و سینہ می زد۔ نواب ہم بہمیں صورت شریک حال شان بود۔"[۵۵]

نواب شجاع الدولہ کے مقربین میں نواب سرفراز الدولہ حسن رضا خاں کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ حسن رضا خاں کو عزاداری سے جذباتی وابستگی تھی۔ اولاً اپنے مکان پر مجالس عزا منعقد کرتے رہے بعدہٗ ایک عالی شان امام باڑہ تعمیر کرایا جو زیارت گاہ خاص و عام بن گیا۔ قیام فیض آباد کے دوران عزاداری میں منہمک رہتے۔ ان کا معمول تھا کہ روزانہ بعد نماز پنجگانہ امام باڑے میں ضریح کے سامنے زیارت پڑھتے۔ مرزا سودا نے امام باڑہ میں علم استادہ کرنے کی تاریخ کہی:

چل قلم کہہ حسن رضا خاں نے | درِ دولت سرا جو تیرا ہے
ہے عجب طرح کی زیارت گاہ | جس سے تحصیلِ دین و دنیا ہے
یاں علم نذرِ حضرتِ عباسؑ | صدقِ دل سے ترا جو برپا ہے
اے خوشا حال وہ کہ اس سے نذر | مخلصی آخرت کی سمجھا ہے

سال تاریخ اس علم کی ہے یہ
سر ترے سایہ اس علم کا ہے[۵۹]

اس دور کے فیض آباد میں جواہر علی خاں خواجہ سرا کی بدولت عزاداری میں خصوصی رونق پیدا ہوئی۔ جواہر علی خاں طبعاً مذہبی تھے۔ انھیں کی کوششوں سے فیض آباد میں باجماعت نماز جمعہ کا رواج ہوا حالانکہ نواب شجاع الدولہ کا حکم تھا کہ نماز باجماعت پڑھی جائے لیکن یاران طریقت عذر پیدا کرلیتے۔ جواہر علی خاں نے نماز پڑھنے پر آمادہ کرنے کے لیے ایک دستہ ترتیب دیا جو لوگوں کو نماز پنجگانہ کے وقت مسجد میں لے آتے تھے۔ موصوف بہو بیگم کے خزانے کے وزیر تھے جو انھیں نواب ناظر کہتی تھیں اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتی تھیں۔ جواہر علی خاں نے ایک امام باڑہ تعمیر کیا تھا جس میں بڑے جوش و خروش سے عزاداری کرتے۔ ان کے انتقال کے بعد داراب علی خاں نے امام باڑہ کی توسیع کی اور عمارت کو پختہ کردیا۔ یہ امام باڑہ آج بھی موجود ہے اور اس میں عزاداری ہوتی ہے۔

نواب آصف الدولہ نے اودھ کا دارالسلطنت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کیا تو عزاداری کی رونق سمٹ کر لکھنؤ آگئی، حالانکہ بہو بیگم کی موجودگی کی بنا پر فیض آباد میں قدیم روایات کے مطابق عزاداری ہوتی رہی، جسے کسی طرح کے زوال کا شکار نہیں ہونا پڑا لیکن لکھنؤ کی بات ہی کچھ اور تھی۔ آصف الدولہ نے اپنے دست مبارک سے سرزمین لکھنؤ میں نہال عزاداری نصب کر کے خلوص و محبت سے اس طرح سیراب کیا کہ وہ تناور درخت بن گیا۔ موصوف نے لکھنؤ کے باہر دوسرے اضلاع میں عزاداری کے لیے کئی املاک وقف کیے۔ طوالت کے خیال سے ان کا ذکر نہیں کیا جارہا ہے حالانکہ بعد میں آصف الدولہ کی سی بات نہیں رہی مگر عزاداری سے اودھ کے ہر حکمراں کو زیادہ سے زیادہ دلچسپی تھی اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے، نتیجے میں عزاداری کو لکھنؤ میں ایسا عروج حاصل ہوا کہ شاید و باید۔ اس اجمال کی تفصیل کے لیے لکھنؤ کے امام باڑوں کی سیر کی جاسکتی ہے، جو اپنی کہانی خود کہہ دیں گے کہ اتنے شاندار امام باڑوں میں کتنی عظیم الشان عزاداری ہوتی رہی ہوگی ان میں شاہی امام باڑے ہیں۔ امرا اور روسا کے امام باڑے ہیں، بیگمات کے امام باڑے ہیں، عوام کے امام باڑے ہیں، مسلمانوں میں دونوں فرقوں کے امام باڑے ہیں، غیر مسلموں کے امام باڑے ہیں۔ ان کی تعداد کا صحیح اندازہ لگانا ممکن نہیں کیوں کہ لکھنؤ میں گھر گھر امام باڑے رہے ہیں جن میں علم و تعزیے استادہ کیے جاتے۔ بعد محرم انھیں ایک جگہ دفن کر دیتے، جنھیں کربلا کہا جاتا ہے۔

امام باڑہ آصفی کو نواب آصف الدولہ کے عزاداری سے غیر معمولی شغف کا مظہر قرار دیا جاسکتا ہے، جو لکھنؤ میں ان کا تعمیر کردہ عظیم الشان امام باڑہ ہے، جو اودھ کے تہذیبی و ثقافتی ورثہ کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے۔ اس امام باڑہ کی تعمیر کے لیے نواب موصوف نے خصوصی اہتمام کیا تھا۔ ماہرین سے نقشے طلب کیے۔ کفایت اللہ کا تیار کردہ نقشہ پسند خاطر ہوا۔ اس کے اعتبار سے تعمیر کا کام شروع ہوا۔[۶۰] اتفاق سے اودھ ۱۱۹۹ھ (۸۵-۱۷۸۴ء) میں زبردست قحط کا شکار ہوگیا۔[۶۱] تعمیر امام باڑہ کا سلسلہ دن کے علاوہ رات میں بھی جاری رہتا۔ عام لوگ دن میں مزدوری کرتے اور رات کی تاریکی میں غریب و فاقہ کش شرفائے شہر۔ یہ امام باڑہ دس سال کی

مدت میں ۵۰ لاکھ روپیے کی لاگت سے ۱۲۰۵ھ (۹۰-۱۷۹۰ء) میں مکمل ہوا۔[۱۲] دالان کا طول ۱۸۰ فٹ عرض ۹۰ فٹ اور چھت ۱۲۰ فٹ چوڑی بالکل لداؤ کی بنی ہوئی بے ستون استادہ ہے۔ ہم عصر مورخ مرتضیٰ حسین بلگرامی لکھتے ہیں:

"ہیچ ملک را از املاک ہفت اقلیم بانی آں در رفعت و متانت وسعت پیدا نیست"۔[۱۳]

ایک یورپی سیاح ڈبلو ہیر نے اس امام باڑہ کو دیکھا تو مبہوت رہ گیا لکھتا ہے کہ:

"میں نے اس سے بہتر کسی دوسری عمارت کا نقشہ نہیں دیکھا جو اتنے نفاست، تنوع، تناسب اور خوش ذوقی کے اصولوں پر تیار کیا گیا ہو"۔[۱۴]

میرزا ابوطالب لندنی امام باڑہ آصفی کے ساز و سامان کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"اب تک ہر سال چار پانچ لاکھ روپے امام باڑہ کی آرائش پر صرف ہوتا ہے۔ سیکڑوں چھوٹے بڑے، سونے اور چاندی کے تعزیے بنائے گئے اور اس قدر کانچ کے جھاڑ فانوس اور سونے چاندی کی سادہ و رنگین قندیلیں خریدیں کہ جن کا حساب شمار سے باہر ہے۔ چنانچہ اس کشادگی کے باوجود دالان چھت سے زمین تک بھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس طرح اس کی صفائی کرنے والوں کو اپنے کام میں دشواری ہوتی ہے اور تعزیہ داروں کی آمد و رفت کے لیے مشکل سے جگہ نکل پاتی ہے۔ اس کے باوجود وزیر کا دل نہیں بھرا۔ جس وقت ڈاکٹر بلین ولایت (لندن) جا رہے تھے تو نواب نے کانچ کے دو تعزیوں کی فرمائش کی جو جھاڑ فانوس اور دیگر لوازمات کے ساتھ ایک سرخ اور ایک سبز رنگ کا ہو۔ ایک لاکھ روپے اس کی قیمت مقرر ہوئی۔ ۱۲۱۱ھ (۹۷-۱۷۹۶ء) میں ایک تعزیہ موصول ہوا اور دوسرا اگلے سال آنا طے ہوا"۔[۱۵]

بدقسمتی سے اگلے سال نواب موصوف کا انتقال ہو گیا اس لیے کہنا دشوار ہے کہ دوسرا تعزیہ لندن سے آیا بھی یا نہیں۔ امام باڑہ آصفی کے زیب و زینت کے متعلق اسی طرح کے بیانات مورخین میں سید عبداللطیف خاں شوستری،[۱۶] مرزا محمد کاظم[۱۷] وغیرہ نے کیا ہے لیکن سب کچھ لٹ چکا ہے ان تبرکات میں محض صندل کا ایک تعزیہ اور چند جھاڑ فانوس باقی رہ گئے ہیں، جو امام عزا میں استادہ کر دیئے جاتے ہیں۔

درگاہ حضرت عباس کی پہلی تعمیر دور آصفی میں ہوئی۔ روایت ہے کہ باشندۂ منصور نگر (لکھنؤ) صوفی درویش مرزا فقیر بیگ کو حج کے موقع پر خواب میں بشارت ہوئی کہ لکھنؤ جا کر درگاہ حضرت عباس کی تعمیر کریں۔ انھوں نے لکھنؤ واپس آکر نواب آصف الدولہ کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ بیان کیا۔ کئی مورخوں[۱۸] کا بیان ہے کہ آصف الدولہ نے درگاہ کے لیے اینٹوں کا گنبد تعمیر کرایا، ایک ہزار روپے انتظامات کے لیے عطا کیے اور وہاں ایک علم نذر کیا۔ حاجت مندوں نے حاضری شروع کر دی۔ درگاہ کی دوسری تعمیر اور توسیع نواب سعادت علی خاں کے ہاتھوں ہوئی۔ انھوں نے فرش و فروش، جھاڑ فانوس و دیگر آلات شیشہ، چاندی کا منبر، چاندی کا صندوق اور سونے چاندی کے علم استادہ کیے ۱۲۱۷ھ (۱۸۰۲ء) میں طلائی گنبد تعمیر کرایا۔ بارہ اماموں کے نام سے بارہ دروازے تعمیر کرائے۔ مرزا محمد حسن قتیل نے تاریخ کہی: ع

"ایں جدید بنائے سعادت است"

۱۲۱۷ھ

غازی الدین حیدر نے درگاہ میں نقار خانہ بلند تعمیر کرایا، نوبت اور گھڑیال لگائے۔ دیگر سامان آرائش کے علاوہ اندرون درگاہ چاندی کا دروازہ بنوایا اور چاندی کا منبر نذر کیا۔ عہد نصیر الدین حیدر میں ملکہ زمانیہ نے درگاہ کا باورچی خانہ بنوایا۔ انتزاع سلطنت اودھ کے بعد ہجرت کے وقت واجد علی شاہ نے اپنی تلوار اور تاج درگاہ پر نذر کر دی۔ غدر کی لوٹ میں سب کچھ جاتا رہا۔ درگاہ بھی نزول میں آگئی۔ شرف الدولہ غلام رضا نے نزول سے واگذاری کرائی اور کچھ سامان نذر کیا۔

عزاداری سے متعلق متذکرہ بالا تفصیلات کی توثیق دربار آصفی کے منتخب خبر نامہ "انتخاب اخبار نواب وزیر بہادر و انتخاب دربار معلی و اطراف" سے ہوتی ہے، جس کی دو جلدیں رائل ایشیاٹک سوسائٹی گریٹ برٹین اینڈ آئرلینڈ، لندن میں محفوظ ہیں۔[۱۹] ان میں ۲۸، ذی الحجہ ۱۲۰۸ھ (۲۷ جولائی ۱۷۹۴ء) سے ربیع الثانی ۱۲۱۰ھ (نومبر ۱۷۹۶ء) تک کے دربار آصفی کے حالات اور آصف الدولہ کے کوائف درج ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آصفی امام باڑہ کو عزاداری میں مرکزیت حاصل تھی، لیکن نواب موصوف، بیگمات، امرا و روساء

کے امام باڑوں کے علاوہ سماج کے مختلف طبقوں کے افراد کے امام باڑوں میں بھی شرکت کرتے تھے۔ تعزیوں اور مجالس عزا کا سلسلہ محرم کا چاند دیکھتے ہی شروع ہو جاتا تھا۔ ذیل میں دونوں سال کے محرم کے کوائف کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے:

۲۸ ذی الحجہ ۱۲۰۸ھ (۲۷ جولائی ۱۷۹۴ء): اطلاع دی گئی کہ لکھنؤ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ریذیڈنٹ مسٹر چیری امام باڑہ میں حاضری کے لیے آئے ہیں۔ نواب وزیر نے راجہ جھاؤ لعل کو حکم دیا کہ فوراً جائیں اور مسٹر چیری کو امام باڑہ اور دیگر عمارتیں دکھائیں

۲۹ ذی الحجہ ۱۲۰۸ھ (۲۸ جولائی ۱۷۹۴ء): منجموں نے مطلع کیا کہ آج کی تاریخ میں ہندوؤں کے دوج پڑ رہی ہے۔ چاند دکھائی پڑے گا۔ شام کو چاند دیکھنے کی بہت کوشش کی گئی۔ اطراف و جوانب میں خبر دی گئی کہ اگر کسی نے چاند دیکھا ہو، تو مطلع کرے۔ لوگوں نے واپس آکر بتایا کہ کہیں بھی چاند نہیں دیکھا گیا نواب نے کہا کہ شدید ابر باد کی بنا پر چاند نہیں دیکھا جا سکا۔ انشاء اللہ کل دکھائی دے گا۔ بہر صورت کل ۳۰ ذی الحجہ ہے، جو ماہ کی آخری تاریخ ہے۔ علم، ضریح اور تعزیہ برآمد کرنا درست نہیں۔ ماتم، مرثیہ خوانی اور روضہ خوانی ملتوی رکھی جائے۔ البتہ کل صبح ماتمی تقریبات ہوں گی۔

۳۰ ذی الحجہ ۱۲۰۸ھ (۲۹ جولائی ۱۷۹۴ء): نواب وزیر امام باڑہ تشریف لائے، فاتحہ پڑھا اور جھاڑ فانوس اور آئینے ملاحظہ کیے۔ بعدہٗ محل کو واپس لوٹ گئے۔ مسٹر چیری کے امام باڑہ آنے کے دوسرے اعلان کے بعد تحسین علی خاں کو حکم دیا کہ سیتل سنگھ کا فوجی دستہ ریذیڈنٹ کی خدمت میں سلامی پیش کرے۔ نواب وزیر بہمراہ تحسین علی خاں امام باڑہ تک گئے تاکہ تعزیوں سے متعلق انتظامات کا بہ نفس نفیس معائنہ کر سکیں۔ نواب سرفراز الدولہ بہادر، مہاراجہ ٹکیٹ رائے، راجہ بلاس رائے، راجہ نرمل داس بھی شامل ہو گئے۔ نواب وزیر نے امام باڑہ میں مسٹر چیری سے گفتگو کی۔ نواب نے تحسین علی خاں کو مطلع کیا کہ گورنر جنرل سر جان شور کلکتہ سے لکھنؤ کے لیے روانہ ہو چکے ہیں۔ بعد عاشورہ نواب وزیر بہ نفس نفیس ان کے استقبال کے لیے شہر کے باہر تک جائیں گے۔ راجہ بھوانی مشرا نے تعزیہ پر نذر کے لیے اصلی زردوزی کے تبرکات پیش کیے۔ نواب نے انھیں پگڑی، دوشالہ، کان کے بالے، کمر بند اور چہار پارچہ خلعت سے نوازا۔ نواب نے تحسین علی خاں کو حکم دیا کہ فوج دار خاں کو تعزیہ کی تیاری کے لیے پانچ ہزار روپے مرحمت کیے جائیں۔ غروب آفتاب کے قبل نواب وزیر نے غسل کیا، سیاہ ماتمی عمامہ زیب تن کیا تاکہ امام حسن و امام حسین کی یاد منا سکیں انھوں نے چائے نوش کیا پھر مرثیہ خواں اور روضہ خواں طلب کیے گئے۔ خاص امرا کو باریابی عطا ہوئی۔ تحسین علی خاں کو مرثیہ خوانوں کے لیے بارہ دوشالے اور ایک بڑی رقم روضہ خوانوں کے لیے مرحمت ہوئی۔ بعدہٗ نواب وزیر اپنے محل سرا سے جانب امام باڑہ پا پیادہ گئے۔ برج طلائی کے نزدیک گھوڑے پر سوار ہوئے اور امام باڑہ کے دروازے پر اترے۔ طلائی علم اور پنجے تیار تھے۔ نواب امام باڑہ میں داخل ہوئے تو فوجی باجوں نے ماتمی دھن بجائی۔ نواب نے تعزیوں پر فاتحہ پڑھا اور اس کے گرد چکر لگایا۔ روضہ خوانی اور مرثیہ خوانی کے لیے حکم ہوا۔ مجلس کے بعد تحسین علی خاں کو حکم ہوا کہ مرثیہ خوانوں کو دوشالے اور روضہ خوانوں کو پانچ سو روپے فی کس دیئے جائیں۔ آدھی رات کے بعد نواب وزیر محل سرا کو لوٹ گئے امرا اور روسا بھی اپنے گھروں کو گئے۔ نواب وزیر نے محل سرا میں روضہ خوانوں کو طلب کیا۔ انھوں نے خوش گلوئی سے دردناک واقعات بیان کیے۔ موصوف نے دلی طور پر پسند کیا اور انھیں مزید پانچ پانچ سو روپے عطا کیے۔

یکم محرم ۱۲۰۹ھ (۳۰ جولائی ۱۷۹۴ء): نواب وزیر علی الصباح بیدار ہوئے، غسل کیا، لباس تبدیل کیا اور چائے نوش کی۔ سہ درہ محل میں پیپل کے پیڑ کے نیچے بیٹھ گئے (ضروری امور سے متعلق احکامات دیئے)۔ گھوڑے پر سوار ہوئے۔ امام باڑہ عتیق اللہ پر حاضر ہوئے، فاتحہ پڑھا، احترام سے پانچ سو روپئے تعزیہ پر نذر کیے۔ دیگر غربا و فقرا کے تعزیوں کی زیارت کی۔ اہل تعزیہ کی ضرورت کے پیش نظر کچھ روپے ہر ایک تعزیہ پر نذر کیے۔ اس کے بعد اپنے محل سرا کو لوٹ گئے۔ نواب وزیر کو اطلاع دی گئی کہ امام حسن و امام حسین کو خراج عقیدت کے طور پر ڈھول تاشوں کا شور مسٹر چیری کو پسند نہیں آیا۔ ریزیڈنسی چھوڑ کر اطراف میں بی بی پور چلے گئے ہیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں ہندوؤں کی طرح مسلمان بھی تیوہاروں کے منانے میں لغویات کے شکار ہیں۔ اب محرم کے بعد ہی

بی بی پور سے لکھنؤ واپس لوٹیں گے۔

۲ر محرم ۱۲۰۹ھ (۳۱ر جولائی ۱۷۹۴ء): سہ پہر کے بعد نواب وزیر بیدار ہوئے۔ محل کے تالاب میں غسل کیا۔ لباس تبدیل کرکے کرم صاحب کی بارہ دری گئے۔ وہاں سے فوجی چھاؤنی گئے، جہاں ہر ایک تعزیہ کے سامنے نذر گذاری۔ اس کے بعد اشرف علی خاں اور ان کے بھائیوں کے امام باڑہ گئے۔ مرثیہ خوانی اور روضہ خوانی میں شریک ہوئے۔ ایک ہزار روپے نذر کیے۔ سواری پنج محلہ گئے اور خورد محل میں داخل ہوئے، جہاں خواتین کے تعزیوں پر بڑی رقم نذر کی۔ وہاں سے اپنے امام باڑہ میں واپس آئے۔ مرثیہ خوانی اور روضہ خوانی میں شرکت کی۔ نواب نے انھیں دوشالہ اور زر نقد پیش کیا۔ معظم چیلا کو سیاہ دوشالہ، راجہ مشرا کے ندیم کو ہرا دوشالہ عطا کیا۔ راجہ کا تربیت یافتہ ملازم بھی دوشالے سے سرفراز ہوا۔

۳ر محرم ۱۲۰۹ھ (یکم اگست ۱۷۹۴ء): نواب وزیر سواری میں ستھنی گئے۔ غرباء کے تعزیوں پر زر نقد نذر کیا۔ محل سرا کو لوٹ آئے۔

۴ر محرم ۱۲۰۹ھ (۲ر اگست ۱۷۹۴ء): نواب وزیر سواری میں نواب حسن رضا خاں کی حویلی تک گئے۔ تعزیوں پر پانچ اشرفیاں نذر کیں بعدہٗ امام باڑہ حسن رضا خاں میں حاضر ہوئے۔ پانچ سو روپے تعزیہ پر نذر کیے۔ حسن رضا خاں نے ایک حاجی کا تعارف کرایا جو عتبات عالیات کی زیارت سے واپس آیا تھا۔ اس نے کربلا کے تبرکات پیش کیے۔ نواب وزیر نے اسے پانچ ہزار روپے مرحمت کیے۔ سواری میں میاں تحسین علی خاں کی حویلی آئے۔ امام باڑہ میں درود پڑھا، عقیدت سے پانچ سو روپئے تعزیہ پر نذر کیے۔ روضہ خواں کو دوشالہ عطا کیا۔ امراء و روساء کے ہمراہ ماتم میں شرکت فرمائی۔ شام کو محل سرا کو واپس ہوئے۔ وہاں مرثیہ سنا اور خوب روئے۔ راجہ جھاؤلعل کے امام باڑہ میں حاضر ہوئے، فاتحہ پڑھا، تعزیہ پر پانچ سو روپئے نذر کیے۔ پھر الماس علی خاں کے مکان پر آئے! الماس علی خاں نے پندرہ اشرفیاں اور دو ہزار روپے پیش کیے۔ وہاں سے محل سرا کو لوٹ آئے۔ مرثیہ خواں طلب کیے گئے، جنھوں نے امام حسین کے مصائب پر کلام پیش کیا۔ آدھی رات کے بعد بستر پر آرام کے لیے گئے۔

۵ر محرم ۱۲۰۹ھ (۳ر اگست ۱۷۹۴ء): دریائے گومتی عبور کرکے نواب وزیر فوج دار خاں کی حویلی تک گئے۔ تعزیوں پر ایک ہزار روپئے نذر کیے۔ وہاں سے مستان شاہ کے تعزیے کی زیارت کے لیے گئے۔ ایک صد روپے نذر کیے۔ مدے خاں نے نواب وزیر کی خدمت میں ایک ہزار روپے پیش کیے۔ وہاں سے محل سرا کو لوٹ آئے جہاں مرثیہ خوانی اور روضہ خوانی سن کر مثاب ہوئے۔ ماتم میں شرکت کی۔ بعدہٗ خورد محل کی حرم سرا گئے اور بیگمات کی تنخواہ کی ادائگی کے احکامات صادر کیے۔ وزیر علی خاں کے تعزیہ درود و سلام کے بعد اپنے امام باڑہ میں واپس آگئے۔ مرثیہ خوانی، روضہ خوانی اور ماتم میں شریک ہوئے۔ بعدہٗ محل سرا کو واپس ہوگئے۔ نواب وزیر نے حکم دیا کہ تعزیوں کے گرد و پیش حفاظتی دستے مامور کر دیئے جائیں اور نقص امن کے ملزموں کو ان کے روبرو پیش کیا جائے۔

۶ر محرم ۱۲۰۹ھ (۴ر اگست ۱۷۹۴ء): نواب وزیر درگاہ حضرت عباس پر حاضر ہوئے۔ پانچ سو روپئے نذر کیے۔ اطلاع دی گئی کہ کل مرزا بہلو قتل اور تین افراد زخمی ہوئے۔ نواب وزیر نے قاتلوں کو قید خانہ بھجوا دیا۔ بعدہٗ تعزیہ نعیم علی خاں کی زیارت کو گئے اور زر نقد نذر کیا دیگر تعزیوں پر نذر گذارنے کے بعد اپنے امام باڑہ آئے، روضہ خوانی سنی، ماتم کیا اور محل سرا کو لوٹ گئے۔ راجہ نرمل رائے اور بلاس رائے نے مطلع کیا کہ کل درگاہ حضرت عباس پر فساد کرنے کی بنا پر دو ہندوؤں کو قید خانہ میں ڈال دیا گیا ہے۔ انھوں نے ان کی رہائی کی سفارش کی، جو قبول کی گئی۔ نواب وزیر اسیہ مئو گئے، جہاں تعزیہ پر نذر کی۔ مہاراجہ ٹکیٹ رائے کے تعزیہ کی زیارت کے لیے بھی تشریف لے گئے۔ چار سو روپے نذر کیے۔ مہاراجہ اور ان کے عیال نے نواب وزیر کی خدمت میں نقد تحائف پیش کیے۔ مرثیہ خوانی اور روضہ خوانی میں شرکت کی۔ بعد میں محل سرا کو لوٹ آئے۔ اسی درمیان مسٹر چیری اور دیگر انگریز وارد ہوئے۔ انھوں نے نواب وزیر کے ساتھ روضہ خوانی میں شرکت اور ماتم کیا۔ حملہ آوروں کو پابہ زنجیر پیش کیا گیا، جو ہندو سنگھ کی تحویل میں دیئے گئے۔ نواب وزیر پھر محل سرا سے وزیر باغ گئے اور تعزیوں پر نذر گذاری۔ تھوڑی دیر آرام کے بعد حویلی مرزا جمعہ گئے۔ تعزیہ پر تین سو روپے نذر کیے اور محل سرا

کو لوٹ آئے۔ رات میں کھانا نہیں کھایا ماتم کرتے رہے۔

(۷ر محرم سے ۹ر محرم کا خبر نامہ مہیا نہیں ہے)

۱۰ر محرم ۱۲۰۹ھ (۸ر اگست ۱۷۹۴ء): جلوس تعزیہ نے تھرکے پل سے گومتی پار کیا۔ نواب وزیر بہ نفس نفیس دریا پار گئے اور حویلی فوج دار خاں کے قریب قیام کیا۔ نو تعمیر کربلا میں تعزیے دفن کرنے کے احکامات دیئے گئے۔ حویلی مرزا سلیمان شکوہ کے محافظ دستے کے سپاہی آئے اور انھوں نے اطلاع دی کہ گذشتہ رات مرزا سلیمان شکوہ بے حد پریشان رہے اور اپنی اہلیہ ثانی کے مکان میں بند رہے۔ محافظ رات بھر گولہ باری کرتے رہے۔ کسی طرح فتنہ رفع دفع ہوا۔ نواب وزیر نے ماتمی لباس اور دو سو یا تین سو روپے سادات کو نذر کیے۔ ایک اہم سید میر محمد علی نمو نمائی کو ماتمی لباس اور ایک ہزار روپے دیے گئے۔

اسی طرح دوسرے سال کے محرم کے حسب ذیل کوائف ملتے ہیں:

۲۹ر ذی الحجہ ۱۲۰۹ھ (۱۷ر جولائی ۱۷۹۵ء): ابر باد کی بنا پر محرم کا چاند نظر نہیں آیا۔

یکم محرم ۱۲۱۰ھ (۱۸ر جولائی ۱۷۹۵ء): شام کو امام باڑہ میں سونا اور چاندی کے تعزیے استادہ کیے گئے۔ نواب وزیر نے ماتم کیا۔

۲ر محرم ۱۲۱۰ھ (۱۹ر جولائی ۱۷۹۵ء): نواب وزیر نے حکم دیا کہ مداح علی خاں سے ۲۵ ہزار روپے حاصل کر کے تحسین علی خاں کے سپرد کر دیئے جائیں، جو فی کس پانچ روپے کے حساب سے غریب تعزیہ داروں میں تقسیم کر دیں۔ بعد میں فوج دار خان کے تعزیہ کی زیارت کو گئے۔ ایک سو روپے نذر کیے۔ دکن اور کابل کی خبریں پڑھنے کے بعد اپنے امام باڑہ میں گئے اور تعزیوں کی زیارت کی۔

۳ر محرم ۱۲۱۰ھ (۲۰ر جولائی ۱۷۹۵ء): نواب وزیر نے راجہ جھاؤ لعل کو حکم دیا کہ نجف اشرف میں روضہ حضرت علی پر نذر کرنے کے لیے دو سو طلائی کمر بند اور ایک لاکھ روپے کی مالیت کے دیگر سامان تیار کیے جائیں۔ نواب وزیر راجہ جھاؤ لعل کے تعزیہ کی زیارت کو گئے۔ سو روپے نذر کیے۔ راجہ موصوف نے پانچ سو روپئے نذرانہ میں پیش کیے۔

۴ر محرم ۱۲۱۰ھ (۲۱ر جولائی ۱۷۹۵ء): کل نواب وزیر الماس علی خاں کے امام باڑہ کی زیارت کو گئے، سو روپے نذر کیے۔ غربا کے تعزیوں کی زیارت کی اور پانچ روپے فی تعزیہ نذر کیا۔

۵ر محرم ۱۲۱۰ھ (۲۲ر جولائی ۱۷۹۵ء): کل نواب وزیر نے دین محمد چودھری کے تعزیہ کی زیارت کی اور سو روپے نذر کیے مزید سو روپے وارث علی کے تعزیہ پر نذر کیے۔ مسٹر چیری اور دیگر انگریز افسران ملاقات کے لیے نواب وزیر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے امام باڑہ میں تعزیوں کی زیارت بھی کی۔

۶ر محرم ۱۲۱۰ھ (۲۳ر جولائی ۱۷۹۵ء): نواب وزیر نے راجہ بھوانی مشرا کے تعزیہ پر پانچ سو روپئے نذر کیے۔ راجہ نے تحفہ میں دو ہزار روپے پیش کیے۔

۷ر محرم ۱۲۱۰ھ (۲۴ر جولائی ۱۷۹۵ء): درگاہ حضرت عباس پر حاضر ہوئے اور پانچ سو روپئے نذر کیے۔ وہاں سے مہاراجہ ٹکیٹ رائے کی حویلی گئے اور تعزیہ پر پانچ سو روپئے نذر کیے۔ مہاراج نے پانچ اشرفیاں اور پانچ ہزار روپئے نذر کیے۔ اس کے بعد نواب وزیر گئو گھاٹ گئے اور میر میستا کے تعزیہ پر پانچ سو روپئے نذر کیے۔

۸ر محرم ۱۲۱۰ھ (۲۵ر جولائی ۱۷۹۵ء): شام کو نواب وزیر اپنے امام باڑہ تشریف لے گئے۔ میاں عالم علی خاں کی حویلی سے حضرت قاسم ابن حسن کی یاد میں جلوس مہندی برآمد ہوا۔ نواب موصوف نے روضہ خوانی سماعت فرمائی اور ماتم کیا۔ محل سرا کو لوٹ آئے۔ چندے آرام کے بعد سواری میں امام باڑہ آغا باقر گئے، تعزیہ پر نذر گذاری اور محل سرا کو لوٹ آئے۔

۹ر محرم ۱۲۱۰ھ (۲۶ر جولائی ۱۷۹۵ء): نواب وزیر قدم رسول کی زیارت کو گئے اور تعزیہ پر سو روپئے نذر کیے۔

۱۱ر محرم ۱۲۱۰ھ (۲۷ر جولائی ۱۷۹۵ء): شب عاشور نواب وزیر کو متلی ہوئی، معالج حاضر ہوئے، دوائیں دی گئیں۔ صبح عاشور نواب وزیر بیدار رہے۔ امرا سلامی کے لیے حاضر ہوئے۔ نواب وزیر اپنے امام باڑہ تشریف لے گئے۔ اپنے وزیروں کے ہمراہ ماتم کیا۔ اس کے بعد دریائے گومتی کے پار جلوس تعزیہ میں شریک ہوئے۔ بعد دفن تعزیہ محل سرا کو لوٹ آئے۔ بارہ گھنٹے مکمل آرام کیا، پھر بیدار ہوئے۔ ماتمی لباس زیب تن کیا۔ محمد علی نمو نمائی کو ایک لاکھ روپے

دیئے۔ تحسین علی خاں کو حکم دیا کہ شہزادوں، سادات اور ان کی خواتین میں ماتمی لباس تقسیم کیا جائے۔ امام حسن و امام حسین کے نام پر پانچ ہزار روپے غریبوں اور ناداروں میں خیرات کیے گئے۔ رات کے کھانے کے بعد نواب وزیر آرام کے لیے بستر پر گئے۔

۱۲ر محرم ۱۲۱۰ھ (۲۸ر جولائی ۱۷۹۵ء): نواب وزیر حسب معمول بیدار ہوئے۔ امرائے تعظیم بجالائے۔ مسٹر چیری بھی ملاقات کے لیے حاضر ہوئے۔ چونکہ ابر باد تھا، مسٹر چیری کو شال اوڑھنے کو دی گئی۔ انھوں نے نواب وزیر سے گفتگو کی۔

۱۳ر محرم ۱۲۱۰ھ (۲۹ر جولائی ۱۷۹۵ء): کل تحسین علی خاں کو حکم دیا گیا کہ ائمہ کرام کی یاد میں بڑے پیمانہ پر کھانا پکوا کر غربا و مساکین میں تقسیم کرائیں۔ محرم کے اخراجات کی تفصیل معہ تعزیہ اور روشنی پیش کیے گئے۔ نواب وزیر نے ملاحظہ کیا۔

مذکورہ بالا کوائف کی روشنی میں آصفی دور کی عزاداری کا اجمالی خاکہ تیار کیا جاسکتا ہے جن سے کئی اہم و معنی خیز معلومات حاصل ہوتے ہیں اولاً یہ کہ شہر لکھنؤ میں متعدد امام باڑے تھے جن میں نفاست سے قیمتی تعزیے وعلم استادہ کیے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ گھر گھر میں تعزیہ داری ہوتی تھی۔ ہر شخص اپنی توفیق کے اعتبار سے تعزیہ استادہ کرتا تھا۔ نواب آصف کی سیر چشمی کسی کو مایوس نہیں ہونے دیتی تھی۔ وہ بہ نفس نفیس چھوٹے بڑے امیر و غریب ہندو و مسلمان سب کے تعزیوں کی زیارت کے لیے جاتے اور زرِ نقد نذر کرتے۔ دوئم یہ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی صاحب اقتدار ہونے کے باوجود عزاداری میں مخل نہیں ہوتی تھی بلکہ اس کے عملہ بھی عزاداری میں حصہ لیتے تھے۔ سوئم یہ کہ نواب وزیر کی زرپاشی کا بہاؤ شیعوں کے مقابلہ میں سنیوں کی طرف اور سنیوں کے مقابلہ میں ہندوؤں کی طرف زیادہ ہوتا تھا۔ روضہ خوانوں کو پانچ سو روپے فی کس ملتے تھے۔ لیکن مرثیہ خواں (جس میں مرثیہ نگار بھی شامل ہیں) کی قدر افزائی محض عطیہ دوشالہ تک محدود تھی۔ کسی کو زرِ نقد نہیں دیا جاتا تھا۔ ممکن ہے کہ مرثیہ گویوں کے احترام کے پیش نظر کیا جاتا ہو، بہرحال نواب آصف الدولہ کی زرپاشی سے سارا شہر فیض یاب ہو رہا تھا، علاوہ مرثیہ گویوں کے۔ اس سے یہ حقیقت بے نقاب ہوتی ہے کہ نوابین اودھ کی زرپاشی سے مرثیہ نے اودھ میں عروج حاصل کیا۔ چہارم یہ کہ عزاداری محض عشرہ محرم تک محدود تھی۔ گیارہویں محرم سے معمولات شروع کر دیئے جاتے تھے۔ مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ دور آصفی میں عزاداری کو عوامی مقبولیت حاصل ہو گئی تھی۔ مختلف العقائد کے برگ و بار میں یہ تناور درخت فطری نشو و نما پا رہا تھا۔ اس کی جڑیں عصری سماجی زندگی میں پیوست تھیں۔ آصف الدولہ نے اظہار محبت و مودت اہل بیت اطہار میں باہمی ہم آہنگی کو رشتہ جاں بنا دیا تھا۔ اس کے مخالف کو عتاب آصفی کا شکار بننا پڑتا تھا۔ آصفی سیر چشمی ابر نیساں کی طرح عام تھی۔ انھیں معلوم ہوا کہ اس وقت کے بادشاہ عراق کی لاپروائی کی بنا پر زائرین کو کربلائے معلیٰ میں پانی کی قلت سے شدید تکلیفیں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ نواب موصوف نے حاجی محمد طہرانی کی معرفت ۷ لاکھ روپے صرف کر کے فرات کی ایک نہر تعمیر کرائی جو "نہر آصفی" کے نام سے مشہور ہوئی۔[۵۱] اب یہ نہر معدوم ہو چکی ہے لیکن اس سے آصف الدولہ کے عقاید محبت و مودت اہل بیت اطہار کی مزید توثیق ہوتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ آصف الدولہ فدائے محمد و آل محمد کی حیثیت سے زندہ رہے اور انھیں کی محبت و مودت میں موت سے ہم کنار ہوئے۔

آصف الدولہ کے بعد ان کے بیٹے نواب وزیر علی خاں کو بے دخل کر کے انگریزوں کی امداد سے نواب شجاع الدولہ کی دوسری بیوی کے بیٹے سعادت علی خان کو نواب وزیر کا عہدہ حاصل ہوا۔ نواب سعادت علی خان میں آصف الدولہ کی طرح کی داد و دہش کی اعلا صفات نہیں تھیں لیکن انھوں نے دربار کے آصفی ماحول کو برقرار رکھا۔ لکھنؤ کو فنون لطیفہ اور شعر و شاعری میں مرکزیت عطا کرنے کی کوشش کی۔ مختلف علوم و فنون کے ماہرین سے دربار کو آراستہ کیا گیا۔ عزاداری میں فروغ ہوا۔ درگاہ حضرت عباس میں ہر جمعرات کو خوب گہما گہمی ہوتی۔ سال بھر مجلسیں، نذر و نیاز اور فاتحہ و درود کا سلسلہ رہتا۔ محرم میں شہر بھر سے ہزاروں کی تعداد میں علم برآمد کیے جاتے، جو درگاہ حضرت عباس میں نذر کیے جاتے۔ دور نواب سعادت علی خاں میں عزاداری کے جوش و خروش کے متعلق سید انشاؔ بیان کرتے ہیں:

ہوتی ہے اس میں تعزیہ داری امام کی ۔۔۔ اس کی مدد کو ہیں حسنین اور ان کے جد[۵۲]

دور نواب سعادت علی خاں (۱۸۱۴ - ۱۷۹۸ء) کو عزاداری میں اس بنا پر بھی امتیاز حاصل ہے کہ اسی زمانہ سے لکھنؤ میں چہلم کی ابتدا ہوئی۔ اس کے قبل عشرۂ محرم کے بعد عزاداری کا سلسلہ منقطع ہو جاتا تھا جو آئندہ سال ہلال محرم دیکھنے کے بعد شروع ہوتا۔ اس دور کے ایک ممتاز مرثیہ خواں میر احسان علی نے عشرۂ عزا کی توسیع کرکے چہلم کی ابتدا کی۔ اس کے بعد غازی الدین حیدر (۲۷-۱۸۱۴ء) کی حکومت نوابی سے بادشاہی میں تبدیل ہوئی تو عزاداری میں بھی فروغ ہوا۔ نجف اشرف میں روضہ حضرت علی کی شبیہ کے طور پر ایک نیا امام باڑہ شاہ نجف تعمیر کیا گیا جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ اس کے قریب ہی قدم رسول بھی ہے۔ غازی الدین حیدر کے دور میں شاہ نجف کو شاہی عزاداری کی مرکزیت حاصل ہوگئی۔ انھوں نے شاہ نجف میں عزاداری کے لیے کافی دولت وقف کی تحریری معاہدہ کے مطابق ایک خطیر رقم ایسٹ انڈیا کمپنی میں جمع کر دی تاکہ سال بہ سال عزاداری ہوتی رہے۔ غازی الدین حیدر کے بعد ان کے بیٹے نصیر الدین حیدر سریر آرائے سلطنت ہوئے۔ جو ایک کنیز کے بطن سے تھے لیکن غازی الدین حیدر کی اہلیہ بادشاہ بیگم نے اپنے بیٹے کی طرح پالا پوسا تھا۔ نصیر الدین حیدر کے دور میں بادشاہ بیگم کے اثرات بہت بڑھ گئے۔ موصوفہ مذہبی مزاج رکھتی تھیں اور عزاداری میں خصوصی شغف تھا۔ انھوں نے عزاداری سے متعلق مختلف و متنوع مراسم کی ابتدا کی۔ ایام عزا میں مزید توسیع کی گئی۔ ۸ ربیع الاول تک جلوس عزا کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ انھوں نے نصیر الدین حیدر کے جلوس کے پہلے سال ہی ایک فرمان جاری کر کے چہلم تک تقریب مسرت کرنے پر پابندی عاید کر دی۔ انگریز ریزیڈنٹ نے مداخلت کی، جس کے نتیجے میں نصیر الدین حیدر نے ماتم داری کو اختیاری قرار دے دیا لیکن عزاداری کی جڑیں اودھ کی عوامی زندگی میں اس طرح پیوست ہو چکی تھیں کہ ہر عام و خاص بہ رضا و رغبت چہلم تک خوشی کی کوئی تقریب نہیں کرتا تھا، نہ اس میں شرکت کرتا تھا۔

اس دور کی عزاداری کی تفصیلات ولیم نائٹن اور مسز میر حسن علی نے پیش کیے ہیں۔ یہ بیانات تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ولیم نائٹن ساڑھے تین برس تک نصیر الدین شاہ کا مصاحب رہا۔ روزانہ کے واقعات بطور یادداشت لکھتا رہا۔ مسز میر حسن علی انگریز خاتون تھیں، جنھوں نے کسی امیر حسن علی سے شادی کر لی تھی۔ دونوں کے بیانات پایہ اسناد رکھتے ہیں۔ دورِ نصیر الدین حیدر میں لکھنؤ کی عزاداری کے متعلق ولیم نائٹن نے اپنی کتاب میں ایک باب رکھا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

"اس زمانے میں امام باڑوں میں روشنی کی بہتات اور اسی روشنی میں کارچوبی کام کی چیزوں کی اس قدر چمک دمک ہوتی ہے کہ آدمی کی نظر کو جیسے کا چوندھ لگ جاتی ہے علموں کے طلائی و نقرئی پنجوں کی جگمگاہٹ اور ان کے بھاری بھاری پٹکوں کی سجاوٹ۔ زردوزی کام پر گنگا جمنی کرن کی جھالروں کی زیبائش اور ان کی وجہ سے در و دیوار آب و تاب بس سارا امام باڑہ بقعۂ نور ہو جاتا..... ایام محرم میں برابر تعزیوں کے گرد بڑی بڑی سرخ و سبز رنگ کی مومی تو غیں روشن رہا کرتی ہیں اور شب و روز دو مرتبہ مجالس عزا امام باڑوں میں منعقد ہوا کرتی ہیں جس میں شام کی مجلس زیادہ دلچسپ ہوتی ہے..... (شاہی) جلوس میں سب کے آگے چھ سات ہاتھی ہوتے تھے جن پر مغرق جھولیں یا کھریں پڑی نقرئی، طلائی ہودے، عماریاں اور گلے میں نقرئی گھنٹے اور ..... میکلیں لٹکتی ہوئی ہوتی تھیں ہر ایک ہاتھی پر کچھ لوگ جواہر نگار علم ہاتھوں میں لیے سوار ہوتے تھے اور ان کے ہمراہ سپاہیوں کا ایک گارد ہوتا تھا۔ ہاتھیوں کے پیچھے ایک شخص خاص طور پر سوگوار بنا ہوتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بانس کی ایک بڑی چھڑی سیاہ کپڑے سے منڈھی ہوتی تھی۔ اس چھڑے کے اوپر ایک الٹی کمان میں دو ننگی تلواریں لٹکتی ہوتی تھیں۔ اس کے پیچھے خود بادشاہ سلامت ہوتے تھے ان کے گرد و پیش خاندان شاہی کے لوگ مقرب مقرب، علمائے مذہب ہوتے تھے۔"[۵۳]

مسز میر حسن علی شب عاشور کے متعلق لکھتی ہیں کہ:

"غریب ہو یا امیر، ہر ایک عزادار اپنے امام باڑے کو حتی الوسع آراستہ کرتا ہے۔ اتنی روشنی کی جاتی ہے کہ آنکھیں نہیں ٹھہرتیں۔ رات بھر لوگ روشنی دیکھنے کے لیے

پھرتے رہتے ہیں۔ عورتیں اپنے گھروں میں گریہ وزاری کرتی ہیں۔ رات بھر مجلس و ماتم کرتی ہیں۔"[۲۳]

ہندؤوں کی عزاداری کے بارے میں لکھتی ہیں کہ:

"ہر شیعہ کے گھر میں تعزیہ رکھا جاتا ہے۔ ہندؤوں میں بھی تعزیہ سے عقیدت عام ہے۔ وہ لوگ تعزیہ کو دیکھ کر مودبانہ جھک جاتے ہیں۔ مجالس میں شریک ہوتے ہیں۔ مسلمان بخوشی اپنے ساتھ بٹھاتے ہیں۔ امام باڑہ میں کوئی بھی شخص داخل ہونے سے قبل اپنے جوتے اتار دیتا ہے۔ یہ اس قدر عام ہے کہ اب یورپین لوگوں کے علاوہ کسی سے جوتے اتارنے کے لیے کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔"[۲۵]

اپنا ایک دلچسپ تجربہ لکھتی ہیں:

"میرا باورچی ایک مجوسی تھا۔ عزاداری میں چالیس روپے خرچ کرتا تھا اور مسلمانوں کی جوش و خروش کا اظہار کرتا تھا۔ روز عاشورہ دفن تعزیہ کے بعد اپنے دھرم کرم میں لوٹ آتا تھا۔"[۲۶]

بادشاہ نصیرالدین حیدر کی عزاداری کے متعلق مولوی نجم الغنی نے تفصیل سے لکھا ہے۔ ذیل میں ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

"ہر امام کی ولادت کی تاریخ میں حسب قاعدہ مجلس عزا برپا ہوتی تھی اور بارگاہ پھولوں سے نہایت خوشنما تیار ہوتی تھی۔ باغات سلطانی میں جتنے خوشبودار پھول ہوتے وہ اور ان کے سوا بازاروں سے پانچ ہزار روپے روز کے پھول عشرہ محرم تک مول آتے تھے۔ اس زمانے میں خوشبودار پھول بڑے آدمیوں کو بھی مشکل سے ملتے تھے۔ اس بارگاہ کا طول سو قدم سے کم نہیں ہوتا تھا اور عرض پندرہ بیس قدم سے زیادہ ہوتا تھا۔ کبھی طلائی کبھی نقرئی مقیش اور ستاروں اور بادلے کی جھالریں پھولوں کی جگہ کام میں لائی جاتی تھیں۔ عطریات سے وہ مکان بسایا جاتا تھا۔ غرضیکہ ہر امام کی ولادت کی تقریب میں پہلے دن سے چھ دن تک برابر اور ہر امام کی وفات کے دنوں میں کئی روز تک اور محرم کی پہلی تاریخ سے چہلم تک بادشاہ نے اپنے اوپر لازم کر لیا تھا کہ بہ نفس نفیس وہاں کی خدمت ہزار دل و جان سے فرماتے تھے۔ وفات و شہادت کے دنوں میں مرثیہ خوانی ہوتی اور شربت اور مٹھائی اور میوہ جات صرف ہوتا تھا۔ ان مصارف میں چار پانچ لاکھ روپوں سے کم خرچ نہ ہوتے بلکہ زیادہ تصور کرنا چاہیے۔ بادشاہ محرم کی پہلی تاریخ کو سو پچاس تعزیے در دولت سے مقام معہود تک اپنے سر پر پہنچاتے تھے۔ ہر مرتبہ کی آمد و رفت میں کئی کوس زمین پاپیادہ طے ہوتی تھی اور آنا جانا کنکریوں کی زمین پر برہنہ پا ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ تلوؤں سے وہ کنکریاں کانٹوں کی طرح کھٹکتی تھیں۔"[۲۷]

دور محمد علی شاہ ۴۲-۱۸۳۷ء میں امام باڑہ حسین آباد کی تعمیر کے بعد یکم محرم کو جلوس ضریح کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ ضریح امام باڑہ آصفی میں استادہ کی گئی۔ وہیں سے جلوس برآمد ہوتا۔ اس جلوس نے عزاداری میں مزید شان پیدا کر دی۔ اس کے پہلو بہ پہلو شیخ خدا بخش کے جلوس چہلم کی شہرت تھی۔ عظیم آباد (پٹنہ) کا ایک باشندہ نجات حسین خاں خاص طور پر لکھنؤ کا جلوس چہلم دیکھنے آیا۔ اس نے جلوس چہلم کی متحرک تصویر پیش کی ہے کہ "سہ پہر کو جلوس دارالشفا کی مسجد (اب وجود نہیں!) کے قریب سے گذرا۔ آگے آگے سات روٹیاں سیاہ کپڑوں میں ڈھکی ہوتی تھیں، ان کے سوار بھی سیاہ پوش تھے۔ اس کے بعد سترہ سیاہ پوش ہاتھی تھے، جن پر بلند پرچم اور علم استادہ تھے۔ سیاہ و سرخ پھریرے کے علم تھے، جن پر اللہ اور پنجتن محمد، علی، فاطمہ، حسن، حسین کے نام سونے اور چاندی کے تاروں سے بنائے گئے تھے۔ اس کے بعد سرکاری لوگ تھے، جن کے ہاتھوں میں سونے اور چاندی کے ماہی مراتب تھے۔ جلوس ایک میل سے زیادہ لمبا تھا۔ پیچھے ماتمی دھن بجاتے ہوئے دستے تھے۔ اس کے پیچھے "آب خوارہ" (پانی شربت وغیرہ) تھا، جو شرکا کو سیر و سیراب کر رہا تھا۔ اس کے بعد دو تین ذوالجناح اور تابوت تھے۔ تابوت پر تیر آویزاں تھے۔ ذوالجناح پر خون کے دھبے تھے۔ ان کے پیچھے سیکڑوں لوگ سروں پر تعزیے اٹھائے تھے۔ سب کے آخر میں شیخ خدا بخش کا تعزیہ تھا۔ تعزیوں کے گرد و پیش ہزاروں ماتم دار تھے، سر برہنہ، پیادہ پا۔

آنکھوں سے آنسو جاری. مختلف قوموں کے الگ الگ گروہوں میں شامل تھے ماورالہندی، مغل وغیرہ الگ ماتم کرتے تھے۔ عجب عالم تھا کہ اگر امام حسین کا قاتل شمر آ جائے تو تڑپ اٹھے۔[۲۸]

سید امجد علی شاہ (۱۸۴۲-۴۷ء) انتہائی مذہبی تھے۔ ان کے دور میں عنانِ سلطنت دو علمائے شیعہ سلطان العلماء سید محمد مجتہد اور سید العلماء سید حسین مجتہد کے ہاتھوں میں تھی. فطری طور پر عزاداری میں خصوصی دلچسپی لی گئی۔ امام باڑہ سبطین آباد تعمیر ہوا جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ امام باڑہ کو قیمتی ساز و سامان سے آراستہ کیا گیا تھا. ایام عزا میں روشنی کا خاص اہتمام کیا جاتا. بڑی شان و شوکت سے عزاداری ہوتی۔ امجد علی شاہ کے وزیر اعظم نواب امین الدولہ بھی بڑے دیندار و متقی و پرہیزگار تھے. انھوں نے بھی اپنا امام باڑہ تعمیر کرایا۔ بادشاہ کے معتمد اور داروغہ عمارات جگن ناتھ اگروال (بعدہ غلام رضا خاں) نواب شرف الدولہ نے بھی شاندار امام باڑے تعمیر کرائے جن کا ذکر آ چکا۔ ان میں بھی شاندار عزاداری ہوتی تھی. عزاداری سے امجد علی شاہ کے غیر معمولی شغف کا ذکر کرتے ہوئے مولوی نجم الحسن لکھتے ہیں:

"ایک بار مرزا حیدر شکوہ شاہزادہ تیموریہ نے امجد علی شاہ سے عرض کیا کہ ایک رات میرے تعزیہ خانہ میں شعاعِ آفتاب سے بھی تیز نور حضرت امام حسین کی ضریح پر ظاہر ہوا۔ در و دیوار اور چھت بھی زیادہ چمکنے لگی اور حضرت عباس کا علم جو ضریح کے پاس کھڑا تھا، وہ ضریح پر جھک گیا. بادشاہ نے یہ سن کر ڈھائی ہزار روپے دے کر شاہزادے سے وہ ضریح و علم خرید کے اپنے تعزیہ خانے میں رکھوا لیے...... اسی طرح ایک دن میر ذکی مرثیہ خواں نے بادشاہ سے عرض کیا کہ میرے مکان میں حضرت امام حسین کا پنجہ موجود ہے۔ بادشاہ نے وہ مانگ لیا اور انعام بخشا..."[۲۹]

شاہی محل میں بھی بڑے جوش و خروش سے عزاداری ہوتی تھی. جس میں سید انشاء کی تین نواسیاں مرثیہ پڑھتی تھیں![۳۰]

آخری تاجدار اودھ سلطان عالم واجد علی شاہ اختر کے دورِ حکومت میں بجھتی ہوئی شمع کی لَو اتنی تیز ہو گئی تھی کہ آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ واجد علی شاہ مختلف علوم و فنون کی سرپرستی ہی نہیں کرتے تھے بلکہ خود ماہرانہ دسترس رکھتے تھے۔ وہ خود مرثیہ گو و مرثیہ خواں تھے. عزاداری سے بے پناہ شغف تھا. اہلبیت اطہار اور خاص کر امام حسین پر دل و جان سے نثار تھے۔ انھوں نے بھی قصر العزا کے نام سے قیصر باغ میں عظیم الشان امام باڑہ تعمیر کرایا جس کا ذکر آ چکا ہے۔ انتزاعِ سلطنت اودھ تک لکھنؤ میں انتہائی جوش و خروش سے عزاداری کرتے رہے. بعدہٗ قید فرنگ نے مٹیا برج میں ڈالا تو وہاں بھی سب کچھ عزاداری پر نثار کرتے رہے. شرر لکھنوی لکھتے ہیں:

"مٹیا برج میں بادشاہ کی محرم کی خاص طور پر تیاریاں کی جاتیں. سب امام باڑے آراستہ ہوتے. گھروں میں اندر باہر قلعی کر دی جاتی. بادشاہ کے یہاں ۲۹ ذی الحجہ کو ضریح کے ساتھ ماہی مراتب، شاہی جلوس، جھنڈی بردار اور باجے والے ہوتے. کہیں کہیں ۳۰ ذی الحجہ یا پہلی محرم کو تعزیے آتے۔ بادشاہ ۲۹ ذی الحجہ سے ماتمی لباس پہن لیتے جو اکثر سبز ہوتا اور کبھی سیاہ. محرم میں مٹیا برج میں جگہ جگہ لنگر جاری ہو جاتا. شاہی مجلسیں روزانہ ہوا کرتیں، جن میں پلاؤ، شیرمال یا باقرخانیاں تقسیم ہوتی. مقامی ذاکرین کے علاوہ دیگر مقامات اور زیادہ تر لکھنؤ سے ذاکر آتے اور بادشاہ کی طرف سے انعام اور خلعت لے کر واپس جاتے.... ساتویں محرم کو مہندی اٹھتی تھی اور اسی روز نواب نشاط محل بادشاہ کو منت کا چھلا اور ناڑہ پہناتی تھیں. مغرب کے وقت بادشاہ بھی مہندی کے ساتھ ہوتے بڑے کروفر باجے اور جلوس سے جاتی.... دسویں محرم کو علی الصبح سب سے پہلے سبطین آباد کی شاہی ضریح ہوتی. اس کے بعد محلات کے تعزیے اور دولہاؤں کے تعزیے پوری شان و شوکت اور جلوس سے اٹھائے جاتے اور غلام عباس کی کربلا جاتے. سبطین آباد کی ضریح نو یا سوا نو بجے کربلا پہنچ جاتی پھر دن بھر دوسرے تعزیوں کا سلسلہ جاری رہتا۔ بادشاہ ابتدا میں کربلا تک ضریح کے ساتھ پیادہ پا جاتے تھے مگر آخری عمر میں ضعف کی وجہ سے تھوڑی دور جا کے واپس آ جاتے۔ مجلسوں کا سلسلہ چہلم تک جاری رہتا۔ سوم، دسویں، بیسویں اور چہلم کی مجلسیں بڑے پیمانے پر ہوتیں۔"

مذکورہ بالا جائزہ اودھ میں عزاداری کا محدود خاکہ پیش کرتا ہے

جس میں سلطنت اودھ کے دو مراکز فیض آباد اور لکھنؤ کی عزاداری کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ مراکز حکمرانوں کی سرپرستی میں رہے۔ ان کے باہر عوامی سطح پر عزاداری کو مقبولیت حاصل تھی۔ اودھ کا کوئی علاقہ ایسا نہیں رہا ہوگا جس میں عزاداری نہ ہوتی رہی ہو، خواہ وہ نواب سعادت علی خاں کے معاہدۂ الہ آباد (۱۰ر نومبر ۱۸۰۱ء) کے قبل کا اودھ ہو یا بعد کا۔ ان میں بعض مقامات کی عزاداری اپنے اطراف و جوانب میں مشہور و معروف رہی۔ شہروں میں خاص طور پر الہ آباد، بنارس، جونپور، بہرائچ، اناؤ، غازی پور وغیرہ اور قصبات میں زید پور اور رودولی (بارہ بنکی) محمود آباد (سیتاپور) مچھلی شہر (جونپور) اتراؤں (الہ آباد) جائس و نصیر آباد (رائے بریلی) وغیرہ کا خاص طور پر ذکر کیا جا سکتا ہے۔ ان کے علاوہ اودھ کے تقریباً ہر شہر اور زیادہ تر دیہاتوں میں عزاداری ہوتی رہی ہے۔ ان میں سلطنت اودھ کی عزاداری کے اثرات نظر آتے ہیں لیکن مقامی ضرورتوں کے اعتبار سے ترمیم و تنسیخ بھی ہوتی رہی ہے۔ ان شہروں اور دیہاتوں میں بھی مرثیہ نگار رہے ہیں لیکن عام طور پر مشہور مرثیہ نگاروں کے مراثی کی خواندگی پر زور رہا ہے۔ جلوس ہائے عزا کے متعلق بھی ضابطے مقرر رہے ہیں۔ کس منزل پر کون مرثیہ پڑھا جائے گا اور کون پڑھے گا اس کی بھی پابندی کی جاتی رہی ہے۔ عوام میں نوحہ کے طرز پر "دُھنوں" کا رواج ہوا۔ 'دہے' اپنے آپ میں ایک صنف شاعری ہے۔ جلوس کے ساتھ عام طور سے دیہاتی عورتیں لحن سے کہتی ہوئی گزرتی تھیں، جس کو اصطلاحاً 'دہا رونا' کہتے ہیں۔ ان مباحث پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے، جس کا متحمل یہ مضمون نہیں ہو سکتا۔

حواشی:

۱۔ سیّد اطہر عباس رضوی اے سوشیو انٹلکچول ہسٹری آف اثنا عشری شیعز ان انڈیا۔ ج ۱۔ ص ۳۰۸۔

۲۔ لطائف اشرفی۔ ج ۲۔ ص ۲۶۸

۳۔ ایضاً ایضاً

۴۔ سید کمال الدین حیدر، قیصر التواریخ ج ۲۔ ص ۱۱۰

۵۔ فیض گزیٹیر ص ۲۱۵

۶۔ کلیات جرأت (مخطوطہ) ورق ۲۱۰ لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری

۷۔ محمد خاں شاہجہاں پوری، ملفوظات رزاقی ص ۱۰۴

۸۔ سید غلام علی خاں، عماد السعادت ص ۸۳ ۹۔ کلیات سودا (مخطوطہ نسخہ محمد آباد)

۱۰۔ نجم الغنی، تاریخ اودھ ج ۳ ص ۲۹۷ ۱۱۔ لکھنؤ گزیٹیر ص ۲۰۲

۱۲۔ نجم الغنی، تاریخ اودھ ج ۳ ص ۲۹۷ ۱۳۔ مرتضیٰ حسین بلگرامی حدیقۃ الاقالیم ص ۱۵۵

۱۴۔ ڈبلو ہیبر، نیرٹیو آف دی جرنی ۱۵۔ مرزا ابو طالب لندنی تفضیح الغافلین ص ۱۱۵

۱۶۔ سید عبد اللطیف خاں شوستری تحفۃ العوام ص ص ۵۲۳۔۵۲۲

۱۷۔ مرزا محمد کاظم، رسالہ سوانح عمری ص ۴۸۔۴۷

۱۸۔ سید غلام علی خاں، عماد السعادت ص ۱۷۲، تھامس ولیم بیل مفتاح التواریخ (ترجمہ)، نجم الغنی، تاریخ اودھ ج ۳ ص ۳۰۰

۱۹۔ سیّد اطہر عباس رضوی، ہسٹری آف اثنا عشری شیعز ان انڈیا ج ۱ ص ۳۰۹

۲۰۔ ڈاکٹر اکبر حیدری (اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقا ص ۹۲) نے کربلا کی بجائے نجف لکھا ہے جو غیر صحیح ہے۔ ج۔ ر

۲۱۔ سید خیرات حسین، تنویر امامت ص ۵۴ (مخطوطہ) محمد علی جون پوری رفیق الزائرین ص ۵۵

۲۲۔ کلیات انشا، مخطوطہ مکتوبہ ۱۲۴۴ھ

۲۳۔ ولیم ناٹن، دی پرائیوٹ لائف آف این ایسٹرن کنگ (اردو ترجمہ، شباب لکھنؤ محمد احمد علی) ص ص ۱۴۶۔۱۴۹ (لکھنؤ ۱۹۱۲ء)

۲۴۔ مسز میر حسن علی، آبزرویشن آن دی مسلمان آف انڈیا ص (سنہ اشاعت ۱۸۳۲ء)

۲۵۔ ایضاً ایضاً ص ص ۱۷۔۲۸

۲۶۔ وان ڈرنگ آف پل گرمس ان سرچ آف پکچرس ڈیورنگ فور اینڈ ٹونٹی ایرس ان دی ایسٹ ج ۱ ص ۲۹۶ (سنہ اشاعت ۱۸۵۰ء)

۲۷۔ نجم الغنی، تاریخ اودھ ج ۴ ص ص ۳۹۶۔۳۹۷

۲۸۔ سیّد حسن، چند تحقیقی مقالے ص ۷۔۹ (پٹنہ ۱۹۷۶)

۲۹۔ نجم الغنی، تاریخ اودھ ج ۵ ص ۲۴ ۳۰۔ عبد الحلیم شرر، جان عالم ص ص ۷، ۱۵۹،۱۵

> "قدیم لکھنؤ میں بیسنی روٹی بڑی پسندیدہ غذا تھی۔ آخری تاجدارِ اودھ کو بیسنی روٹی سے عشق تھا۔"
>
> ——— لکھنؤ کا دسترخوان۔ مرزا جعفر حسین

پروفیسر محمود الحسن
صدر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

جغرافیائی اور تہذیبی پس منظر

ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اودھ کو اپنی تاریخی، سیاسی اور ثقافتی حیثیت سے دورِ قدیم سے ہی ایک امتیاز حاصل رہا ہے بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ یہاں سے جو تہذیبی و فکری قدریں ابھریں اس نے ملک کے مختلف گوشوں کو متاثر کیا اور خود اس میں بھی بہت سی قدروں کا اشتراک ہوتا گیا۔ امتدادِ زمانہ اور سیاسی و تاریخی انقلابات و نشیب و فراز اس کے جغرافیائی حدود میں تبدیلیاں ضرور پیدا کرتے رہے لیکن اس کے مرکزی علاقہ میں جو مخصوص روایات نشو و نما پا چکی تھیں ان کے نقوش ہر دور میں برقرار رہے اور اس کی اہمیت کسی نہ کسی شکل میں آج بھی قائم ہے۔

مورخین میں اس بات پر پوری طرح اتفاق نہیں پایا جاتا کہ "اودھ" کی وجہ تسمیہ کیا ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ لفظ "ایودھیہ" کا اپ بھرنش ہے عام بول چال میں "ایودھیہ" سے "اودھ" بن گیا۔ فارسی رسم الخط کے لحاظ سے بھی اس کا تلفظ "اودھ" ہی رائج ہوگیا اسی لئے سولھویں صدی عیسوی تک (مغلوں کے اثرات سے پہلے) کسی جگہ "اودھ" نہیں بلکہ "ایودھیا" ہی پایا جاتا ہے۔ "ایودھیا" کا یہ نام کیوں پڑا اس سلسلے میں بھی کوئی قطعی رائے نہیں پائی جاتی۔ بعض اس کی مناسبت ''अज-युद्ध'' یعنی ब्रहमा की अपराजेय नगरी سے دیتے ہیں اور بعضوں کے خیال میں اس لفظ کا تعلق ''अ + युध'' یعنی अजेय नगरी سے ہے۔ یہاں کے جنگجو اور بہادر باشندوں کے کارناموں کی بنیاد پر ڈاکٹر WILSON نے یہ نظریہ بھی پیش کیا ہے کہ اس کا تعلق لفظ ''युद्ध'' سے زیادہ مناسب ہے یعنی (جنگجو چھتریوں کا شہر) ''युद्ध वीर क्षत्रियों का नगर''[1]۔ عوام میں ایک روایت یہ بھی مقبول ہے کہ جب شری رام چندر جی بن باس کی مدت (अवधि) ختم کر کے واپس آئے تو اسی अवधि کی بنا پر اس کا نام "اودھیا" پڑ گیا۔ لیکن یہ بات قرین قیاس نہیں ہے کیونکہ اس بات پر بھی مورخین متفق ہیں کہ "ایودھیا" نام رام چندر جی کے بن باس سے پہلے بھی رائج تھا بلکہ والمیک نے رامائن میں تو یہ لکھا ہے کہ "ایودھیا" کی بنیاد "منو" نے ڈالی تھی، باب ۵، اشلوک ٦ میں وہ لکھتے ہیں:-

> ''अयोध्या नाम नगरी तत्रासील्लोक विश्रुता
> मनुना मान्वेन्द्रेण या पुरी निर्मिता स्वयम''[2]

بہر حال قبل تاریخ کے ایودھیا کے حدود اربعہ کی معلومات حاصل کرنے کے ذرائع مفقود ہونے کی وجہ سے اس سلسلہ میں کوئی قطعی بات نہیں کہی جاسکتی نہ اس کی تحقیق پیشِ نظر ہے لیکن تقریباً ڈھائی ہزار سال پہلے ہندوستان کا وسطی علاقہ چار ریاستوں (کوشل، کاشی، مگدھ اور ودیہ (विदेह)) پر مشتمل تھا جس میں کوشل راج کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی اور اسی کی راجدھانی "ایودھیا" تھی۔ ڈاکٹر سرجو پرشاد اگروال لکھتے ہیں کہ "مہا پران کے انوسار اس میں سات لاکھ گاؤں بتائے گئے ہیں"[3] اس کا رقبہ پانچ ہزار مربع میل تھا اور ڈاکٹر رائے چودھری کے مطابق "کوشل کا علاقہ تقریباً موجودہ اودھ کے برابر تھا جو پورب میں ودیہ راج، پچھم میں پنچال، دکھن میں سئی ندی اور شمال میں نیپال کے پہاڑی علاقے تک پھیلا ہوا تھا"[4] اور یہی وہ حدود ہیں جو اس علاقہ کے تقریباً برابر ہیں جسے موجودہ اودھ کی حیثیت سے مانا جاتا ہے۔ کوشل کے دار السلطنت کی حیثیت سے سیاسی طور پر تو ایودھیا کو مرکزی اہمیت حاصل تھی ہی جہاں مان دھاتا، ہریش چند، سگر، دلیپ، رگھو، آج، اور دشرتھ وغیرہ عظیم راجاؤں کے علاوہ رام چندر جی ایسے ایشور کے اوتار گزرے ہیں، یا تھا ہی

ساتھ ہند و مذہب کا بیتر تھا استھان ہونے کی وجہ سے اسے ہمیشہ سے عقیدت و عظمت کی نظر سے دیکھا جاتا رہا ہے، اس دَور کا ذکر کرتے ہوئے Samuel Lucas لکھتا ہے کہ:-

"Before we knew of its existence, Oude was a country of ancient traditions and the scene of India's earliest romance. In the first great Sanscrit epic "The Ramayan" it is the residence of a splendid king and an heroic people and its capital Ayodhya, or OUde, is filled with gorgeous accessories."* ۵

چنانچہ انھیں روایات کا اثر تھا کہ بہت سے سیاسی انقلابات و انتشار کا سامنا کرنے کے باوجود ساتویں صدی تک جبکہ یہ چندر گپت وکرما دتیہ کا پایہ تخت تھا، اس کی اہمیت اور مرکزیت میں کسی طرح کی کمی واقع نہیں ہوئی البتہ جب ساتویں صدی میں ہرش اس علاقہ پر قابض ہوا تو اس نے اپنا پایۂ تخت ایودھیا سے تبدیل کر کے قنوج بنا دیا اور اس کے بعد ہی ملک میں ہر طرف ایسی بے اطمینانی، ہیجان اور غیر یقینی حالت تھی کہ کسی حکومت کو زیادہ عرصہ تک استحکام حاصل نہیں رہا، مختلف طاقتوں کا تصادم، حکمرانوں کی لڑائیاں، سلطنتوں کے نشیب و فراز یہ ساری کشمکش ایسی برپا تھی کہ کوئی جگہ مرکزی حیثیت نہ حاصل کر سکی، کہیں راجپوت طاقت پکڑ رہے تھے کہیں ان کے مخالفین اور یہ سلسلہ تقریباً بارھویں صدی عیسوی تک چلتا رہا جبکہ مسلمانوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اپنی طاقت مضبوط کر کے حکومتیں قائم کر لیں چنانچہ اس درمیان میں تقریباً پانچ سو سال تک اجودھیا کی تاریخ پر بھی تاریکی کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ اسی چیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے Carnegi نے Oudh Gazetters میں لکھا ہے کہ:-

"The History of Ajodhya, however, as of nearly all Hindu Kingdoms between the 7th & 11th centuries, is a mystry." ۶

البتہ اس علاقے میں کچھ ایسی ہی جاذبیت و اہمیت تھی کہ جیسے ہی سیاسی نظام کو مسلمان حکمرانوں کے ذریعہ استحکام حاصل ہوا، اس کی مرکزی حیثیت دوبارہ اُبھرنے لگی۔

مذہبی اعتقاد کی رُو سے تو مسلمان ایودھیا سے اپنا تعلق ابتدائے آفرینش ہی سے قائم کرتے ہیں چنانچہ یہ روایت آج تک مشہور ہے کہ جناب یعقوبؑ، جناب شیثؑ اور حضرت نوحؑ کی قبریں اسی مقام پر ہیں۔ ابو الفضل نے آئینِ اکبری میں بھی اس کا ذکر کیا ہے، وہ لکھتا ہے:-

در ایں شہر دو قبر بزرگ ساختہ اند، شش و ہفت گزی۔ بر خوانند خواب گاہِ شیثؑ و ایوبؑ پندارند و زواخت ہا بر خوانند" ۷

لیکن ان خیالات سے قطع نظر سیاسی طور پر یہ علاقہ مسلمان حکمرانوں کے قبضہ میں بارہویں صدی عیسوی کے ربع آخر میں اس وقت آیا جب محمد غوری نے (۱۱۷۵ء میں) شمالی ہند کے راجپوت راجاؤں کو شکست دے کر دہلی پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ محمد غوری، سلطنت کی باگ ڈور قطب الدین کے ہاتھوں میں سونپ کر خود واپس چلا گیا اور یہی پہلی منزل تھی جب ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مرکزی حکومت کی جانب سے جاگیرداروں کی حیثیت سے حاکم بنا کر بھیجے گئے چنانچہ ایودھیا کے علاقہ میں بختیار خلجی نے صوبہ داری کا عہدہ سنبھالا لیکن جس طرح اس وقت کے بادشاہوں کی حکومتوں میں پے در پے تبدیلیاں ہو رہی تھیں اسی طرح یہ صوبہ دار بھی زیادہ عرصہ تک نہ ٹھہر سکتے تھے چنانچہ یہاں بھی کبھی التتمش کا بیٹا نصیر الدین محمد شاہ (۱۳۲۵ء میں) صوبہ دار رہا کبھی قمر الدین قرآن، کبھی بلبن کی طرف سے فرحت خاں جاگیر دار بنایا گیا کبھی اسے معزول کر کے خواجہ جہاں کو۔ خواجہ جہاں تو محمد تغلق کی طرف سے مشرقی علاقوں کا حاکم مقرر کیا گیا تھا لیکن چودھویں صدی کے آخر میں جبکہ ایک طرف تیمور کے حملہ نے دہلی کی حکومت کو کمزور و تباہ کر دیا تھا دوسری طرف مختلف علاقوں کی بغاوت اور انتشار سے ہر طرف بےچینی پھیلی ہوئی تھی، ان حالات سے فائدہ اٹھا کر اس نے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور جونپور کو پایۂ تخت بنا کر بادشاہ بن بیٹھا۔ وہ جن علاقوں کا حاکم تھا ان میں کڑا، قنوج، ڈلمؤ، سندیلہ، بہرائچ، بہار اور جونپور اضلاع شامل تھے ۸ لیکن اس کی حکومت کو بھی 'اودھ' ہی کا علاقہ مانا جاتا ہے۔ یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ مشرقی حصّہ کے ان اضلاع میں جس بادشاہ کی حکومت بھی رہی اس نے اس کے انتظام کی طرف خاص طور پر دھیان دیا

اس کا ایک خاص سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسی علاقہ کے نظم و نسق پر غالباً مختلف حصّوں کے نظام کا انحصار تھا جس کو مضبوط کئے بغیر حکومت کا استحکام ممکن نہ تھا غالباً اسی پہلو کے پیش نظر جب تغلق عہد میں قنوج سے بنگال تک ہر جگہ فوجی لوٹ مار اور انتشار و ابتری پھیلی ہوئی تھی تو فیروز شاہ تغلق (۱۳۴۳ء اور ۱۳۴۸ء میں) دوبارہ اودھ آیا۔

مغل دور میں جہاں سیاسی حیثیت سے سارے ملک کو اتحاد و استحکام حاصل ہوا وہاں اودھ میں بھی اسی منزل سے ایک باقاعدہ نظام کی بنیاد پڑی۔ چنانچہ ۱۵۲۶ء میں بابر کے تخت نشین ہوتے ہی اس علاقہ پر خاص توجہ کی گئی یہاں تک کہ ۱۵۲۸ء میں اپنی فوج کے ساتھ وہ خود اودھ آیا اور رفتہ رفتہ اس کی اہمیت میں اضافہ ہوتا رہا۔ ہمایوں کے سیاسی نشیب و فراز نے تو اسے اتنا موقع ہی نہ دیا کہ حکومت کو استقلال حاصل ہوتا کہ اسی عرصہ میں شیر شاہ سوری نے قبضہ کر کے سارے ملک کو منظم و مضبوط کرنے پر توجہ دی۔ اس وقت تک جو صوبے قائم تھے شیر شاہ نے ان کی از سر نو تنظیم و تقسیم کر کے انھیں مختلف سرکاروں اور پرگنوں کی شکل دی۔ اس طرح اودھ کا علاقہ بھی کئی سرکاروں میں بٹ گیا تھا لیکن جب اکبر نے مغل شہنشاہ کی حیثیت سے زمام سلطنت سنبھالی تو سارے ملک میں نئی فضا پیدا کرنے کے ساتھ ہر شعبۂ حکومت میں ایسی تبدیلیوں پر توجہ کی گئی جس سے نہ صرف انتظام سلطنت بہتر اور مضبوط ہو بلکہ سماجی و انفرادی زندگی میں بھی ترقی و بلندی کے مواقع حاصل ہو سکیں۔ انھیں تبدیلیوں میں ایک اہم تبدیلی یہ بھی تھی کہ مختلف علاقوں سے جاگیرداری کا نظام ختم کر کے اس نے سارے ملک کو ۱۲ صوبوں میں تقسیم کر دیا۔ ان صوبہ کے حاکموں کو سپہ سالار کہا جاتا تھا جو اپنے علاقوں میں سارے اختیارات کے مالک ہوتے تھے البتہ وہ پوری طرح مرکزی حکومت کے مطیع اور اس کے احکام کے پابند ہوتے تھے۔ انھیں صوبوں میں اودھ بھی ایک اہم صوبہ تھا۔ گو اس کی علاقائی شکل اس طرح قائم ہوئی تھی کہ اس کے ایک طرف گورکھپور سرکار تھی۔ (جس میں موجودہ گورکھپور اور بستی کے اضلاع شامل ہیں۔) دوسری طرف موجودہ فیض آباد ضلع کا نصف مشرقی علاقہ۔ اس تقسیم سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس وقت کے اودھ میں ضلع سلطانپور کا جنوبی و مشرقی

علاقہ اور رائے بریلی ضلع کا جنوبی حصّے شامل نہ تھے بلکہ ان کا تعلق صوبۂ الہ آباد سے تھا۔ اکبر کے دور سے لے کر محمد شاہ تک اودھ کا صوبہ اپنی اسی شکل میں رہا لیکن ڈاکٹر ایشوری پرشاد کے الفاظ میں "دارالحکومت سے دور ہونے اور ذرائع آمد و رفت کی دشواریوں کی وجہ سے ان صوبوں پر بادشاہوں کا اثر پوری طرح نہ رہ پاتا تھا"[۱۵] دوسرے جیسے جیسے مغل حکومت میں زوال و انحطاط بڑھتا رہا، جیسے جیسے ملک میں سیاسی انتشار شدت اختیار کرتے رہے، جیسے جیسے ملک کی اندرونی بغاوتوں اور باہری حملوں سے مرکزی حکومت مجبور و محدود ہوتی گئی اسی طرح مختلف حصّوں میں نیم خود مختار ریاستیں قائم ہوتی گئیں یہاں تک کہ Macaulay کے الفاظ میں "بعض صوبہ دار اتنی بڑی تعداد کی رعایا پر حکومت کرتے تھے جو جرمنی اور فرانس کے بادشاہوں کے برابر تھی اور محمد شاہ کے عہد تک آتے آتے صوبہ داروں کا تعلق دہلی سے اسی حد تک رہ گیا تھا کہ:

> "They might occasionally send to their titular soverign a complimentary present or solicit from him a title of honour. In truth, however, they were no longer lieutenants, removable at pleasure, but independent hereditary princes." [۱۶]

چنانچہ یہی حالات جن میں سعادت خاں نے ۹ ستمبر ۱۷۲۲ء کو اودھ کی صوبہ داری کا عہدہ سنبھالا فیض آباد دار السلطنت بنا اور ایک نئی اسلامی حکومت کے ساتھ ساتھ نئی تہذیبی زندگی، نئی معاشرت اور شعر و ادب کی نئی روایت کی بنیاد پڑی جس کے خطوط چاہے ابتدا میں واضح نہ رہے ہوں لیکن جلد ہی ان میں روشنی اور تابندگی پھیل گئی۔ اسی چیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اشرودی لال سریواستوا لکھتے ہیں کہ:

> "Its geographical situation, equable climate and fertility of soil gave it an unique place among the provinces of Mughal India. While its multifarious products filled the coffers of the emperors, its hardy and martial population swelled the ranks of the imperial forces. It continued virtually to be a province of the decaying Empire till 1722 when Saadat Khan, the new governor laid the foundation, infact, if not in name, of an independent Muslim Dynasty under whose rule Lucknow, its capital, prospered to rival Delhi in wealth, magnificence and culture." [۱۷]

اودھ کے ان حکمرانوں نے اپنی انفرادی صلاحیتوں اور انتظامی تجربات سے اس سلطنت کو کس طرح ترقی دی اس کا مختصراً جائزہ لینا بھی ضروری ہے جس کے مطالعہ کے بغیر اس پس منظر کو نہیں سمجھا جا سکتا جس سے اسے مرکزی اور امتیازی حیثیت حاصل ہوتی گئی۔

سعادت خاں

یہ عجب حُسنِ اتفاق ہے کہ جس دَور میں ہندستان میں مغلیہ سلطنت اپنے عروج پر تھی تقریباً وہی زمانہ ایران میں صفوی بادشاہوں کی عظمت کا بھی تھا، دونوں حکومتوں میں اہل علم و اہل فن کو قدر و منزلت حاصل تھی اور ان میں ایسے دوستانہ تعلقات تھے کہ وقت پڑنے پر ہمایوں کو شاہ طہماسپ سے فوجی امداد بھی حاصل ہوئی اور سلطنت کی تعمیر و ترقی اور عظمت کے لیے اکبر، جہاں گیر اور شاہ جہاں نے بڑے بڑے ماہرین اور فنکار بھی وہاں سے بلا کر جمع کر لیے۔ یہ قربت یہاں تک بڑھی کہ صفوی حکومت کے زوال کے بعد ایران کے اعلیٰ خاندان کے افراد ہندوستان میں تلاش روزگار کے سلسلہ میں بھی آنے لگے بلکہ مغل سلطنت کے انحطاط کے دور میں تو یہ نوبت آ گئی تھی کہ مقامی حکام کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے ان ایرانی افراد کو ترجیح دی جاتی تھی تاکہ نظام میں ابتری و کشمکش پیدا نہ ہونے پائے۔ انھیں حالات میں شاہ عباس صفوی (دوم) کے وزیر رضا قلی بیگ کے داماد محمد نصیر بھی اپنے بڑے بیٹے محمد باقر کے ساتھ ہندستان آئے اور پٹنہ میں مرشد قلی خاں جاگیر دار سے "مدد معاش" حاصل رہی۔ محمد نصیر کے دوسرے بیٹے محمد امین بھی کچھ دنوں بعد پٹنہ آ گئے لیکن ان کے آنے سے پہلے ہی والد کا انتقال ہو چکا تھا اور جب وہاں کوئی ذریعۂ روزگار نہ مل سکا تو ۱۷۰۹ء میں دہلی آ گئے اور یہیں سے ان کی زندگی کا وہ دَور شروع ہوتا ہے جس میں مسلسل کامیابیاں حاصل کرتے ہوئے وہ پہلے "سعادت خان" اور بعد میں "برہان الملک" ایسے خطابات سے شہرت پا گئے۔

اٹھارہویں صدی کے ہندوستان میں جہاں مغل شہنشاہ کو آئے دن بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑتا رہتا تھا، جہاں راجاؤں اور فوجیوں کی سرکشی معمولات بن چکے تھے۔ وہاں کامیابی اور ترقی حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ فوجی حکمت عملی، بہادری اور حوصلہ مندی ہی ہو سکتی تھی۔ محمد امین میں ذہانت و ہوشمندی کے ساتھ ساتھ یہ صفات پوری طرح موجود تھیں جس کے نتیجہ میں (کڑا مانک پور کے فوجدار سر بلند خاں کے) معمولی فوجی سردار سے بڑھتے بڑھتے وہ ایک اہم حکومت کے مالک بن گئے۔ سر بلند خاں کی ملازمت انھوں نے ناراض ہو کر چھوڑی تھی اور دہلی اس لیے واپس گئے تھے کہ کوئی دوسرا ذریعہ معاش تلاش کریں یہاں خوش قسمتی ان کے قدم چومنے کی منتظر تھی اور فرخ سیر کی فوج میں ملازمت حاصل کرتے ہی ۱۷۱۳ء میں "ہفت ہزاری" کا اعزاز حاصل کر لیا۔ محمد شاہ کی نظرِ انتخاب زیادہ تیز اور قدر شناس تھی اس نے تخت پر بیٹھتے ہی محمد امین کے سر کئی اہم ذمہ داریاں سونپ دیں اور کسی منزل پر ان کی طرف سے اسے مایوسی نہ ہوئی۔ کبھی صوبۂ آگرہ کے بیانہ اور ہنڈوان اضلاع کی بغاوت ختم کر کے فوجدار بن گئے، کبھی صوبۂ الہ آباد کے گورنر راجہ گردھر بہادر کی سرکشی مٹا کر کمانڈر کا عہدہ حاصل کیا اور ایک منزل وہ بھی آئی کہ بادشاہ کی خوشنودی کے لیے اپنے محسن و ہمدرد "سید برادران" کے گروہ کے اہم رکن حسین علی کے قتل کی سازش میں شریک ہونے سے بھی دریغ نہ کیا اور اس کارنامہ کے انجام دینے پر ان کو "سعادت خاں بہادر" کے خطاب سے سرفراز کیا گیا' اور ڈاکٹر اشرادی لال سریواستوا کے الفاظ میں "اس طرح بیانہ اور ہنڈوانہ کی سرداری حاصل کرنے کے سال ہی بھر بعد سعادت خاں "پنج ہزاری" کے مرتبہ پر پہنچ گئے[۲۲]" اب وہ محمد شاہ کے معتمد ترین افسروں میں شامل ہو چکے تھے اور "چھ ہزاری" کا منصب دے کر ۱۵ اکتوبر ۱۷۲۰ء کو آگرہ کا صوبہ دار بنا دیا گیا۔ اسی زمانہ میں "۱۲ جنوری ۱۷۲۱ء کو ان کو داروغہ خواصان" Captain of the Imperial Body guards کا اعزاز بھی ملا"[۲۳]

اس زمانے میں اودھ میں بھی شدید بدنظمی پھیلتی جا رہی تھی اور جب لمبے عرصہ تک دبایا نہ جا سکا تو اس کے لیے بھی سعادت خاں ہی کا انتخاب ہوا اس طرح وہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں پوری طرح سے ایک نئی حکومت کی بنیادیں قائم ہو گئیں۔ محمد امین کے ابتدائی حالات سے لے کر اودھ کی صوبہ داری حاصل کرنے تک کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے کنور درگا پرشاد لکھتے ہیں کہ :-

"..... بعد قطع منازل و مراحل بہ دار الخلافت دہلی رسید

رفتہ رفتہ با راجہ رتن چند، دیوان عبداللہ خاں قطب الملک
وزیر فرخ سیر طرح تالف و تعارف افگندو از قدردانی و مردم
شناسی او حکومت ہنڈون بیانہ حاصل نمود، مدتے
سمندِ حکومت دراں سرزمین بجولاں در آورد، ہنگامیکہ
حضرت محمد شاہ متمکن سریر سلطنت شدند، و امیرالامراء
حسین علی خاں برادرِ عبداللہ خاں قطب الملک بایماء
اعتماد الدولہ محمد امین خاں از دستِ حیدر علی خاں کشتہ
گردید و عزت خاں ہمشیر زادۂ امیرالامراء با فوجِ کثیر و
جمعیت ساداتِ بارہہ بر حضرت بادشاہ یورش نمود دراں
وقت سعادت خاں با پانچ ہزار سوار خنجر گداز خود را
بموکبِ سلطانی رسانیدہ ترددات نمایاں بجا آورد،
بظہور ایں خدمتِ شائستہ، و ایں کار بایستہ از پیشگاہ
حضرت بادشاہ بخطاب سعادت خاں بہادر مخاطب گردید،
بعد چندے بہ صوبہ دارئ اکبرآباد امتیاز یافت بفارن
ایں حال کیفیتِ بدنظمئ صوبہ اودھ معروضِ عاکفانِ
پایۂ سریر خلافت گردید، آنحضرت درخور ایں خدمت
سعادت خاں بہادر دانستہ بہ صوبہ دارئ اودھ امتیاز
بخشیدند، سعادت خاں با فواجِ جرار و سپاہِ خنجر گذار
بہ اودھ آمد "[۱۴]

اور ۹ ستمبر ۱۷۲۲ء کو اودھ کی صوبہ داری کا عہدہ بھی سنبھالا اور ساتھ ہی ساتھ گورکھپور کی فوجداری بھی سونپی گئی۔ اودھ کا علاقہ اکبر ہی کے عہد میں ایک اہم صوبہ بن چکا تھا اور اس وقت سے لے کر سعادت خاں کی صوبہ داری حاصل کرنے تک اس میں خیرآباد، فیض آباد، گورکھپور بہرائچ اور لکھنؤ یہ پانچ اضلاع شامل تھے۔ اس کے محل وقوع اور حدود اربعہ کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر اشرواوی لال سریواستوا لکھتے ہیں کہ:۔

"شمال میں ہمالیہ کی پوربی چوٹیاں، مشرق میں بہار، جنوب میں (صوبۂ الہ آباد کے) مانک پور تک اور مغرب میں قنوج تک۔ گورکھپور کے مشرقی حصے سے قنوج تک
تقریباً ۲۷۰ میل لمبائی اور شمالی پہاڑی سے لے کر مانک پور
ریاست کے شمالی حدود تک ۲۳۰ میل چوڑائی تھی' ان
سب کا رقبہ ایک کروڑ ایک لاکھ اکہتر ہزار اسّی بیگہ تھا"[۱۵]

اس سارے علاقے میں مختلف راجاؤں، جاگیرداروں اور زمینداروں نے اورنگ زیب ہی کے وقت سے بدنظمی و انتشار پھیلا رکھا تھا' خاص کر لکھنؤ کے شیخ زادے ایسے شورہ پشت تھے کہ ان کو قابو میں کرنا بہت بڑا مسئلہ تھا۔ سب سے پہلے ان کی طاقت و دبدبہ کو سعادت خاں نے لکھنؤ میں قدم رکھتے ہی اس طرح مٹا دیا کہ "شیخ زادوں" کے پھاٹک پر جو ننگی تلوار اس لیے لٹکتی رہتی تھی کہ ہر آنے والا اس کی تعظیم کرے' اس تلوار کو گرا دیا اور شیخ زادوں کو شکست دے کر شیخ عبدالرحیم کے "پنچ محلہ" کو اپنی رہائش کے لیے خالی کرا لیا۔ اور بعد میں تلوئی، پرتاپ گڑھ، گونڈہ، رسول پور، بلرام پور اور راناؤ (بواڑہ) کے راجاؤں اور جاگیرداروں نے جو انتشار و ہیجان پھیلا رکھا تھا اس پر قابو کر کے امن و سکون کی فضا قائم کی اور اجودھیا کے قریب اپنا "بنگلہ" قائم کر کے ایک نئے شہر کی بنیاد ڈالی جو بعد میں فیض آباد کے نام سے نئی حکومت کا دارالسلطنت بنا۔ اب انھوں نے ساری توجہ اس بات پر صرف کرنی شروع کر دی کہ حکومت کی آمدنی میں اضافہ بھی ہو سکے اور رعایا کی فلاح و بہبود کے ذرائع بھی بڑھتے رہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے جو بند و بست کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہی علاقہ جس کی آمدنی پہلے کبھی ستر لاکھ روپیہ سے زیادہ نہ تھی اسی سے "سعادت خاں در سالِ اول یک کرور ہفت لک روپیہ تحصیل فرمود و در سالِ دوم و سوم جمع دو کرور روپیہ تشخیص نمود"[۱۶] اس کامیابی سے محمد شاہ کی نظر میں ان کی قدر و منزلت اور بڑھ گئی اور انھیں "برہان الملک" کا خطاب دے کر ان کارناموں کو سراہا گیا۔
بعض انگریز مؤرخین، جن کی نظر میں اودھ کے سبھی حکمراں' نااہل اور رعایا کی بہبود و انتظام حکومت سے غافل تھے' وہ بھی سعادت خاں کی ان صلاحیتوں کا اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکے چنانچہ H.C. IRWIN نے اپنی کتاب The Garden of India میں لکھا ہے کہ:۔

Saadat Khan's policy in Oudh seems to have been to cherish the peasantry, and to keep in check the encroachments of the larger

land holders and he was probably the first to make the power ofacomprativtely strong central govt. felt throughout the Province. [۱۷]

ان انتظامات سے محمد شاہ اتنا متاثر اور مطمئن تھا کہ کسی طرح کا دخل دینا مناسب نہ سمجھتا تھا چنانچہ ایک خود مختار حکمراں کی طرح وہ حکومت کی وسعت بڑھانے پر متوجہ ہوئے اور ۱۷۲۸ء میں مرتضیٰ خاں جاگیردار سے بنارس، جونپور، غازی پور اور چنار کی سرکار پٹہ پر حاصل کر لی، ان اضلاع کی اہمیت اس لیے بھی تھی کہ

As these dists. lay on the eastern boundry of Awadh, Saadat Khan found his eastern frontier automatically pushed to the limit of the modern U.P. in that direction. [۱۸]

سعادت خاں معمولی فوجی افسر سے اتنی بڑی حکومت کے مالک بنے تھے اس لیے انھیں ان درباری سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا بھی تجربہ تھا جو ملک کے مختلف حکمرانوں کے خلاف سر اٹھاتی رہتی تھیں، محمد شاہ کے بعض مشیروں اور خاص کر امیر الامرا خانِ دوراں کی طرف سے بھی غافل نہ تھے، انھیں باتوں کے پیشِ نظر اودھ میں وہ اپنے ساتھ کسی ایسے شخص کو رکھنا چاہتے تھے جس پر پوری طرح اعتماد بھی کر سکیں اور جو اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے پوری طرح ان سے قریب بھی ہو۔ چنانچہ انھوں نے اودھ کی صوبہ داری حاصل کرنے کے دوسرے ہی سال نیشا پور سے اپنے بھانجے محمد مقیم کو بلا کر اپنی بڑی بیٹی سے شادی کر دی، محمد شاہ کی طرف سے ان کے لیے نائب صوبہ داری کا عہدہ حاصل کر کے "ابو المنصور" کا خطاب دلا دیا۔ اس طرح اپنا جانشین بنا کر بہت سی فوجی و CIVIL ذمہ داریاں بھی سونپ دیں اور خود انھیں یہ موقع بھی مل گیا کہ مرکزی دارالسلطنت میں قیام کر کے ملکی معاملات میں اپنا دخل و اقتدار قائم رکھ سکیں۔ دہلی کی سیاست میں ایرانی و تورانی گروہ بندی جس کے باہمی مناقشات نے بقول ڈاکٹر محمد حسن "مستقل آویزش کی شکل اختیار کر لی تھی"[۱۹] اس کے نشیب و فراز سے بھی انھیں پوری واقفیت رکھنا ضروری تھی کیونکہ یہ خطرہ لاحق تھا کہ ذرا سی غفلت ان کے ایرانی گروہ کے اثر و اقتدار کو برباد کر سکتی ہے۔ لیکن ان تمام احتیاطی تدابیر کے بعد بھی آخر سعادت خاںؔ تورانی گروہ

کی سازشوں کا شکار ہو ہی گئے، اور ۱۷۳۶ء میں محمد شاہ کی خاطر دکن کے مرہٹہ سردار پیشوا باجی راؤ کو شکست دینے کے باوجود بادشاہ کی نظر میں ان کی یہ جنگ مناسب نہ تھی۔ اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صاحبِ بوستانِ اودھ لکھتے ہیں:۔

"۱۷۳۶ء میں دکن کا پیشوا باجی راؤ، چوتھ کی رقم وصول کرنے دہلی کی طرف چلا، اس نے دہلی پہنچ کر قتل و غارت گری شروع کر دی۔ بادشاہ کے پاس چار لاکھ سے کم فوج نہ تھی، پھر بھی مقابلہ نہ کر سکا اور باجی راؤ کے شرائط ماننا پڑے۔ اس کامیابی سے باجی راؤ کا دماغ چڑھ گیا اور برابر بدامنی پھیلاتا رہا۔ سعادت خاں کی شجاعت اسے برداشت نہ کر سکی اور یکایک اس کی فوج پر حملہ کر دیا۔ اس اچانک حملے سے باجی راؤ گھبرا کر مصالحت پر تیار ہو گیا، اسی عرصہ میں خانِ دوراں جو امیر الامرا تھے وہ سعادت خاں کی فتح سے حسد کرنے اور بادشاہ کو ان کے خلاف بھڑکا دیا، بادشاہ نے (سعادت خاں کو) لکھا کہ اسے ہمارے معاملات میں دخل نہ دینا چاہیئے، آخر کار سعادت خاں نے باجی راؤ سے صلح کر لی اور لکھنؤ آ گئے"[۲۰]

ان سیاسی مناقشات نے ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کے حملہ کے وقت ایسی شدت اختیار کر لی کہ دہلی کو قتل و غارت گری کے لرزہ خیز حالات کا سامنا بھی کرنا پڑا اور یہاں تک کہ سعادت خاں ایسے حوصلہ مند اور باعزم حکمراں کو موت کے دامن میں پناہ لینی پڑی۔ نادر شاہ جب دہلی کی طرف بڑھا تو سعادت خاں اس کے مقابلہ کے لیے روانہ ہوئے اور اسے اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ دو کروڑ روپیہ لے کر واپس چلا جائے۔ ابھی یہ شرط پوری نہ ہوئی تھی کہ تورانی گروہ کی طرف اس صلح کی کامیابی کا سہرہ آصف جاہ کے سر باندھ دیا گیا اور یہ بات مشہور ہو گئی کہ یہ معاملات اسی کی وجہ سے طے ہوئے ہیں۔ خود محمد شاہ بھی حقائق سے واقف نہ تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے اس کارگزاری پر آصف جاہ کو "امیر الامرا" کے عہدہ پر فائز کر دیا۔ ان حالات سے کبیدہ خاطر ہو کر سعادت خاں نے کنارہ کشی اختیار کر لی اور نادر شاہ کو سب باتوں سے آگاہ کرتے

ہوئے اطلاع دے دی کہ ان معاملات سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ نادر شاہ کا ظلم و جلال اسے برداشت نہ کر سکا اور آصف جاہ کو قید کر کے دلی میں قتل و خون اور تباہی و بربادی کا بازار ایسا گرم ہوا جس کی مثال تاریخ عالم میں مشکل ہی سے ملے گی۔ ابھی یہ ہنگامہ پوری طرح مٹا بھی نہیں تھا کہ عام مؤرخین کے مطابق سعادت خاں نے زہر کا پیالہ پی کر خودکشی کر لی، بعض مؤرخین نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ ۱۹ مارچ ۱۷۳۹ء کو ان کی موت اچانک واقع ہو گئی۔ بہرحال اپنے سترہ سالہ دورِ صوبہ داری میں ایک سلطنت کی بنیاد دے کر اسے ترقی و خوشحالی کی جس منزل تک پہنچا دیا یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ان کی موت کے وقت اودھ میں ۲۲ ہزار فوج اور پچاس توپیں تھیں اور "خزانہ میں کئی کروڑ روپیہ موجود تھا۔"[۲۱]

صفدر جنگ

ابھی دلی پر نادر شاہ ہی کی حکمرانی تھی کہ اودھ کی صوبہ داری کا مسئلہ پیش آیا۔ ایک طرف سعادت خاں کے بھتیجے شیر جنگ کوشاں تھے۔ دوسری طرف ابوالمنصور محمد مقیم جو نہ صرف سعادت خاں کے داماد بلکہ ان کے بیٹے کی طرح تھے اور جو ان کے جانشین اور نائب کی حیثیت سے تقریباً ۱۵ سال تک سیاسی پیچ و خم کے تجربات بھی حاصل کر چکے تھے اور فوجی و ملکی انتظام کی پوری مہارت بھی۔ ظاہر ہے عام حالات میں تو محمد مقیم کے علاوہ کسی دوسرے پر نظرِ انتخاب کا سوال ہی نہ تھا، لیکن نادر شاہ کو نہ ان حقائق سے کوئی سروکار تھا نہ وہ ابوالمنصور کے وکیل راجہ لچھمی نرائن کی عرضداشت کے ان جملوں سے متاثر ہو سکتا تھا کہ "وہ ایماندار، قابلِ اعتماد اور خدا ترس انسان ہیں، انتظامِ حکومت کی فطری صلاحیت ہے اور سعادت خاں کے فوجیوں میں کافی مقبولیت حاصل ہے۔" البتہ اس کے نفسیاتی تقاضوں کو جس چیز سے تسکین مل سکتی تھی لچھمی نرائن نے اس کا اظہار بھی اس طرح کر دیا تھا کہ "تقرری کے بعد دو کروڑ روپے نذر کے طور پر بھی پیش کیے جائیں گے اور حقیقتاً اسی پر فیصلہ کا انحصار تھا۔" نادر شاہ نے لچھمی نرائن کے ساتھ دو سو قزلباش فوجی اودھ بھیجے تاکہ وہ رقم لے جائیں۔ اودھ سے ایک کروڑ اسی لاکھ کا انتظام ہو سکا اور بقیہ ۲۰ لاکھ روپیہ محمد مقیم ابوالمنصور نے سعادت خاں کے دلی کی رہائش گاہ سے حاصل کی اور اس طرح دو کروڑ روپے کر کے "بہت سے قیمتی تحائف اور ایک ہاتھی نادر شاہ کی خدمت میں پیش کر دیے گئے۔" چنانچہ اس طرح "ابوالمنصور محمد مقیم" کو اودھ کا صوبہ دار مقرر کر دیا گیا اور محمد شاہ کی طرف سے "صفدر جنگ" کا خطاب ملا۔

انتظامِ حکومت سنبھالتے ہی صفدر جنگ کو بھی انھیں تمام مسائل کا سامنا کرنا پڑا جس سے سعادت خاں ہمیشہ الجھے رہے۔ دلی کی درباری سازشیں، مختلف راجاؤں کی سرکشی اور ساتھ ہی ساتھ فوج اور رعایا کی بہبود و خوشحالی، وہ کسی طرف سے غفلت نہیں برت سکتے تھے اور یہ ان کی غیر معمولی صلاحیت اور ہوشمندی کا نتیجہ تھا کہ شدید سے شدید ہیجانی و انتشاری حالات میں بھی ہر شعبہ میں کامیابی حاصل کرتے رہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان کامیابیوں کے پیچھے ان کے اسی "ایرانی گروہ" کی جد و جہد بھی شامل ہے جس کے وہ اہم رکن تھے اور راجہ نول رائے، راجہ اندر گیر گوشائیں، راجہ لچھمی نرائن اور راجہ رام نرائن ایسے مخلص، وفادار اور بے لوث افراد کی کارگزاریاں بھی جو اس دور کے بہت کم حکمرانوں کو میسر تھیں۔ ان مختلف عناصر کے اشتراک سے صفدر جنگ نے بہت سے باغی راجاؤں، روہیلوں اور بنگشوں کی سرکشی مٹا کر اودھ میں پوری طرح امن و سکون بھی پیدا کر دیا اور محمد شاہ کا اعتماد حاصل کر کے "میر آتش" کا مرتبہ بھی حاصل کر لیا اور کشمیر کی صوبہ داری بھی۔ محمد شاہ پر ان کا اتنا گہرا اثر قائم ہو چکا تھا کہ حکومت کا سارا انتظام ایک طرح سے صفدر جنگ ہی کے سہارے چل رہا تھا، خود ان کا تجمل اور شاہانہ اقتدار کی مثال کے لیے ان کے بیٹے جلال الدین حیدر کی شان و شوکت کا ذکر کافی ہے جس میں "چہل و شش لکھہ روپیہ بمصرف در آمدہ بود" اور جس کی "رسم ساچق" کا ذکر کرتے ہوئے اشرواد ی لال لکھتے ہیں:۔

> "شاہی قلعہ سے کوٹلہ فیروز شاہ تک پھلوں، مٹھائیوں، جوڑوں، زیوروں اور عطر کی شیشیوں سے بھری ہوئی کشتیوں کے علاوہ کچھ اور دکھائی نہ دیتا تھا۔ منقش برتنوں، پیالوں اور پلیٹوں کا شمار ممکن نہ تھا اور اسی کے ساتھ چاندی اور سونے کے لاتعداد برتن ایسے نظر آتے تھے جن میں کوئی بھی سو روپیہ سے کم قیمت کا نہ رہا ہو گا۔"[۲۲]

دولت ونشاط کی یہ فراوانی اسی لئے تھی کہ صفدر جنگ کے حصولِ اقتدار کے پانچ چھ برسوں میں اودھ کی سیاسی حالت بھی مستحکم ہو چکی تھی اور معاشی واقتصادی حیثیت سے پوری طرح خوشحال بھی بن چکا تھا۔ مغلیہ دورِ حکومت کی دلی کی تہذیبی عظمت وتابناکی، قوت وزندگی اور عیش ونشاط کے عناصر، جو کشمکش وسراسیمگی میں چراغِ سحری کی طرح بجھنے سے پہلے بھڑک رہے تھے اسے اودھ میں روشنی پھیلانے کا موقع مل گیا۔

درحقیقت صفدر جنگ پر اودھ کے ساتھ ساتھ ایک طرح سے ملکی و بیرونی بھی خطرات وہیجانات سے تحفظ کی ذمہ داری آپڑی تھی اور یہی سبب تھا کہ احمد شاہ ابدالی کے مقابلہ کے لئے بھی وہی گئے۔

محمد شاہ کے آخری دور اور ۱۷۴۸ء میں احمد شاہ کی تخت نشینی کے بعد ملکی خانہ جنگی اور احمد شاہ ابدالی کے حملے نے بادشاہ، امرا اور عوام کو اتنا مجبور و بے بس بنا دیا تھا کہ انھیں سکون کی سانس لینا بھی ممکن نہ تھا، ان حالات میں ہر ایک کی نظر صفدر جنگ ہی پر تھی، وہی خطرات کا مقابلہ کر کے سہارا دے سکتے ہیں۔ احمد شاہ نے نہ صرف ان کو اپنا وزیر بنا دیا بلکہ "منتظم غسل خانہ" کا عہدہ دے کر اندرونی وملکی ساری ذمہ داریاں سونپ دیں، اودھ کے علاوہ اجمیر کے صوبہ دار بھی بنا دیے گئے۔ نزول کے فوجدار بھی ہو گئے، ان کے بیٹے جلال الدین حیدر کو "شجاع الدولہ" کا خطاب دے کر SUPDT. OF IMPERIAL ARMY بنا دیا گیا اور بعد میں "بخشی" اور بہت سے دوسرے عہدے بھی مل گئے۔

یہاں ان خیالات سے بحث مقصود نہیں ہے کہ بادشاہ اپنی مجبوری و کمزوری کے احساس کے تحت صفدر جنگ کو سارے اختیارات دیتا جا رہا تھا یا اسے ان سے بہتر منتظم و باصلاحیت شخصیت مل نہ سکتی تھی لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں مغلیہ سلطنت کے سارے اختیارات صفدر جنگ ہی کو حاصل ہو چکے تھے جو ایک ذمہ دار اور حوصلہ مند حاکم کی طرح اپنے فرائض بھی نبھا رہے تھے اور اودھ کی اس حکومت کی ترقی وعظمت کی طرف بھی متوجہ رہے جسے وہ اپنی ذاتی اور خاندانی ملکیت سمجھتے تھے۔

جس طرح صفدر جنگ کو اودھ کی صوبہ داری ایک طرح سے جانشینی کے طور پر ملی تھی، اسی طرح ایرانی اور تورانی گروہ کے مناقشات بھی سعادت خاں سے ورثہ میں ملے اور آخری ۵، ۶ برسوں میں ان کے نشیب وفراز میں بُری طرح الجھے رہے۔ جب تک باہمی اختلافات محض ایک دوسرے گروہ کو نیچا دکھانے تک محدود رہے اس وقت تک تو صفدر جنگ بادشاہ یا تورانی امرا سے براہِ راست ٹکر لینے سے گریز کرتے ہوئے سارے فرائض پوری طرح نبھاتے رہے لیکن جب سازشوں کا حصار ایسا پست بن گیا کہ ادھم بائی رقاصہ اور اس کے بیٹے جاوید خاں خواجہ سرا کے زیرِ اثر احمد شاہ خود بھی ملک کے مفاد اور وقار کو نظر انداز کر کے صفدر جنگ کو الگ کر دینے کے درپے ہو گیا تو ان کے لیے برداشت سے باہر تھا۔ ادھم بائی کو شاہی حرم میں داخل کر کے بہت سے خطابات سے سرفراز فرمایا گیا تھا"[۲۳] اور "تمام شاہی اختیارات جاوید خاں کے ہاتھ میں آگئے تھے جس نے حرم کو عورتوں سے بھر دیا تھا۔ محل سے ایک ایک کوس تک چاروں طرف خوبصورت عورتیں نظر آتی تھیں، خود بادشاہ (احمد شاہ) کے گرد اوباشوں کا ہجوم تھا"[۲۴]

ڈاکٹر محمد حسن کے یہ جملے اور دوسرے مؤرخین و ماہرین کی دربار کے غیر سنجیدہ ماحول کی عکاسی، اس بات کا پوری طرح احساس دلا دیتی ہے کہ حالات ایسے بدتر ہو چکے تھے کہ ان میں بہتری پیدا کرنا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ اسی دور کے ایک مؤرخ نے کھل کر کہہ دیا تھا کہ:

"راقم حروف گوید کہ بایں نازک مزاجی وآسائش شہر جہان آباد ویران وسلطنت ہندوستان خراب وابتر گشت"[۲۵]

صفدر جنگ کی شجاعت وحوصلہ مندی اپنے اوپر قاتلانہ حملوں کو تو نظر انداز کر گئی تھی لیکن ان کی حمیت وخودداری سے یہ برداشت نہ ہو سکا کہ دربار کی عظیم روایات اور اس کے وقار کو بدنام ہوتے دیکھ سکیں، چنانچہ ۱۷۵۲ء میں انھوں نے جاوید خاں کو قتل کرا دیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ صفدر جنگ اور احمد شاہ میں کھل کر مقابلہ شروع ہو گیا۔ یہ مقابلہ محض سیاسی نہ رہ گیا بلکہ فوجی صف آرائی بھی شروع ہو گئی اور بادشاہ کی شہ پا کر عماد الملک نے پوری کوشش کی کہ صفدر جنگ اور ان کے گروہ کو مٹا دیا جائے لیکن احمد شاہ کے فوجیوں کی جو حالت

تھی ان میں یہ ممکن نہ ہو سکا تو وہ مصالحت کی گفتگو پر رضامند ہو گیا ـــ صفدر جنگ بھی دہلی کی ہنگامی زندگی سے بیزار ہو چکے تھے چنانچہ وہاں کے عہدوں سے الگ ہو جانا ہی بہتر سمجھا اور اس طرح دسمبر ۱۷۵۳ء میں اودھ واپس آگئے۔ اب ان کے پیشِ نظر محض ایک مقصد رہ گیا تھا کہ اس سلطنت میں امن و سکون، قانون و انصاف کی مستحکم فضا قائم کر کے اس ریاست کو اتنا خوشحال و دلکش بنا دیں کہ دہلی اور دوسری ریاستوں کے لیے قابلِ رشک بن سکے اور اپنی کوششوں میں کافی حد تک کامیاب ہوئے اور جب اکتوبر ۱۷۵۴ء میں ان کا انتقال ہوا تو اس وقت جہاں دوسرے صوبوں میں بدامنی، انتشار و ہیجان اور انحطاط کی کیفیات چھائی ہوئی تھیں وہاں اودھ میں قانونی و انتظامی استحکام نے ڈاکٹر آشیرواد لال کے الفاظ میں ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ

"Which kept the strong and unruly in check and created a feeling of security of life and property, gave an impetus for the development of liberal art and profitable industries and made Awadh evolve a distinct type of culture.. [۲۶]

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، عہدِ اکبر سے لے کر برہان الملک سعادت خاں کے ابتدائی دور تک اودھ کے علاقائی حدود تقریباً ایک ہی شکل میں قائم تھے، سعادت خاں نے بھینڈی کی ریاست اور صوبہ الہ آباد کے بنارس، غازی پور، اعظم گڑھ، بلیا کے اضلاع اور ضلع مرزاپور کا مشرقی حصہ شامل کر کے اس کی وسعت کی طرف پہلا قدم اٹھایا تھا اور ۱۷۴۸ء میں صفدر جنگ نے اپنی حکمتِ عملی سے پورا الہ آباد کا صوبہ اپنی حکومت میں شامل کر کے اودھ کو مشرق میں بہار جنوب میں مدھیہ پردیش اور مغرب میں مغل دور کے صوبہ آگرہ تک پھیلا دیا۔ صفدر جنگ کے بعد واقع ہونے والے سیاسی نشیب و فراز کے زیرِ اثر یہ علاقہ محدود و منقسم ضرور ہوتا گیا لیکن اس سے یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہ ہوگی کہ صفدر جنگ نے کتنی عریض و وسیع حکومت کو نہایت مختصر مدت میں استحکام و خوشحالی بخشی اور یہ ان کی صلاحیتوں کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ انھوں نے فوجیوں میں اپنا اثر اس طرح قائم رکھا تھا کہ "معائنہ کے وقت جس سوار پر خصوصی نظر پڑ جاتی تھی اس کی تنخواہ میں دس روپیہ اور جس پیادے پر توجہ ہو جاتی تھی اس کی تنخواہ میں ۲ روپیہ ماہوار اضافہ ہو جاتا[۲۴]" امرا اور عوام میں اس طرح مقبولیت حاصل کی کہ "جب کبھی کوئی نادار انسان ان سے سوال کرتا تو اس کا کلام منقطع ہوتے ہی اسے پچاس اشرفیاں دیدیتے اور بہت سے نادار سیدوں کی وہ جاگیریں بھی واپس کر دیں جو مقامی عاملوں نے ضبط کر لی تھیں" اور[۲۵] علما، شعرا اور فنکاروں کو انعام و اکرام سے ہمت افزائی کر کے علمی و تہذیبی عظمت پر توجہ دی، غرضیکہ ترقی کے کسی پہلو کو نظر انداز نہ کیا جس کا ایک خوشگوار نتیجہ ڈاکٹر محمد تقی احمد کے الفاظ میں "یہ بھی ہوا کہ سلطنتِ مغلیہ کے دورِ زوال میں دہلی کی اعلیٰ درجہ کی تہذیب اور وہاں کے تمدن کو سلطنت کی تباہی سے ایسا سخت صدمہ نہیں اٹھانا پڑا جیسا کہ قدرتاً امید کی جا سکتی تھی اس لیے کہ یہ نئی سلطنت اس بارِ عظیم کو اٹھانے کے لیے تیار ہو گئی"۔

صفدر جنگ کے بعد ان کے بیٹے شجاع الدولہ نے دہلی کی مرکزی سلطنت کی تباہی و زوال کا بخوبی اندازہ کر لیا تھا اس لیے انھوں نے وہاں کی سیاست سے کنارہ کشی کر کے خود اپنی حکومت کی عظمت و شان و شوکت پر توجہ مرکوز کی۔ اب اودھ کی حکومت اتنی مضبوط اور ممتاز ہو چکی تھی کہ دوسری ریاستوں کے حکمراں خود اس سے امداد کے طالب رہتے تھے۔ انھوں نے اقتصادی اور معاشی حیثیت سے ساری ریاست کو اتنا خوشحال بنا دیا تھا کہ رؤسا اور امرا کے علاوہ عوام میں بھی عیش و عشرت اور نشاط و آسائش کی کیفیات چھائی ہوئی تھیں، سارے ماحول میں زندہ دلی، سکون اور اطمینان کی لہر پھیل رہی تھی، سماجی زندگی میں اربابِ نشاط اور ماہرینِ فن کی قدر کی جانے لگی تھی اور یہی حالات تھے جن میں دہلی اور دوسری جگہوں کے مایوس و پریشان حال امرا اور فنکاروں کو اپنے لیے ایک جائے پناہ نظر آئی جہاں وہ اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کر سکتے تھے چنانچہ سب اسی مرکز کی طرف رجوع ہو گئے۔

اب اودھ کو کسی ہندوستانی راجہ یا مہاراجہ سے خطرہ تو نہیں تھا لیکن ملک میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی شکل میں غیر ملکی طاقت کا جو اثر پھیلتا جا رہا تھا اسے زائل کرنا سب سے بڑا مسئلہ تھا اور شجاع الدولہ ایسے ماہر اور ہوشمند سیاست داں نے محسوس کر لیا تھا کہ اس خطرہ سے وہ

بھی محفوظ نہیں رہ سکے۔ چنانچہ سب سے پہلے ۱۷۶۴ء میں میر قاسم کی مدد کے طور پر بکسر کے مقام پر انھوں نے انگریزوں کا مقابلہ کیا لیکن یہ طاقت ان کے اندازے سے زیادہ منظم اور مضبوط نکلی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو شکست اٹھانی پڑی۔ پھر بھی وہ مایوس نہ ہوئے اور کوڑہ جہان آباد میں مرہٹوں کی مدد لے کر دوبارہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج کا مقابلہ کیا لیکن حالات نے ساتھ نہ دیا اور پھر شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اب ان کے لیے سوائے صلح کرنے کے کوئی چارہ نہ تھا لہٰذا ۱۶ اگست ۱۷۶۵ء کے الٰہ آباد کے شرائط نامہ کے سارے پہلو ان کو قبول کرنا پڑے اور یہیں سے اندازہ ہونے لگتا ہے کہ ڈاکٹر ہاف مین (-Dr. Haffman -) کے الفاظ میں:

"How from 1765 till the annexation of Oude, The East India Co. heaped Wrong after wrong upon that country and its princes." [۲۹]

بظاہر اس صلح کے شرائط بہت معمولی تھے کہ اودھ کے سارے علاقہ میں سے دو اضلاع کوڑہ اور الٰہ آباد کے اضلاع کمپنی کو مل جائیں گے جو شاہ عالم کی زیر حکومت رہیں گے، پچاس لاکھ روپیہ کی رقم اودھ کی جانب سے کمپنی کو تاوان جنگ کے طور پر ادا کرنی پڑے گی اور انگریزوں کو اودھ کے سارے علاقے میں تجارت کی آزادی حاصل ہوگی، کمپنی اور نواب کے مساوی مرتبے کا احساس دلاتے ہوئے اس میں ایک نکتہ یہ بھی شامل تھا کہ دوسری طاقتوں سے مقابلہ کے وقت دونوں ایک دوسرے کی امداد کریں گے۔ لیکن دراصل یہ بہت گہری سازش کی ابتدا تھی جس کا جال برابر پھیلتا رہا۔ شجاع الدولہ اپنے کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ بحال کرنا چاہتے تھے اس لیے وہ پوری مستعدی سے فوجی اور اقتصادی انتظام کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جلد ہی انھوں نے سارے علاقہ کا دورہ کر کے مسائل کا جائزہ لیا اور تعمیری، ترقیاتی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ فوجی تنظیم پر خاص طور سے زور دیا ۔۔۔ اسلحہ اور توپیں ڈھالنے کے لیے کارخانے قائم کیے گئے، جگہ جگہ چھاؤنیاں بنائی گئیں، ہوشیار اور وفادار افسروں کا تقرر کیا گیا اور خبر رسانی اور ذرائع آمد و رفت کو بہتر بنایا گیا، اس طرح دن رات اسی مقصد میں مصروف ہو گئے کہ آئندہ اُن کو اِن حالات کا سامنا نہ کرنا پڑے جس نے ان کے اقتدار کو ضرب لگائی تھی۔ یہ تنظیمی طاقت انگریزوں کے لیے سب سے بڑا خطرہ ثابت ہو سکتی تھی چنانچہ کمپنی کے لیے ان پر روک لگانا ضروری تھا۔ تین ہی سال میں انھوں نے اپنی فوج کو ایسا منظم کر لیا تھا کہ اس وقت کے ایسٹ انڈیا کمپنی کے کمانڈر انچیف جنرل بارکر نے ان حالات سے آگاہ کرتے ہوئے (۱۷ فروری ۱۷۶۸ء کو) ایک خط میں کمپنی کی Select Committee کو لکھا تھا کہ:

"شجاع الدولہ نے اس عرصہ میں جو فوجی ترقی کی ہے وہ تصور سے بالاتر ہے، اس وقت ان کے پاس سترہ بٹالین تیار ہیں جن میں سے پانچ یورپ کے بنے ہوئے ہتھیاروں اور سامانوں سے مسلح ہیں، ان کے علاوہ تیس ہزار تربیت یافتہ سوار بھی موجود ہیں۔ مزید گھوڑے خریدنے کے لیے تین لاکھ روپے گجرات بھیجے گئے ہیں، انھوں نے احمد شاہ ابدالی کے ایک ماہر افسر عمر خاں کو بھی ملازمت کی دعوت دی ہے۔ اور شیدی بلوچ کو پانچ ہزار بلوچ بھرتی کرنے کے لیے کہا ہے۔ ایک سکھ سردار کو بھی دو ہزار سپاہی لانے کے لیے لکھا ہے۔"

یہ اطلاعات کمپنی کے لیے اتنی تشویشناک تھیں کہ اس کے لیے نئی پابندیاں عائد کرنے کے علاوہ کوئی بس نہ تھا چنانچہ ۱۷۶۸ء میں گزشتہ (۱۷۶۵ء والے) معاہدہ میں ایک شرط کا اضافہ کر دیا گیا کہ نواب کی فوج کی تعداد ۳۵ ہزار سے زیادہ پر مشتمل نہیں ہو سکتی۔۔ شجاع الدولہ کو مرہٹوں اور بعض دوسری طاقتوں کی طرف سے خطرے کا احساس تھا اس لیے وہ اس بندش کے باوجود انگریزوں سے مخالفت مول نہیں لے سکتے تھے، چنانچہ ان حالات میں بھی انھوں نے رہیلوں کی مدد سے مرہٹوں کو شکست دی اور سلطنت کی ترقی اور رعایا کی بہبودی و خوشحالی کی طرف متوجہ رہے۔

۱۷۷۳ء میں جب گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز بنارس آیا تو شجاع الدولہ نے اس کے سامنے بہت سے مسائل پر تبادلۂ خیال کیا اور بعد میں ایک نئے معاہدہ کی شکل میں یہ طے پایا کہ اودھ کے دو اضلاع (کوڑہ اور الٰہ آباد) جو ۱۷۶۵ء میں کمپنی نے لے لیے تھے وہ پچاس لاکھ روپیہ

دے کو واپس مل جائیں گے، فوجی امداد کے موقع پر دورانِ جنگ کمپنی کو فی بریگیڈ دو لاکھ دس ہزار روپیہ ماہانہ ملا کرے گا اور کمپنی کی طرف سے حالات کا جائزہ لینے کے لیے ایک Resident مقرر کر دیا جائے گا۔ اس صلح نامہ کے بعد واپس آتے ہی انھوں نے مرہٹوں کی سرکشی دور کرنے کی غرض سے دوآبہ کی طرف فوج کشی شروع کر دی اور تقریباً پچاس ہزار کی فوج کے ساتھ مرہٹوں کی تمام چھاونیاں ختم کر دیں۔ روہیلوں کی طاقت کو بھی زائل کرنا ان کے لیے ضروری تھا چنانچہ ۲۳ اپریل ۱۷۷۴ء کو بابل نالہ کی جنگ میں حافظ رحمت خاں کی فوج کو شکست دے کر روہیل کھنڈ کے علاقہ پر بھی قبضہ کر لیا لیکن ابھی ان علاقوں کے انتظامات کی طرف سے پوری طرح فراغت بھی نہ مل پائی تھی کہ ۲۶ جنوری ۱۷۷۵ء کو محض ۴۶ سال کی عمر میں انتقال کر گئے، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر یہ کچھ دنوں اور زندہ رہتے تو نہ صرف اودھ کی آنے والی تاریخ دوسری شکل میں ہوتی بلکہ سارے ہندوستان کے سیاسی حالات دوسرا رُخ اختیار کر لیتے۔

شجاع الدولہ کے معاصر اور بعد کے مؤرخین سبھی نے اس وقت کے عہد کی درباری شان و شوکت اور عوام کی خوشحالی و پرسکون زندگی کی تعریف کی ہے۔ اگر شاہی محل میں اربابِ نشاط کنیزوں اور حسیناؤں کی رنگ رلیاں چھائی رہتی تھیں، اگر شجاع الدولہ کے سفر میں "ان کے خیموں کے ساتھ طوائفوں کے ڈیرے بھی پہلے ہی سے موجود ہوتے تھے" تو رعایا میں بھی رقص و موسیقی، حسن و شاہد سے دلچسپی عام تھی اور بازی گری، مُرغوں اور کبوتروں کی لڑائیاں اور پتنگ بازی وغیرہ کے رواج نے ہر طرف چہل پہل اور نئی زندگی بھر دی تھی۔ یہ کیفیت محض امرا و روسا کی سوسائٹی تک محدود نہ تھی بلکہ ہر فرد کے مذاق اور اس کی تفریح کا سامان موجود تھا۔ اسی کیفیت کی عکاسی کرتے ہوئے فیض بخش نے خود چشم دید حالات اس طرح بیان کیے ہیں کہ:-

"جب میں اپنے وطن سے پہلی مرتبہ ممتاز نگر پہنچا جو شہر فیض آباد کے مغربی دروازہ سے چار میل کے فاصلہ پر ہے تو یہاں ایک بازار لگا ہوا تھا اور خرید و فروخت کی گرم بازاری تھی۔ انواع و اقسام کے پکوان، مٹھائیاں، شربت، کباب، پراٹھے، بُھنا ہوا گوشت، پانی کے بتاشے، فالودہ اور نان خطائیاں وغیرہ نظر آتی تھیں اور مسافر خریدنے میں سبقت کرنے کی وجہ سے ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے۔ یہ ہنگامہ دیکھ کر میں نے خیال کیا کہ ضرور چوک بازار یہی ہے لیکن مجھے کسی نے بتایا کہ ابھی تو شہر پناہ کے دروازہ میں بھی داخل نہیں ہوا۔ بالآخر جب میں شہر میں پہنچا تو میں نے ہر طرف ناچنے اور گانے والے طائفے دیکھے جنھیں دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ صبح سے شام تک اور غروبِ آفتاب سے طلوعِ سحر تک فوجوں کے ڈھول اور باجوں کی آوازیں برابر چلی آتی تھیں، گھڑیالوں کی صداؤں اور نوبت کی آوازوں سے کان بہرے ہوئے جاتے تھے، گھوڑے گاڑی، اونٹ، خچر، شکاری کتے، بیل، بیل گاڑیاں اور توپیں لے جانے والی گاڑیاں شمار سے باہر تھیں۔ لباسِ فاخرہ پہنے ہوئے شرفائے دہلی کے نوجوان، رشتہ دار، اطبائے ملک کے گانے بجانے اور ناچنے والے مرد و زن سب بڑی تنخواہوں پر ملازم تھے اور ہر چھوٹے بڑے کی جیبیں سونے چاندی سے بھری ہوئی تھیں۔ مفلسی اور فلاکت کا کسی کو وہم بھی نہ تھا۔ نواب وزیر شہر کی آبادی اور رونق پر خاص طور پر متوجہ تھے[۳۱]۔"

یہ حالات ۱۷۶۹ء کی زندگی پر مشتمل ہیں جبکہ انگریزی اثرات بھی گہرے ہوتے جا رہے تھے اور شجاع الدولہ اپنا وقار بحال کرنے کے لیے بھی کوشاں تھے لیکن پھر بھی عوام کی پُرمسرت زندگی اور شہر کی رونق پر اثر نہ پڑنے پایا بلکہ "ناچنے اور گانے والے طائفوں" کے ساتھ ہی "فوجوں کے ڈھول باجے اور توپیں لے جانے والی گاڑیاں" اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ وہ عیش و عشرت کے ماحول میں بھی سلطنت کی طرف سے غافل نہ رہتے تھے۔ اسی شان و شوکت کا احساس تھا جس کے تحت نئی نئی عمارتیں بنوائی گئیں، خوبصورت باغات کی تشکیل ہوئی، نہروں اور ریلوں کی بنیادیں پڑیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ علوم و فنون کے

ایسے مراکز قائم ہو گئے، جس کی مثالیں دوسری جگہ مشکل سے ملیں گی۔ اہلِ حرفہ اور ماہرینِ فن ہندوستان کے مختلف حصوں سے آکر جمع ہو گئے عالموں کی قدر و منزلت نے علوم کو مقبولیت بخشی اور شاعروں کی اتنی بڑی تعداد امنڈ پڑی کہ یہیں سے نئی روایت اور نئے مرکز کی بنیاد پڑ گئی۔ خود شجاع الدولہ اتنا با ذوق تھا کہ بعض ماہرینِ شعر و فن کو اپنی طرف سے اعزاز و اکرام کے ساتھ اصرار کر کے بلاتا اور یہاں آکر ان فنکاروں کو شاہی قربت بھی حاصل رہتی اور عوام کی مقبولیت و شہرت بھی۔

آصف الدّولہ

شجاع الدولہ کے دورِ حکومت کے آخری دنوں میں ایسٹ انڈیا کمپنی اودھ کے معاملات میں اتنی حاوی ہو چکی تھی کہ اس کی مرضی کے بغیر جائز و قانونی وارث بھی نیا حکمراں نہیں بن سکتا تھا چنانچہ شجاع الدولہ کو جب اپنی موت کا یقین ہو گیا تھا تو انھوں نے اپنی زندگی ہی میں یہ مسئلہ طے کر ڈالنا مناسب سمجھا اور بہو بیگم کی مرضی کے مطابق ایک خط کے ذریعہ گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ان کے بعد آصف الدولہ کو اودھ کا نواب مقرر کیا جائے جو کمپنی سے پوری طرح وفاداری اور تعاون کرتے رہیں گے۔ اس خط کے کلکتہ پہنچنے سے پہلے شجاع الدولہ کا انتقال ہو گیا لیکن اس کی بنیاد پر حالات کا جائزہ لیکر ۴ مارچ ۱۷۷۵ء کو آصف الدولہ کو "نواب" کا اعزاز حاصل ہو گیا۔ آصف الدولہ کے والدین نے کمپنی سے ان کی خیر خواہی کا وعدہ تو کر لیا تھا لیکن شاید ان کو یہ احساس نہیں تھا کہ اس حکومت کے تاج میں اذیت ناک کانٹے بھرے ہوں گے جن سے کسی لمحہ سکون نہ مل سکے گا۔

آصف الدولہ کو حکومت تو مل گئی لیکن مختلف معاہدوں اور کمپنی اور اودھ میں (— "Universal peace , firm friendship & perfect union" -) کے نام پر معاشی، علاقائی اور فوجی پابندیوں کا حصار تنگ سے تنگ ہوتا گیا۔ ۲۱ مئی ۱۷۷۵ء کو یہ کہہ کر نئے معاہدہ کی ضرورت پیش آئی کہ شجاع الدولہ کے ساتھ جو معاہدے ہوئے تھے وہ ان کے ساتھ ختم ہو گئے۔ چنانچہ اس TREATY سے اس دور کی ابتدا ہو گئی کہ اقتصادی اور معاشی طور پر اودھ کا خزانہ بالکل خالی ہو گیا اور نواب محض محکوم بن کر رہ گیا۔ سب سے پہلا دھکا یہ لگا کہ بنارس اور اس کے قرب و جوار میں غازی پور اور جون پور کے اضلاع (جو علاقہ راجہ چیت سنگھ کے تعلقہ میں تھا) کمپنی نے اودھ سے نکال کر اپنے قبضہ میں کر لیے اور دوسری شرط یہ ماننی پڑی کہ شجاع الدولہ تک اودھ کی طرف سے کمپنی کو فوجی اخراجات کے لیے فی برگیڈ ۲ لاکھ ۱۰ ہزار ماہانہ دینا پڑتا تھا اب اس میں پچاس ہزار کا اضافہ کر کے دو لاکھ ساٹھ ہزار کر دیے گئے۔ اور تیسری چیز یہ تھی کہ ایک Temp. Brigade بھی قائم کر دیا گیا اور اس کے سارے اخراجات کا بوجھ بھی اودھ ہی کے خزانہ پر پڑا۔ محض اتنا ہی نہیں اودھ کے فوج کے افسران کی حیثیت سے بھی انگریزوں ہی کا تقرر کرنا پڑا، Resident اور اس کے عملہ کے مصارف بھی اسی کے ذمہ تھے اور ان سب باتوں کے باوجود اس پر اصرار تھا کہ انتظام حکومت اور رعایا کی حالت کو بہتر بنایا جائے۔ آصف الدولہ کو سوائے کمپنی کی ہر ہدایت کے ماننے کے کوئی چارہ کار نہ تھا کیونکہ بار بار اس خطرہ کا احساس دلا دیا جاتا تھا کہ اگر ان کے لیے یہ شرائط قابلِ قبول نہیں ہیں تو سعادت علی خاں (ان کے بھائی) کو حکومت سونپ دی جائے گی جس کے لیے وہ تیار نہ تھے لیکن پھر بھی جب حالات نے یہ شکل اختیار کر لی کہ:

> "The pay of the Nawabs Servants and the allowances of members of his family were heavily in arrears. The ladies of the harem were in absolute want of food." [۳۲]

تو بار بار انھوں نے وارن ہیسٹنگز کو اپنی بے بسی کی طرف متوجہ کیا۔ ہیسٹنگز نے خود ان چیزوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

> "The number, influence and enormous amount of the Salaries, pensions & emoluments of the co.s Service, civil & military, in the Vazir's serviceshave become an intolerable burden upon the revenue and authority of His Excellency and exposes to the envy and resentment of the whole country." [۳۳]

معاشی ہیجان و انتشار کا یہ سلسلہ محض دربار اودھ یا آصف الدولہ تک محدود نہیں رہا بلکہ جب اودھ کا خزانہ خالی ہو گیا تو ہیسٹنگز کی حرص و ہوس کی نظر بہو بیگم کی جاگیر اور ان کے خزانے کی طرف گئی اور آصف الدولہ کے وزیر مختار الدولہ (مرتضیٰ علی خاں) کی سازش سے بیگم اور ان کے ملازمین

پر طرح طرح کے مظالم ڈھا کر ساری دولت لوٹ لی گئی۔ آصف الدولہ کے دار السلطنت کی تبدیلی کے بعد بھی یہ فیض آباد ہی میں مقیم رہیں اور ان کی جاگیر اتنی سیر حاصل اور خزانہ اتنا معمور تھا کہ اس سے ہزاروں شریف اور آبرودار آدمی حرمت اور امارت کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔"[23] "تاریخ فرح بخش" کا مصنف فیض بخش لکھتا ہے کہ "یوں تو صاحبزادے (آصف الدولہ) آئے دن ماں سے مطالبہ کر کے کئی کئی لاکھ روپے اڑا لے جاتے تھے۔ لیکن پانچویں بار جو لوٹ ہوئی اس میں مختار الدولہ اور صاحب ریذیڈنٹ بہادر جان برسٹو بھی شریک تھے۔ اس بار چوبیس لاکھ روپے نقد اور چھتیس لاکھ روپے کا سامان وصول کیا گیا جس میں زر و جواہر کے علاوہ ستر ہاتھی، آٹھ سو بیل گاڑیاں، ستر ہزار کا ایک پیچوان، سترہ ہزار کی طلائی زین، جواہرات جڑے ہوئے چالیس سرپوش اور اطلس، زربفت، کمخواب اور کاشانی مخملوں کے بیشمار تھان بھی شامل تھے۔ اس کے بعد چھٹی اور آخری لوٹ ۱۷۸۲ء میں اس وقت ہوئی جب حیدر بیگ خاں نائب سلطنت اور مڈلٹن ریذیڈنٹ بہادر تھے۔ یہ لوٹ گورنر جنرل کے اشارے پر ہوئی اس میں بہو بیگم کے دو خواجہ سراؤں یعنی جواہر علی خاں اور بہادر علی خاں کو گرفتار کر کے لکھنؤ کے مقام پر چھاؤنی میں رکھا گیا جہاں ان پر سخت مظالم کیے گئے اور اس طرح پچپن لاکھ روپیہ کا ساز و سامان حاصل کر لیا گیا۔"[24]

یہ ساری لرزہ خیز داستان اس چیز کی بہت بڑی مثال ہے کہ آصف الدولہ کے معمولی افسر سے لے کر نائب سلطنت تک بھی کسی نہ کسی شکل میں اپنے مفادات کے پیشِ نظر کمپنی اور اس کے حاکموں کے خیر خواہ بن چکے تھے، اول تو مختلف عہدوں پر انھیں افراد کا تقرر ہوتا تھا جو انگریزوں سے اعتماد حاصل کر سکے، نواب کے خلاف سازشں میں شریک ہوتے رہیں دوسرے ہر اس افسر کو اس کے عہدوں سے ہٹا دینا عام دستور بن گیا تھا جس کے بارے میں ذرا سا بھی شک ہو کہ نواب سے قریب اور ان کا وفادار ہے، کبھی نائب سلطنت مختار الدولہ کو کمانڈر انچیف بسنت خاں کے ذریعہ قتل کرا دیا گیا، کبھی جھاؤ لال ایسے ماہر، ہوشمند اور بے لوث دیوان کو معزول کر کے گرفتار کر لیا گیا اور اسی سلسلہ کی آخری کڑی وہ تھی جب حیدر بیگ خاں کے انتقال کے بعد آصف الدولہ کی خواہش کے خلاف نواب تفضل حسین خاں کو نائب سلطنت بنا دیا گیا۔ آصف الدولہ اس عہدہ پر الماس علی خاں کا تقرر چاہتے تھے جن کی صلاحیتوں کا اعتراف (Sleeman) ایسے انگریز افسر نے بھی کیا ہے جس نے اودھ کے حکمراں پر طرح طرح کے الزامات عائد کیے ہیں، وہ لکھتا ہے:-

> "Miyan Almas was the greatest and best man of any note that Oudh has produced. He held for about 40 years, districts yielding to the Oudh Govt. an annual revenue of about 80 lakhs of rupees. During all this time he kept the people secure in life & property and as happy as people in such a state of society can be; and the whole country under his charge was, during his life time a garden." [25]

لیکن ایسے باصلاحیت شخص کے مقابلہ میں نواب تفضل حسین خاں کو ترجیح دی گئی جو ایک دانشور اور عالم تو ضرور تھے لیکن انتظامی معاملات میں امتیاز حاصل نہ تھا، آصف الدولہ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ وہ سعادت علی خاں کے استاد بھی اور گورنر جنرل اور کمپنی کے خیر خواہ بھی۔ چنانچہ اب ان کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ حکومت کے کسی شعبہ پر ان کا اختیار و عمل قائم نہیں رہ سکتا اور آخر میں یہ حالت ہو گئی تھی کہ حالات کی بے بسی و مجبوری سے بیمار رہنے لگے، دوا علاج پر بھی توجہ نہ دی اور مایوسی کی یہ شدت ہو چکی تھی کہ یہ کہا کرتے تھے کہ "جو دل غم و آلام سے ٹوٹ چکا ہے اس کا کوئی علاج نہیں ہے" اور انھیں حالات میں ۲۱ ستمبر ۱۷۹۷ء کو انتقال کر گئے۔

تفضل حسین خاں کی طرف سے آصف الدولہ کے شکوک غلط نہیں تھے چنانچہ ان کے انتقال کے بعد وزیر علی خاں کی تخت نشینی پر انھوں نے جو رول ادا کیا اسے کسی شکل میں سراہا نہیں جا سکتا۔ یہاں مورخوں کے ان متضاد نظریات سے بحث نہیں ہے کہ ان کی جانشینی کا اعلان غلط تھا یا صحیح لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس وقت کی رعایا کی نظر میں ان کی معزولی ایک منظم منصوبہ کے تحت عمل میں آئی تھی جس میں بہت سی اعلیٰ شخصیتوں کا ہاتھ بھی تھا۔ اسی سلسلہ میں یہ شعر زبان زد عوام تھا کہ ؎

سات حرفوں نے کیا خانہ خراب   تین ت اور دو الف یک ح دے

(یعنی نواب تفضّل حسین خاں، نواب تحسین علی خاں، مہاراجہ ٹکیت رائے، اشرف علی خاں، نواب حسن رضا خاں اور بہو بیگم) ان سب نے ایک محضر پر دستخط کر کے گورنر جنرل کو ان کی معزولی کی ترغیب دی تھی، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "عوام میں بڑا تلاطم بچ گیا، تمام لوگ تفضل حسین خاں، سرفراز الدولہ، ٹکیت رائے اور الماس علی خاں کو غلیظ گالیاں دے رہے تھے"[۳۷] اور اس سلسلہ میں سب سے زیادہ بدنامی تفضل حسین خاں ہی کو اٹھانی پڑی جو بہر حال انگریزی اثرات کے بہت بڑے نمائندے بھی تھے اور جنھیں (اپنے پرانے شاگرد) سعادت علی خاں سے زیادہ ہمدردی کی امید تھی"[۳۸] حقیقت یہ ہے کہ اگر آصف الدولہ تفضل حسین خاں کی تقرری رکوا سکتے تو بعد میں وزیر علی خاں کے خلاف سازشوں کا یہ طوفان ہرگز نہ اٹھتا اور نوجوانی کے جوش و ولولہ کے ساتھ ان کے دل میں انگریزوں کے خلاف جو غم و غصہ کی لہر پیدا ہوئی اس کے پیشِ نظر اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہو سکتی کہ اودھ کی تاریخ کسی اور شکل میں ہوتی۔

آصف الدولہ کی زندگی اور ان کے بعد رونما ہونے والے ان واقعات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ انھیں درباری اور بیرونی سازشوں کے اس جال میں حکومت کا انتظام کتنا دشوار مرحلہ تھا لیکن حقائق شاہد ہیں کہ رعایا کی فلاح و بہبود اور سلطنت کی ترقی و شوکت و عظمت کے لیے ان کے دورِ حکومت میں جو کام ہوئے وہ بعد میں بہت کم انجام پا سکے۔ فیض آباد سے دارالسلطنت تبدیل کر کے لکھنؤ میں بارونق محلوں، شاندار عمارتوں اور خوبصورت باغوں کی تعمیر کر کے زندگی بخش دینا کوئی معمولی کارنامہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ان عمارتوں کی تعمیر کے پیچھے بھی محض اظہار شان و شوکت کا جذبہ پوشیدہ نہ تھا بلکہ اس سے ہزاروں مفلس و غریب عوام کو روزگار بھی میسّر ہو جاتا تھا، کاریگروں اور صنّاعوں کی ہمت افزائی بھی ہوتی تھی اور ہزاروں افراد کی رہائش و قیام گاہ کا انتظام بھی ہو جاتا تھا چنانچہ امام باڑہ، اس کا رومی گیٹ، بیبیا پور کوٹھی، جھنجھٹ کوٹھی، ریزیڈنسی اور لکھنؤ کی بہت سی اہم عمارات اسی دور کی صنّاعی اور عظمت کا احساس دلاتی ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے شعبوں کے فنکاروں کی قدر و منزلت بھی کی گئی، مصوری، موسیقی، نجوم، طب، غرضیکہ ہر فن کے ماہرین لکھنؤ میں جمع ہو گئے اور خاص کر شعری و ادبی زندگی کا جو دور یہاں سے پھیلا اس کی گونج آج تک اپنی روایات کے ساتھ کسی نہ کسی شکل میں قائم ہے۔ مختلف علوم کی ترقی پر ایسی توجہ دی جاتی تھی کہ علمار کی سرپرستی کے ساتھ ساتھ کتبخانہ میں نادر کتابوں کی فراہمی بھی ضروری جز تھا اور اسی سلسلہ میں سیّد عبداللطیف شوستری لکھتے ہیں کہ :-

> "ان کے کتب خانے میں تین لاکھ منتخب کتابیں میں نے دیکھی تھیں جو نہایت پاکیزہ خط میں لکھی ہوئی تھیں۔ ہر سو کتاب پر ایک گماشتہ مقرر تھا، مختلف فنون و اصناف پر عربی، فارسی اور انگریزی میں کتابیں تھیں۔ نظم و نثر کی کتابیں، تاریخیں اور دواوین بے شمار تھے۔ ان کے علاوہ خوشنما قطعات جو اولین و آخرین خوشنویسوں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے اور ایران، ہند، روم اور فرنگ کے مصوروں کی بنائی ہوئی تصویریں اتنی تعداد میں تھیں کہ ان کے دیکھنے سے تمام عمر فراغت نہ مل سکے"[۳۹]

آصف الدولہ کے حسن انتظام اور ترقی سلطنت کے جذبہ کا ایک پہلو یہ بھی قابل قدر ہے کہ اودھ کے گذشتہ حکمرانوں کی طرح انھوں نے بھی کسی معاملہ میں مذہبی امتیاز نہیں برتا بلکہ مساویانہ سلوک کرتے رہے۔ اگر ان کے یہاں اعلیٰ عہدوں پر مسلمان تھے تو ہندوؤں کو بھی پورا اعزاز ملتا تھا بلکہ بعض عہدوں پر تو ان کو مسلمان افسروں سے زیادہ ہندو افسران پر اعتماد تھا۔ اسی طرح اگر وہ محرّم اور عید کے سلسلہ میں لاکھوں روپیہ صرف کرتے تھے تو ہولی میں بھی حکومت کی طرف سے ۵ لاکھ خرچ کیے جاتے تھے اور وہ خود جشن میں شریک ہو کر عوام کی خوشیوں میں اضافہ کرتے رہتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ چاہے خزانہ خالی رہا ہو لیکن انھوں نے عوام میں مایوسی اور بددلی نہ پھیلنے دی اور اپنے کو عوام میں اتنا مقبول بنا لیا کہ یہ محاورہ مشہور ہو گیا کہ ع

جس کو نہ دیں مولا، اس کو دیں آصف الدولہ

ان کی سخاوت، فیاضی اور دریا دلی کی داستانیں آج بھی یاد کی جاتی ہیں اور کسی طرح عوام کے یہ بات قرینِ قیاس نہیں آ سکتی کہ ایسا پرشکوہ

اور عظیم دربار اقتصادی کساد بازاری کا شکار رہا ہو۔ اسی منزل سے دربار میں ایرانی علماء و دانشوروں کا اثر و اقتدار بھی بڑھنے لگا اور مقامی تہذیب میں ایرانی کلچر کے اثرات، اس کی لطافت و شائستگی کے امتزاج سے تہذیبی زندگی کا نیا مزاج ابھر کر باقاعدہ سامنے آگیا۔

سعادت علی خاں

جیسا کہ لکھا جاچکا ہے وزیر علی خاں جو آصف الدولہ کے بعد "نواب" کی مسند حاصل کر چکے تھے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کے لیے بہت بڑی رکاوٹ بن سکتے تھے اور یہی احساس تھا جس کے تحت ان کو ہٹانے کے لیے طرح طرح کے دلائل تلاش کیے گئے اور سعادت علی خاں سے کمپنی کی اطاعت اور اس کے احکام کی پابندی کا وعدہ لے کر ۲۱ جنوری ۱۷۹۸ء کو ان کی جانشینی کا اعلان کر دیا گیا۔ سعادت علی خاں کے لیے یہ حکومت نعمت غیر مترقبہ کے طور پر مل رہی تھی اس لئے انھوں نے حکومت سنبھالنے سے پہلے ہی انگریزوں کی طرف سے پیش کی گئی TREATY کو بخوشی منظور کر لیا جس کی رُو سے کمپنی کو ملنے والی ۵۶ لاکھ کی رقم میں ۲۰ لاکھ کا اضافہ کر کے ۷۶ لاکھ سالانہ دینے پر راضی ہو گئے، ان کی جانشینی کے لیے کمپنی کے حکام کو جو کارنامے انجام دینے پڑے تھے اس کے اخراجات کے سلسلہ میں ۱۲ لاکھ کی رقم ادا کی اور الہ آباد اور فتح گڑھ کے قلعوں کو کمپنی کے حوالے کر کے ان کی مرمت کے لیے بالترتیب ۸ اور ۳ لاکھ دینا منظور کر لیے۔ دراصل سعادت علی خاں کو جو اعزاز مل رہا تھا اس کے پیشِ نظر وہ اس پوزیشن میں تھے ہی نہیں کہ کسی قسم کی رد و قدح کر سکتے۔ محض اسی پر اکتفا نہیں کی گئی بلکہ گورنر جنرل لارڈ ولزلی نے اس بات پر زور دینا شروع کیا کہ اودھ کی فوج (جو آصف الدولہ تک تقریباً ۸۰ ہزار تھی) کم کر دی جائے اور اس کی جگہ کمپنی کی فوجی طاقت میں اضافہ ہوتا رہے۔ اس طرح حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے تین ہی سال میں ان کے اختیارات کم سے کم تر ہوتے گئے۔ کمپنی کی بندشیں زیادہ سے زیادہ عائد ہوتی گئیں، حکومت کی آمدنی کے ذرائع محدود ہو کر رہ گئے۔ اور نوبت آگئی کہ عاجز آکر سعادت علی خاں نے حکومت سے کنارہ کشی کر لینے کا ارادہ بھی کر لیا[۴۱] اور گورنر جنرل سے کمپنی کے تقاضوں کو پورا کرنے کی معذوری بھی ظاہر کی لیکن ان مسائل پر توجہ دینے کے بجائے گورنر جنرل نے ۲۸ اپریل ۱۸۰۱ء کو لکھنؤ کے Resident کو یہ لکھ بھیجا کہ اودھ کی سلطنت کا آدھا علاقہ سعادت علی خاں سے لے کر کمپنی اپنے زیر انتظام کر لے اور "اگر وزیر اس کے لیے بخوشی راضی نہ ہوں تو ان علاقوں پر جبری قبضہ حاصل کر لیا جائے" سعادت[۴۲] علی خاں کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ اگر یہی حالات رہے تو بہت وقت نہیں لگے گا کہ اودھ کا بقیہ علاقہ بھی کمپنی کے اختیار میں چلا جائے گا[۴۳] لیکن ان کے پاس کوئی چارۂ کار نہ تھا چنانچہ ۱۰ نومبر ۱۸۰۱ء کے ایک معاہدہ کے ذریعہ وہ اودھ کے آدھے علاقے سے دستبردار ہو گئے۔ اس معاہدے کی رُو سے جو اضلاع کمپنی کو ملے ان میں روہیل کھنڈ، فرخ آباد، مین پوری، اٹاوہ، کانپور، فتح گڑھ، الہ آباد، اعظم گڑھ، بستی اور گورکھپور شامل تھے اور جس سے اودھ کے خزانہ کو ۳ کروڑ سالانہ کی آمدنی تھی۔ اسی واقعہ کو ایک شاعر نے قطعۂ تاریخ کی شکل میں یوں نظم کیا کہ

خود بخود ایں دورِ دورنگی گرفت
ملک ز نواب فرنگی گرفت = (۱۲۱۶ھ)

چنانچہ اس تقسیم سے نواب اور رعایا کے دلوں پر جو اثرات ہوئے ہوں ان کا اندازہ لگانا مشکل ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ اس نصف علاقہ پر قناعت کر کے سعادت علی خاں نے اپنے حسنِ انتظام اور غیر معمولی صلاحیتوں سے اودھ میں ایسی خوشحالی اور شان و شوکت بھر دی کہ عوام اس کی کمی محسوس نہ کر سکے۔

اس تقسیم نے اگر سیاسی طور سے اودھ کو تبدیل کر دیا تھا تو سعادت علی خاں کی ذاتی زندگی میں بھی انقلاب پیدا کر دیا اور وہی شخص جو سیر و شکار، شاہد و شراب اور عیش و عشرت کا دلدادہ تھا ایسا ذمہ دار حکمراں بن گیا کہ اس معاہدہ کے بعد اپنے آخری لمحات تک بڑی سے بڑی دشواریوں کا سامنا کرنے کے باوجود کسی طرح کی غفلت نہ برتی۔ یہاں تک کہ معاشی لحاظ سے بھی سلطنت کو تنگی و مفلسی کا احساس نہ ہونے دیا، اور مال گذاری کا ایسا بندوبست کیا کہ حکومت کی آمدنی بھی بڑھتی رہے اور رعایا کو پریشانی کا سامنا بھی نہ کرنا پڑے۔ ایک انگریز مورخ بھی ان کے حسنِ انتظام کا اعتراف کرتے

ہوئے لکھتا ہے کہ :-

"The result of his administration was that the people became contented and prosperous,..... At his death S. Ali left behind him the name of the friend of the ryot, and a full treasury." ۴۳

اور انھیں تمام خصوصیات کی بنیاد پر H.C. IRWIN نے ان کو اس سلطنت کے تمام حکمرانوں میں "سب سے زیادہ عظیم، سب سے زیادہ ہوشمند اور مضبوط ترین منتظم" قرار دیتے ہوئے اس چیز پر اظہارِ افسوس کیا ہے :

"He (Lord Wellesley, Governor General) had before him perhaps the ablest and most enlightened native ruler then living, and failed to recognise him." ۴۴

ان کی صلاحیتوں کا یہ بہت بڑا ثبوت ہے کہ شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے دور سے فنکاروں، صنّاعوں اور شعراء کی قدر و منزلت کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا انھوں نے اسے نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اس میں اضافہ کر کے درباری فضا کو زیادہ بارونق اور پرشکوہ بنادیا اور عوام میں بھی شعری و فنی ذوق تیزی سے پھیل گیا۔ انشا کا یہ جملہ سعادت علی خاں اور ان کی رعایا دونوں کے رجحان کا پتہ دیتے ہیں وہ لکھتے ہیں :-

"پیر و مرشد کے عہد میں نئے اور نفیس فیشن کی تعمیر دل، الفاظ کی تحقیق، فصاحت کی جانچ، بلاغت کا لحاظ، لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی، تقریر کی شستگی اور نئی چیزوں کی ایجاد کے چرچے بہت زیادہ ہیں اور قابل اور فصیح بلیغ شخصوں کے علاوہ کسی کی صحبت حضور والا کو پسند نہیں ہر بات اور لطیفہ کے مغز کو پہنچتے ہیں" ۴۵

اس دور کی زباں دانی، شعراء کے گروہ اور ان کے معرکے اور عوام کے فنی ذوق کی بلندیوں کے تذکرے آبِ حیات اور دوسری ادبی تاریخوں سے آسانی سے دیکھے جاسکتے ہیں، یہاں محض ان کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے، اسی طرح دوسرے فنون کے ماہرین بھی عوام میں مقبولیت حاصل کئے ہوئے تھے اور فنِ تعمیر کو بھی ایسی بلندی ملی کہ دلآرام، دلکشا، حیات بخش، موسیٰ باغ، نور بخش خاص بازار کی کوٹھیاں اور حضرت عباس کی درگاہ آج بھی اس کا موجودہ ثبوت ہیں۔ بازاروں کی چہل پہل، جشن اور تقاریب کی رونق اور مذہبی رسوم ہر چیز سے شاہی عظمت کا احساس ہوتا تھا اور یہ ایسے حکمراں کے دور کی کیفیت ہے جو سیاسی اور انتظامی طور پر نہ معلوم کتنی پابندیوں میں جکڑا ہوا تھا، انھوں نے عوام کو خوشحالی بھی بخشی، سلطنت کو مضبوط و شاداب بھی بنایا، شاہی عظمت کو برقرار بھی رکھا اور اس طرح ایک کامیاب اور ہر دلعزیز حکمراں کی زندگی گزار کر ۱۱ جولائی ۱۸۱۴ء کو انتقال کر گئے۔

غازی الدین حیدر

سعادت علی خاں کے بعد غازی الدین حیدر نے مسندِ حکومت سنبھالی اور ان کو اس شرط کے ساتھ حکمراں بنایا گیا کہ وہ سابق معاہدوں کی پابندی کرتے رہیں گے اور ایک ایسے خود مختار (Independent – prince –) حکمراں ہوں گے جن کے لیے حکومتِ برطانیہ کی اطاعت لازمی ہوگی۔ (must be Subservient to the British Govt.)

کمپنی کی جانب سے نواب کی اس تجویز کو بھی قبول کر لیا گیا تھا کہ ان کے علاقہ میں آئندہ کسی قسم کی کمی نہ کی جائے گی البتہ کبھی انتظامِ سلطنت کو بہتر بنانے کے لیے، کبھی نیپال و برما کی جنگ کے موقع پر اور کبھی دوسرے مواقع تلاش کر کے ادھر سے کروڑوں روپیہ اعانت یا قرض کے طور پر لیے جاتے رہے اور غازی الدین حیدر کو بخوشی دینا پڑتا یہاں تک کہ اسی عرصہ میں بہو بیگم کے انتقال کے بعد ان کی مال و دولت اور ان کا سارا خزانہ جس کے جائز وارث غازی الدین حیدر ہی تھے اس کو بھی کمپنی نے اپنے قبضہ میں کر لیا۔ ان تمام عطیات کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ گورنر جنرل اور کمپنی کے دوسرے اعلیٰ حکام سے ان کے تعلقات بہت خوشگوار رہے اور اسی اظہار تعاون کا اثر یہ ہوا کہ ان کو ۱۸۱۹ء سے "بادشاہ" کا مرتبہ دے دیا گیا۔ اس اعلان سے جہاں عوام کی نظر میں غازی الدین حیدر کا مرتبہ بڑھ گیا وہاں بادشاہ کو اپنی شاہی عظمت کا احساس بھی ہو گیا اور بہت سے ایسے طریقے اختیار کیے گئے کہ دربار میں شہرت بھی بڑھے اور دہلی کی بادشاہت

کا مقابلہ بھی کیا جا سکے۔ زراعتی پیداوار میں کسی طرح کی کمی نہ تھی، صنعت و حرفت کو ترقی حاصل ہو چکی تھی، مختلف فنونِ لطیفہ کی ہمت افزائی کی جا رہی تھی اور سب سے بڑھ کر شعر و ادب نے اسی منزل سے غیر معمولی ترقی کی۔ بادشاہ کو مشرقی فلسفہ اور علمِ لسانیات کے مطالعہ سے خود بھی گہری دلچسپی تھی، شعراء کے کلام پر گہری نظر تھی، بڑے بڑے اساتذہ کو انعام و اکرام سے نوازا جاتا تھا اور یہی دور تھا جب پریس قائم کر کے مختلف موضوعات سے متعلق کتابیں چھاپنے کی ابتدا ہوئی۔ یہاں ان چیزوں کا تفصیلی ذکر کرنا مقصود نہیں ہے کہ نثر و نظم کے ارتقا میں دورِ غازی الدین میں کیا اہم کام انجام دیے گئے۔ البتہ اس طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ ان کا دور انتشار و بےچینی سے بہت حد تک پاک رہا اور شاہی سرپرستی کے تحت عوام میں مختلف فنون اور علمی و ادبی شعبوں سے دلچسپی کا رجحان شدت سے بڑھتا رہا۔ غازی الدین حیدر کا انتقال ۲۰ اکتوبر ۱۸۲۷ء کو ہوا اور اودھ کے تہذیبی عناصر ان کے دورِ حکومت میں زیادہ واضح طور پر ابھر چکے تھے۔

نصیر الدین حیدر

نصیر الدین حیدر کے دور سے ہی یہ خبریں گشت کرنے لگیں تھیں کہ ان کے ہاتھ سے حکومت لے کر کسی دوسرے فرد کو سونپی جائے گی، ان کی عیاشی، بدانتظامی اور انتشار و ہیجان کی کیفیت تیزی سے پھیلائی جا رہی تھی۔ اس وقت کے Resident کرنل (Low) نے پرزور سفارش کی تھی کہ ان کو ہٹا دیا جائے۔ خود اپنے وزیر معتمد الدولہ آغا میر پر بادشاہ کو اعتماد نہ تھا، ان کو شہر بدر کر کے کبھی مہدی علی خاں کو وزیر بنایا گیا کبھی روشن الدولہ کو لیکن کمپنی کے حکام کو کسی طرح اطمینان نہ ہوا، وہ انگریزی تہذیب، ان کے لباس و وضع قطع سے گہری دلچسپی رکھتے تھے، درباری زندگی پر بھی انگریزوں کا گہرا اثر تھا اور یہ اثرات یہاں تک بڑھے کہ وہی لوگ بادشاہ کے حرام میں پوری طرح دخیل ہو گئے اور ان کو موقع مل گیا کہ درباری سازشوں میں شریک ہو کر بادشاہ کو بدنام کر سکیں۔ خود بادشاہ کو اپنی بیگمات اور اپنے امراء پر کسی طرح کا اعتماد نہ تھا۔

ہر طرف سے خطرات گھیرے ہوئے تھے لیکن ان حالات میں بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے کام نہ کیے گئے ہوں۔ ان کے دور کی تہذیبی زندگی کا نقشہ رجب علی بیگ سرور کی فسانۂ عبرت میں تفصیل سے مل جاتا ہے اور اگر انگریز مؤرخ نے (Private Life of an Estern King) میں ان کی عیاشیوں اور نفسیاتی کجروی کی مبالغہ آمیز داستانیں بیان کی ہیں تو فسانۂ عبرت سے درباری شان و شوکت اور علمی و تہذیبی بلندی کا پتہ بھی چلتا ہے۔ انھوں نے غریبوں، فقیروں اور معذوروں کی امداد پر ہمیشہ توجہ کی اور ایک بڑی رقم اس کام کے لیے جمع کر دی کہ اس سے ان لوگوں کو روزی ملتی رہے۔ اتنا ہی نہیں انھوں نے حکومت کی طرف سے لکھنؤ کے علمی مراکز میں حصولِ علم کے لئے وظیفہ بھی مقرر کیا، غریب و نادار مریضوں کے لیے شفا خانے کھلوائے اور سب سے بڑھ کر بردہ فروشی کی اس رسم پر بھی پابندی عائد کی جو اس زمانے میں رائج تھی۔ رعایا کے تحفظ کے طور پر ٹھگوں اور ڈاکوؤں کے مظالم کو روکا اور اپنے مختصر دورِ حکومت میں علم و ادب اور شعر و فن کو کافی وسعت بخشی۔ ۷ جولائی ۱۸۳۷ء کو ان کے انتقال کے بعد درباری ریشہ دوانیوں اور ریزیڈنٹ کی سازشوں سے جو قتل و غارت گری ہوئی اس کا تفصیلی ذکر کرنا ضروری نہیں ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ رعایا اور عوام میں ان کی موت سے جو مایوسی اور صدمہ ظاہر ہوا وہ ان کی مقبولیت کا بہت بڑا ثبوت ہے۔

محمد علی شاہ

محمد علی شاہ بڑے ہنگامہ خیز حالات میں تختِ سلطنت پر بیٹھے تھے، نصیر الدین حیدر کے انتقال کے بعد ان کی والدہ "بادشاہ بیگم" نے منا جان (مرحوم بادشاہ کے بیٹے اور وارث) کو تخت و تاج کا مالک قرار دے کر ان کی بادشاہت کا اعلان کر دیا، کمپنی اس کے لیے تیار نہ تھی اور اس کشمکش نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ پہلی بار اودھ اور کمپنی کی فوجوں میں مقابلہ ہوا اور بادشاہ بیگم اور منا جان کی گرفتاری کے بعد محمد علی شاہ (سعادت علی

خاں کے بیٹے، نصیر الدین حیدر کے چچا) کو حکومت سونپنے کا فیصلہ کیا گیا — البتہ ان سے ریزیڈنٹ نے اس اقرارنامہ پر دستخط لے لیے تھے کہ "بادشاہت ملنے کے بعد گورنر جنرل کی طرف سے جو نیا معاہدہ بھی پیش کیا جائے گا اسے بخوشی منظور کر لیں گے۔" ممکن ہے اس سلسلہ میں بعض مورخین کا یہ خیال صحیح ہو کہ "ان کو خود بھی یہ احساس تھا کہ اس شرط کے ذریعہ یہ سلطنت ان کے خاندان والوں کے ہاتھ سے نکل جائے گی"[۴۶] لیکن موجودہ حالات میں وہ اس سلطنت سے دستبردار ہونا نہیں چاہتے تھے۔ ظاہر ہے انتظامی اور فوجی و معاشی امور کے نظام میں بادشاہ کے اختیارات برائے نام ہی رہ گئے تھے، پھر بھی امرا، روسا اور عوام کی معاشرتی اور تہذیبی روایات میں کسی طرح کا انحطاط پیدا نہ ہونے پایا۔ انھوں نے بہت سی بدعنوانیوں کو دور کر کے بہتر طرزِ حکومت پر توجہ دی، زراعتی پیداوار میں اضافہ ہوا، پولیس، قانون اور مال کے محکموں کے نظام میں سدھار ہوا، اور تجارت و صنعت و حرفت میں بھی غیر معمولی ترقی ہوئی۔ ان کے دورِ حکومت میں رعایا کی بہبود کے لیے بڑے بڑے کام کیے گئے۔ نہریں جاری کی گئیں، کنوئیں اور تالاب کھدوائے گئے، مسافروں کے لیے سرائیں بنوائی گئیں اور امام باڑہ حسین آباد، حسین آباد کا تالاب، جامع مسجد اور بہت سی دوسری عمارتیں بادشاہ کے ذوقِ تعمیر کا احساس دلاتی ہیں۔ شعر و ادب کی روایات اپنی امتیازی خصوصیات کے تحت بڑھتی رہیں اور ہر شعبۂ فن ترقی کرتا رہا۔ انھیں خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صاحبِ بوستانِ اودھ لکھتے ہیں کہ:-

"ہر امرے کہ ازیں بادشاہ بہ ظہور رسید صد ہزار تحسین است۔ در عہدِ دولتش ہمہ مردم فارغ البال و آسودہ حال بودند۔ ہیچ کس آزارے بر دل نداشت ابوابِ معدلت بر روئے خلائق باز و دستِ تظلم و تعدی کوتاہ بود۔ باوجود ضعفِ پیری از کارہائے سلطنت خود را معذور نمی داشتند و بر امورِ کلی و جزوی می رسیدند"[۴۸]

محمد علی شاہ نے محض پانچ سال حکومت کر کے، مئی ۱۸۴۲ء کو انتقال کیا لیکن اس مختصر دور میں بھی انتظامِ سلطنت کو جو استحکام بخشا اس سے ہر طبقہ اور ہر علاقہ کے لوگوں کو امن و سکون اور خوشحالی حاصل رہی یہاں تک کہ انگریزوں کو بھی کسی قسم کی بدنظمی کی شکایت کا موقع نہ مل سکا۔

امجد علی شاہ

امجد علی شاہ اپنی ہمدردی و شرافت کے لیے بھی مشہور تھے اور سخاوت و فیاضی کے لیے بھی۔ رعایا کی عام خوشحالی میں اضافہ کے ساتھ ساتھ انھوں نے گومتی پر لوہے کا پل تعمیر کرا کے اور لکھنؤ سے کانپور تک پختہ سڑک بنوا کر ذرائع آمد و رفت کی بڑی دشواری دور کرا دی۔ صنعت و حرفت، تجارت اور زراعت کی ترقی کے ساتھ ان کے دور میں علومِ مشرقیہ کے ارتقار پر خاص توجہ کی گئی۔ فلسفہ، منطق اور مذہبی و دینی علوم کا معیار بلند کرنے کے لیے مدرسۂ سلطانی کا قیام عمل میں آیا اور نامور علمار و ماہرین کو اعزاز و اکرام کے علاوہ وظائف دے کر طلبار کی ہمت افزائی کی گئی، امجد علی شاہ خود مہذب شائستہ قسم کے انسان تھے اور انھوں نے اودھ کی وضعداری اور تہذیبی امتیاز کو آگے بڑھانے میں بڑا حصہ لیا۔ ان کے دور تک اردو نثر و نظم کا بڑا سرمایہ سامنے آچکا تھا اور شعرار و ادبار سکون و اطمنان سے فنی اقدار کے ارتقار پر متوجہ تھے۔

واجد علی شاہ

امجد علی شاہ کے دور تک آتے آتے ایسٹ انڈیا کمپنی فوجی اور سیاسی حیثیت سے اودھ کے معاملات میں اتنا حاوی ہو چکی تھی کہ اب وہ محض یہ موقع تلاش کر رہی تھی کہ اس حکومت کو کس طرح قبضہ میں کر لیا جائے۔ ابھی تک نیپال اور افغانستان سے تصادم کی وجہ سے وہ اِدھر متوجہ نہ ہو سکی تھی لیکن واجد علی شاہ کی تخت نشینی کے فوراً ہی بعد ان کے خلاف بدنظمی، ہیجان، انتشار اور ان کی نااہلی اور عیاشی کے ایسے ایسے الزامات تراش لیے گئے جس کا علاج ان کی معزولی کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ ان کی تخت نشینی کے کچھ ہی عرصہ بعد لارڈ ہارڈنگ نے نومبر ۱۸۴۷ء میں متنبہ کر دیا تھا کہ اگر سلطنت کے حالات میں سدھار نہ ہوا تو کمپنی اختیارات کو اپنے ہاتھ میں لے لے

گی۔ دراصل یہ اس سلسلہ کی پہلی کڑی تھی لیکن ۱۸۴۹ء میں جب کرنل سلیمن کو رزیڈنٹ بنا کر لکھنؤ بھیجا گیا تو اس کو دراصل اسی مقصد کی تکمیل کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ بظاہر اس نے تین مہینہ تک (یکم دسمبر ۱۸۴۹ء سے ۲۸ فروری ۱۸۵۰ء تک) پوری ریاست کا دورہ کرنے کے بعد رعایا کی تباہ حالی، حکام کی سرکشی، لاقانونیت اور قتل و لوٹ مار کی کیفیات رپورٹ کی شکل میں مرتب کی تھیں لیکن (Samuel Lucas) کے الفاظ میں :۔

> "....The character of his report was determined for him before he entered oude. He professed to examine but he was under orders to sentence; he pretended to try, but he was instructed simply to condemn." [۳۹]

چنانچہ انھیں 'ہدایات' کا اثر تھا کہ بادشاہ کے اختیارات پر زیادہ سے زیادہ پابندیاں عائد ہوتی رہیں، فوجی، اقتصادی، درباری یہاں تک کہ محل کے اندرونی معاملات میں بھی اس کے احکام کے خلاف دخل اندازی کر کے بے بس و مجبور کر دیا اور حالات نے ایسی سنگین شکل اختیار کر لی کہ معمولی افسران اور عاملوں سے لے کر وزرا کی تقرری تک رزیڈنٹ کی مرضی کے بغیر ممکن نہ تھا۔ مجتہد العصر جن ملزمان کو بے قصور ٹھہراتے تھے ان کو سزا دی جاتی اور جو واقعی میں فتنہ و فساد اور سرکشی کے مرتکب ہوتے ان کو رزیڈنٹ کی پشت پناہی حاصل ہوتی۔ اودھ کی ہر تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہے، یہاں اس کے تفصیلی ذکر کی ضرورت نہیں البتہ صاحبِ سیر المتاخرین نے جس واقعہ کو پیش کیا ہے اس سے اس کیفیت کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :۔

> "دربارِ لکھنؤ کا شاہی تخت، جسے غازی الدین حیدر نے کئی کروڑ روپیہ میں تیار کرایا تھا، واجد علی شاہ نے اسے کوٹھی" فرح بخش سے قیصر باغ میں منتقل کرنا چاہا لیکن رزیڈنٹ کی اجازت حاصل نہ ہو سکنے کی وجہ سے اتنا معمولی سا کام بھی بادشاہ سے ممکن نہ ہو سکا" [۴۰]

ان چیزوں کا مقصد صرف یہ تھا کہ رعایا اور عوام کی نظر میں بادشاہ کی وقعت کم ہوتی رہے۔ وہ رزیڈنٹ اور گورنر جنرل کے احکام کے آگے سرِ تسلیم خم کرتا رہے، اور انتشار و کساد بازاری پیدا کر کے ہر قسم کی تباہی و بربادی کا ذمہ دار بادشاہ کو قرار دیا جا سکے۔ فیض احمد فیض کے یہ اشعار اس دور کی کیفیت پر بھی پوری طرح صادق آتے ہیں:

سچ ہے ستم جناب کے سب دوستانہ تھے
حق ہے ہمیں کو آپ کے شکوے بجا نہ تھے
ہاں جو جفا بھی آپ نے کی قاعدے سے کی
ہاں ہم ہی کاربندِ اصولِ وفا نہ تھے

دراصل انگریزی حکام اس نظریہ پر پوری طرح عامل تھے کہ اگر دروغ بیانی کی اشاعت پوری شدت سے کی جائے تو کچھ عرصہ بعد لوگوں کو اس کی سچائی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ واجد علی شاہ کی صلاحیتوں اور ان کے حسنِ انتظام سے متنفر کرنے کے لیے یہی طریقہ اپنایا گیا اور کمپنی کے (Directors) کی طرف سے جو منصوبہ بنایا گیا تھا اس پر کرنل سلیمن پوری طرح عامل رہا اور اس کے بعد جب نومبر ۱۸۵۴ء میں (Gen. Outram) نے ریزیڈنٹ کا عہدہ سنبھالا تو اس نے بھی اسی مقصد کی تکمیل ضروری سمجھی۔ چنانچہ واجد علی شاہ اور ان کے دربار میں ۹ سال سے مایوسی اور کشمکش کے جو بادل منڈلا رہے تھے وہ ۴ فروری ۱۸۵۶ء کو شدید طوفان کی شکل میں امنڈ پڑے جس دن کہ انھیں رزیڈنٹ نے گورنر جنرل کی طرف سے یہ حکم سنایا کہ ان کو معزول کر کے اودھ کا انتظام کمپنی نے اپنے اختیار میں کر لیا ہے۔

انصاف پسند محققین و مورخین نے واجد علی شاہ کی شخصیت اور ان کے انتظامِ سلطنت اور اس دور کے معاشرتی و سماجی حالات کے سلسلہ میں جو خیالات پیش کیے ہیں اس سے بہت سے حقائق پوری طرح سامنے آجاتے ہیں۔ تختِ حکومت پر بیٹھتے ہی انھوں نے رعایا کی خوشحالی، درباری شان و شوکت اور مملکت کی ترقی کے لیے ہر شعبہ کی اصلاح پر توجہ کی۔ خاص کر فوج کی تنظیم و تربیت اور اس کے استحکام پر زیادہ زور دیا" بادشاہ نے پیادوں کی چند پلٹنیں اور سواروں کے رسالے بھرتی کر کے ان کو وردی اور ہتھیاروں سے آراستہ کیا تھا..... اکثر بادشاہ بہ نفسِ نفیس میدانِ پریڈ میں جا کر ان کے قواعد اور نیزہ بازی اور شمشیر زنی، اور تفنگ اندازی کی مشق

ملاحظہ فرماتے اور تین تین چار چار ساعت تک گھوڑے پر سوار ہوکر دھوپ میں کھڑے رہتے تھے اور کبھی کبھی خوش ہوکر انعامات اور خطابات سے سرفراز کرتے تھے۔[۵۱] رعایا سے ایسی ہمدردی و شفقت تھی کہ کسی پر ظلم و جبر برداشت نہیں کرسکتے تھے اور عدل و انصاف سے ذرا بھی انحراف نہیں پایا جاتا۔ اسی کے پیش نظر ان کی سواری کے ساتھ ایک ایسا صندوقچہ رکھا رہتا تھا کہ اگر کسی کو داد و فریاد کرنی ہے تو وہ اس صندوقچہ میں اپنی عرضی ڈال سکتا ہے بادشاہ ان درخواستوں کو بذاتِ خود پڑھ کر ان پر احکام صادر کرتے تھے۔" ہر گاؤں میں مسافروں کے لیے سرائے قائم کی گئی تھیں اور ان کے تحفظ کے لیے شاہی خرچ سے چوکیدار مقرر تھے، زراعتی پیداوار میں اضافہ کے لیے جگہ جگہ کنوئیں کھدوائے گئے تھے، نہریں تعمیر ہوئی تھیں اور تجارت کی ترقی پر خاص طور سے دھیان دیا گیا تھا، انھیں خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کا ایک ہمعصر مورخ و دانشور مسیح الدین لکھتا ہے کہ:۔

> "Wajid Ali Shah is much beloved and respected by his subjects, for the highest to the lowest, from the rajah to the ryot, and this the more so, as he has ever discharged the duties of his high office with justice tempered by mercy." [۵۲]

اس کے ساتھ ان میں علم و فن کے لیے جو فطری رجحان تھا اس نے اودھ کی ادبی زندگی کو سنوارنے، سدھارنے اور اسے ترقی دینے میں خاص طور سے مدد کی۔ حکومت کی ذمہ داریاں نبھانے کے ساتھ ساتھ انھوں نے شعر و ادب اور دوسرے فنونِ لطیفہ کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے جو وسعت بخشی اس کی مثال کہیں اور بڑی مشکل سے ملے گی۔ اس دور میں موسیقی، رہس اور ڈراما کا فن بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ بادشاہ نے خود تقریباً پچاس کتابوں کی تصنیف کی، شعرا کی قدر و منزلت کا یہ عالم تھا کہ شیخ تصدق حسین کے الفاظ میں "ان کے عہد میں اتنے شاعر لکھنؤ میں تھے جتنے سارے ہندوستان میں تھے..... شعر کہنا لکھنؤ میں ایک وضعداری بن گیا تھا، جہلا کے کلام میں بھی شاعرانہ خیال آفرینیوں، تشبیہوں اور استعاروں کی جھلک نظر آنے لگی"۔ شاہی دربار میں جو مشاعرے منعقد ہوتے تھے اس کے لیے خاص اہتمام کیے جاتے تھے، اس کی کیفیت خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی نے اس طرح بیان کی ہے کہ:۔

> "لال بارہ دری میں سہ پہر کو چمن بندی گل و فوارہ کی ہوتی تھی، کمرے میں تمام سامانِ عیش تیار ہوتا تھا، دریچیاں سبز، سُرخ کاشانی مخمل کی مسندیں گز گز بھر کی جھالر نقرئی طلائی ٹنکی ہوئی، چاروں طرف گلدستے قرینے سے رکھے ہوئے، جھاڑ، جھاب، کنول، فانوس، شام سے روشن ہوگئے..... مشاعرے میں ہمیشہ اہل دربار شریک ہوتے تھے اور کبھی کبھی خاص الخاص بادشاہ مدعو ہوتے تھے..... خواجہ سرا گنگا جمنی کشتیاں جن میں بھاری بھاری پچکے گوٹے کے ہار، الائچیاں، چکنی ڈلیاں، عطر کے کنٹر رکھے ہوئے، مخملی کشتی پوش پڑے ہوئے سب کے سامنے ایک ایک کشتی لگاگئے، اس کے بعد مشاعرہ شروع ہوا۔"[۵۳]

غرضیکہ شعر و ادب تہذیبی زندگی میں اس طرح چھا گیا تھا کہ لوگ ادب بولتے تھے، شاعری میں باتیں کرتے تھے اور ساری فضا میں شعر و ادب کا ذوق گونجتا رہتا تھا۔

مختصراً یہ کہا جاسکتا کہ ہر فرد مطمئن و خوشحال بھی تھا اور اس کا فنی و ادبی مذاق بھی نازک سے نازک اور باریک سے باریک پہلوؤں کی تلاش میں لگا رہتا تھا، صنعت عامہ، علم و ہنر اور فنونِ لطیفہ کے ہر شعبہ میں صفائی و نفاست پر توجہ دی جاتی تھی اور دستکاروں کو ایسی مقبولیت حاصل تھی کہ ان کی بنائی ہوئی اشیاء ملک کے ہر گوشہ میں نعمت سمجھی جاتی تھیں۔ عیش و نشاط کے تقاضوں نے تکمیلِ ذوق کے لیے مختلف فنون میں نئے نئے گوشے بھی پیدا کرائے اور انھیں کی ضروریات کے تحت اعلیٰ اور نفیس سامان بھی تیار ہونے لگے اس طرح صنعت و حرفت کو بھی ترقی ہوئی اور تجارت و دولت میں بھی، انھیں چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے واجد علی شاہ کا ہمعصر مؤرخ خواجہ محمد بشیر لکھتا ہے کہ:

"باعتبار تعیم بذل واحسان وتخصیص فراوانی زخارِ زر و گوہر نمایاں وتکلفات استعمال لباسہائے پاکیزہ وموزوں وتصرفات در ترکیبات اطعمۂ لذیذہ ولطافت شئون از ملکِ سبزو باسیخواست و بہ اعتبار جلوہ آرائیہائے حسنِ خورشید طلعتاں نازک ادا و خوب رویانِ دلربا از مصر وکنعان خراج میگرفت وباعتبارِ جمعیتِ اربابِ فضل و براعت ومجمع دانشمندان مستوعبِ مقدمات جلائل صناعت بر یونان تفوق می جست"[۴]

واجد علی شاہ کی معزولی اور غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جب اودھ پوری طرح انگریزی عملداری میں آگیا اس کے بعد جہاں سیاسی زندگی میں انقلابات رونما ہونے لگے وہیں صناعی وفنکاری کی ان اعلیٰ قدروں پر بھی تباہی آگئی، اس کی دولت بھی مٹ گئی اور شان و شوکت بھی۔

ایک انگریز مورخ H. C. IRWIN جس نے واجد علی شاہ کی عیاشی ونااہلی اور انتظام حکومت کے انتشار وہیجان کا مبالغہ آمیز نقشہ پیش کرتے ہوئے ان کی معزولی کو حق بہ جانب قرار دیا ہے وہ بھی ضبطی حکومت کے تقریباً بیس سال کے بعد بھی (۱۸۸۰ء میں) اس کا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکا کہ:-

"With the traders & artisans of Lucknow annexation could hardly be otherwise than unpopular, and the decay of these classes during the last 20 years, has been pitiful in the extreme.[۵]

اس طرح واجد علی شاہ کے دورِ حکومت نے بے پناہ دشواریوں اور سنگین پابندیوں کے باوجود اودھ کی اس تہذیبی اور ثقافتی میراث کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اسے ترقی بھی دی، جس کی بنیاد ان کے آبار واجداد نے تقریباً ایک سو پینتیس سال پہلے قائم کی تھی۔

یہ تہذیب جو ہند آریائی عناصر کی پروردہ تھی، اس میں ایرانی لطافت وشائستگی کے امتزاج سے ایک ایسی امتیازی حیثیت پیدا ہوگئی جو کسی دوسری جگہ نہ ہو سکی اور اس کے یہ نقوش آج بھی دھندلے طور پر برقرار ہیں البتہ اسپنگلر کا یہ خیال اس پر پوری طرح صادق آتا ہے کہ" انسانی تہذیب ایک زندہ نظام ہے جو ہر جاندار کی طرح نشو ونما پا کر جوان ہوتی ہے اور پھر بوڑھی ہو کر مرجاتی ہے" چنانچہ اس کے عناصر بھی اب انحطاط وضعف کی اس منزل تک پہنچ چکے ہیں جس کی توانائی مفقود ہو چکی ہے اور آخری سانسیں آرہی ہیں۔

۱۸۵۷ء میں غدر کے بعد جس طرح سارے ملک پر براہ راست برطانیہ کی حکومت قائم ہوگئی اسی طرح اودھ کی جغرافیائی اور علاقائی حیثیت بھی ختم کرکے اسے ممالکِ متحدہ آگرہ واودھ (موجودہ اترپردیش) کا نام دیا گیا۔ یہیں سے ہمارے ہندوستان کے ساتھ (پہلے کے) اودھ کی تہذیب ومعاشرت اور یہاں کے عوام کے شعور وافکار نے نیا سفر شروع کیا اور مشرقی تصورات میں مغربی عناصر کی شمولیت ہونے لگی، سماجی اور اجتماعی زندگی کا کوئی شعبہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، یہیں سے "نئے معاشی تعلقات"، نئے ادبی رجحانات، طریقۂ تعلیم اور نئی اصلاحی تحریکات کے نئے طوفان اٹھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اور جلد ہی نئے تقاضوں کے تحت غیر معمولی تبدیلیاں واقع ہونے لگیں۔ علمی سطح پر سائنس اور مغربی فلسفہ کے مطالعہ نے وسعت پیدا کی اور نئے ادبی رجحانات سے متاثر ہو کر نئی روایتوں کی بنیاد پڑی۔ ☐

حَوَاشی:- ۱؎ بحوالہ (— Oudh Gazatters Vol. I, PP2

۲؎ شمولہ "اودھ کے پرکھو کوی" بی۔کے معرا۔ لکھنؤ یونیورسٹی (— cornegi

۱۹۶۰ء۔ ۳؎ (— अवध के स्थान नामों का भाषावैज्ञानिक अध्यन – PP2

(Political -۔۴؎(- Lko. University Hindi Publication, 1973

DACOITE IN — ۴؎ Hist. of ANCIENT india – PP64)

(— EXCELSIS Pustak Kendra, Lko. 1971

۵؎ (Oudh Gazatters PP. 458, Vol. I) ۶؎ آئین اکبری

جلد دوم۔ صفحہ ۱۴۵۔ ۱۸۵۶ء (— A short Hist. of Muslim

(— rule in India (Dr. Ishwari Prashad) PP5

A short Hist. of Muslim Rule in India – PP 455

۹؎ Quoted in Dacoittee in Excelsis (Samuel Lucas) PP 3

۱۰؎ S.L. -) First Two Nawabs of Awadh - PP30 —

۱۱؎ Agrwal & Co. Agra 1954 -) The First two Nawabs

of Awadh - PP 30) ۱۲؎ The First two Nawabs of -)

Awadh PP 30 -) ۱۳؎ بوستان اودھ. PP 37 مطبع احمدی

18-92) ۱۴؎ First two Nawabs of Awadh - PP 31-32

۱۵؎ بوستانِ اودھ (کنور درگا پرشاد) صفحہ ۷۳۔ مطبع احمدی ۱۸۹۲ء

۱۶؎ -) The garden of India PP 68 Pustak Kendra,

Lucknow 1973 -) ۱۷؎ The First two Nawabs of -)

PP 42 - Awadh -) ۱۸؎ دہلی میں اردو شاعری کا فکری اور

تہذیبی پس منظر صفحہ ۳۰۔ ادارۂ تصنیف علی گڑھ ۱۹۶۴ء۔ ۱۹؎ بوستانِ

اودھ از کنور درگا پرشاد مطبع احمدی ۱۸۹۲ء۔..........

۲۰؎ First Two Nawabs of Awadh (A.L. Srivastava)

۲۱؎ عماد السعادت۔ سید غلام علی صفحہ ۳۶۔ ۲۲؎ - "First Two

Nawabs of Awadh" - ۲۳؎ دہلی میں اردو شاعری کا فکری اور

تہذیبی پس منظر صفحہ ۷۴۔ (ڈاکٹر محمد حسن) ادارۂ تصنیف علی گڑھ ۱۹۶۴ء

۲۴؎ دہلی میں اردو شاعری کا فکری اور تہذیبی پس منظر صفحہ ۷۴ (ڈاکٹر

محمد حسن) ادارۂ تصنیف علی گڑھ ۱۹۶۴ء۔ ۲۵؎ حدیقۃ الاقالیم (مشمولہ

دہلی میں اردو شاعری کا فکری اور تہذیبی پس منظر صفحہ ۴۸ (ڈاکٹر

محمد حسن) ادارۂ تصنیف علی گڑھ ۱۹۶۴ء۔

۲۶؎ First Two Nawabs of Awadh pp 247

۲۷؎ ۲۸؎ عمادت السعادت ۲۹؎ آخری تاجدار اودھ صفحہ ۸۔

دانش محل لکھنؤ ۱۹۴۵ء۔ ۳۰؎ ڈاکٹر ہاف مین جرمنی کا ایک

(Scholar) تھا جس نے ۲۴ ستمبر ۱۸۶۴ء کو واجد علی شاہ کو ایک خط میں

ان کے پٹیشن (Petition) سے متاثر ہو کر ان خیالات کا اظہار کیا تھا

یہ خط مسیح الدین کی کتاب ("Oude : Its Princes & Its Govt.)

میں شامل ہے۔ ۳۱؎ تاریخ فرح بخش

۳۲؎ The Garden of India PP 78 ۳۳؎ -) Dacoitee in

Excelsis - PP 17 -) ۳۴؎ تاریخ اودھ جلد دوم صفحہ ۴۰۔

۳۵؎ تاریخ فرح بخش ۔ ۳۶؎ بوستان اودھ، کنور درگا

پرشاد صفحہ ۶۴۔ مطبع احمدی ۱۸۹۲ء۔ ۳۷؎ -) The Garden of

India -) صفحہ ۸۰ H. C. IRWIN ۳۸؎ تحفۃ العالم (سید

عبد اللطیف شوستری۔ صفحہ ۵۳۱) مشمولہ لکھنؤ کی تہذیبی میراث۔

۳۹؎ The Garden of India PP 90) ۴۰؎ -) Dacoitte in

excelsis PP 34 -) ۴۱؎ Dacoitte in excelsis PP 35)

۴۲؎ -) Col. NAC Andrens Quoted in The Garden of

India P.95 -) ۴۳؎ Garden of India P 89 ۴۴؎ garden -

of India P 91 -) ۴۵؎ دریائے لطافت (ترجمہ) صفحہ ۱۲۴۔

۴۶؎ -) How to make & how to break a treaty; Quted

Dacoitte in Oudh PP 61 -) ۴۷؎ بوستان اودھ۔ کنور درگا

پرشاد صفحہ ۔ ۴۸؎ Dacoittee in Excelsis PP 80

۴۹؎ سیر المتشم (مشمولہ لکھنؤ کی تہذیبی میراث صفحہ ۱۱۰) ۵۰؎ تاریخِ

اودھ جلد ۵ (نجم الغنی صفحہ ۱۲۵) ۵۱؎ -) British Aggression

in Oudh PP 72 -) ۵۲؎ قدیم ہنروران اودھ صفحہ ۲۲۔.....

۵۳؎ تذکرۂ آبِ بقا ۔ ۵۴؎ صحیفۂ والاقدر صفحہ ۳۰،

مطبع نول کشور ۱۲۸۲ھ۔ ۵۵؎ -) The Garden of India - Vol.

I P 136 -)

> "شاعر کے کانوں کی فضا میں سلاست زبان
> کا نغمہ قدرتی طور پر سمایا ہوا ہوتا ہے لہٰذا
> وہ اپنے الفاظ کو اس خوبی سے ترتیب دیتا ہے
> کہ ان میں عالمِ تصویر کے علاوہ ایک تاثیر موسیقی بھی
> پیدا ہو جاتی ہے۔ شاعر کا کلام ایک آئینہ ہوتا ہے
> جس میں اس کے ان خیالات اور احساسات
> کا عکس نظر آتا ہے جو اس کے جذباتِ دل کے
> رنگ میں ڈوبے ہوتے ہیں"
>
> ——— پنڈت برج نرائن چکبست
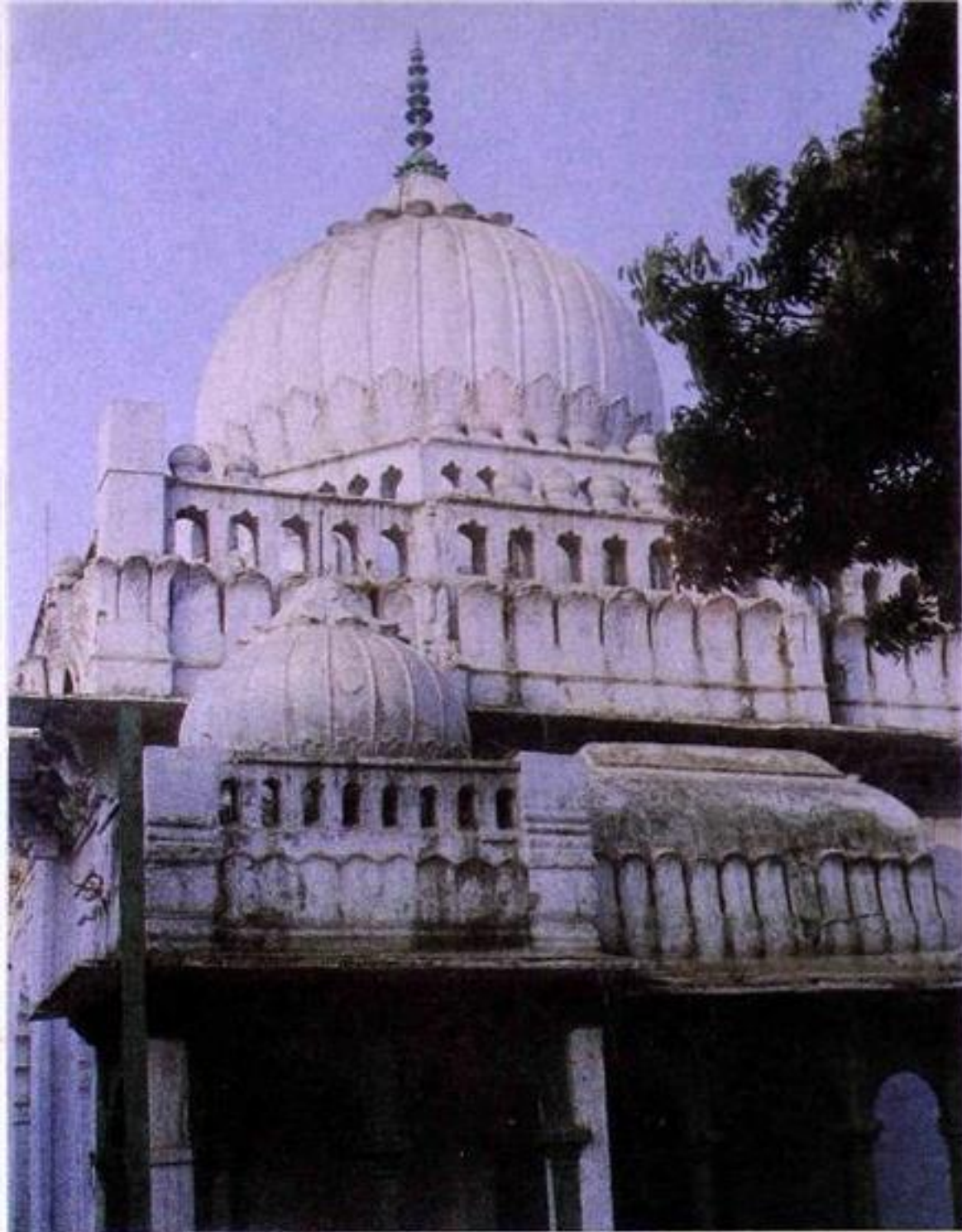
مزار
شاہ عبدالرحمٰن صاحبؒ
لکھنؤ

تصاویر: عباس حسنین
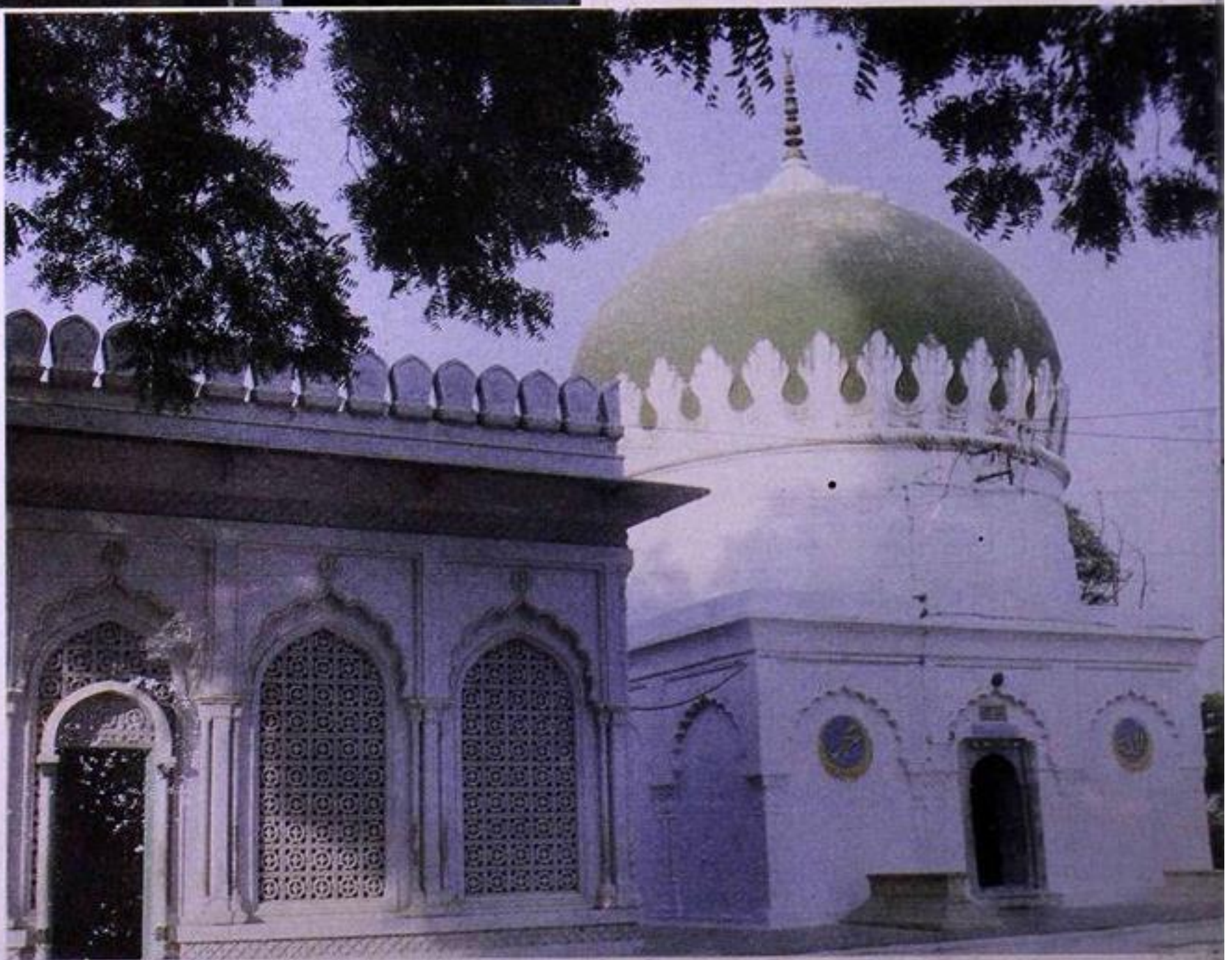
مزار
شاہ پیر محمد صاحبؒ
لکھنؤ

اودھ کا
ایک نادر
حقّہ

اودھ کے
عطر فروش

پروفیسر مجاور حسین رضوی

۵۳۴ - اترسوئیا
(حسن منزل)
الہ آباد

اودھ میں ادبی صنّاعی

صنّاعی تخلیقی ہنر ہے۔ تخلیق کے تین مدارج ہیں :

(۱) تخلیق محض (۲) ایجاد یا انوکھا پن یعنی بدیع (۳) بیان اور اس کا حسن یعنی حسن' ایجاد و انوکھے پن سے مل کر توازن اور تناسب' فن پیدا کرتا ہے جسے صنّاعی کہا جاتا ہے۔

اگر کائنات کی حقیقت پر غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوگا، کہ خداوند عالم خالق بھی ہے، بدیع السماوات والارض بھی ہے اور صانعِ مطلق بھی ہے۔ اس کی صناعی کا ایک کرشمہ وہ ہے جسے حُسن کا نام دیا جاتا ہے۔

ادبی تخلیق میں بھی جو حُسن ہوتا ہے وہ صناعی کا رہین منت ہوتا ہے۔ صناعی میں بیان کی وہ نزاکتیں بھی ہوتی ہیں جنھیں تشبیہ، مجاز استعارہ اور کنایہ کہتے ہیں اور الفاظ کا وہ آہنگ بھی ہوتا ہے جو نجم الغنی کے مطابق " کلام میں ایسی خوبی پیدا کرتا ہے کہ کانوں کو بھلا معلوم ہو اور دل میں اتر کر جائے۔" [۱] یہاں اتنا اضافہ ضروری ہے کہ الفاظ کے وجود اور پیکر کا احساس قوّتِ حاسّہ ہر طرح کرتی ہے ہم بولتے ہیں تو ساخت کو محسوس کرتے ہیں' کبھی کبھی تو اس کا ذائقہ چکھنا پڑتا ہے۔ سنتے ہیں تو ناگواری اور خوش گواری کی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ دیکھتے ہیں تو کرخمیدہ دال (د) یا چین بر جبیں تشدید (ّ) یا خوبصورت بالوں کی چوٹی والی میم (م) یا زلفوں والا لام (ل) ان سب کی شکلیں بھی ایک دوسرے سے مل کر مخصوص صوری پیکر تیار کرتے ہیں۔

ادب انسانی احساسات کا وہ دُھندلکا ہے جہاں الفاظ سے معنی روشنی میں آجاتے ہیں۔ یہ عمل فن کا مطالبہ کرتا ہے اور یہ فنکاری حسن پیدا کرتی ہے اور انھیں محاسن سے صناعی وجود میں آتی ہے۔

ادبی تخلیق میں سب سے اہم الفاظ ہوتے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سب کچھ الفاظ ہوتے ہیں حالاں کہ ابنِ قتیبہ نے چار صورتیں بتائی ہیں، لفظ و معنی اچھے ہوں؛ لفظ اچھے ہوں، معنی اچھے نہ ہوں۔ معنی اچھے ہوں لفظ اچھے نہ ہوں، لفظ و معنی دونوں اچھے نہ ہوں۔ لیکن اس بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابنِ قتیبہ کے نزدیک لفظ الگ کوئی چیز ہے اور معنی الگ کوئی شے ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ دراصل لفظ کا استعمال ہی معنی کی تخلیق کرتا ہے اور یہی لفظ اپنی ترتیب سے جہانِ معنی آباد کرتے ہیں۔

جس کے پاس جتنے زیادہ الفاظ ہوتے ہیں اتنا ہی اس کی معلومات زیادہ ہوتی ہیں اور کسی حد تک علم بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو لفظ ہی سب کچھ ہیں۔

"کُن" لفظ ہی تھا جس سے یہ دُنیا وجود میں آئی۔ اس سے زیادہ لفظ کی اور کیا اہمیت بیان کی جا سکتی ہے۔ انھیں لفظوں کے استعمال سے محاسن اور اسقام پیدا ہوتے ہیں اور انھیں محاسن کو صناعی کا ایک رخ سمجھا جاتا ہے ورنہ صناعی میں تو سب کچھ شامل ہے۔ علم بیان بھی، علم بدیع بھی، عروض بھی اور جتنے اسالیب یا طرز ادا ممکن ہیں وہ سب بھی۔ اس لیے یہاں جب صناعی یا صنعت کا لفظ استعمال کیا جا رہا ہے تو اس کا مفہوم ہے وہ محاسن جو لفظ کے استعمال سے کلام کے ظاہر و باطن میں پیدا ہوتے ہیں۔

ادب کا وہ رُخ جہاں محاسن کی تلاش ہونا چاہیے تھی دراصل

کڑھے ہوئے علم اور کلاسیکی ادب سے شناسائی اور تربیت یافتہ ذوق[۱] کا مطالبہ کرتا تھا، ان دونوں کے لیے جگر سوزی کی بھی ضرورت تھی اور ایک خاص طرح کی لطافتِ ذہنی کی بھی۔ اگرچہ ہمارے اکثر بزرگ صناعی سے خوش نہیں تھے۔ امداد امام اثر نے اسے "ڈھکوسلا" کہا ہے۔ شبلی جیسے متوازن ذہن رکھنے والے نے بھی ایک جگہ لکھا ہے کہ:

"انیس جس شاعری کو زندہ رکھنا چاہتے تھے اس کے چہرے پر صنائع اور بدائع کے داغ ہیں۔"

ایک جگہ اور لکھا ہے کہ "صنائع بدائع شاعری اور انشا پردازی کا دیباچۂ زوال ہے۔" مسعود حسن رضوی ادیب نے انیسیات میں نہایت عالمانہ انداز میں انیس کے کلام میں محاسن شاعری کی تلاش کی لیکن یہ بھی لکھ گئے کہ:

"صنعتوں کا استعمال بذاتِ خود شاعری نہیں ہے .... کچھ صنعتیں ایسی بھی ہیں کہ ان کا استعمال بذاتِ خود ایک مشکل صنعت ہے ..... ان صنعتوں کے استعمال کا ملکہ اور چیز ہے اور شاعری اور چیز ہے۔ جو صنّاع ان صنعتوں میں کمال رکھتا ہے وہ شاعر نہیں بلکہ ایک طرح کا بازی گر اور شعبدہ باز ہے۔"

اس سلسلے میں حالی کا بھی ایک اقتباس ملاحظہ ہو، کھانے کی مثال سے بات سمجھاتے ہیں:

"مفید ہو، لذیذ ہو، جزوِ بدن بننے کے لائق ہو۔ بو باس، رنگ روپ بھی اچھا رکھتا ہو۔ اگر باوجود اِن سب باتوں کے چینی کے باسنوں میں کھایا جائے تو اور بہتر ہے۔"

ہمارے بزرگوں کے لئے ساری مشکل یہی تھی کہ وہ صناعی کو چینی کا باسن یا نفسِ شاعری سے الگ کوئی چیز سمجھتے تھے۔ لوگوں کے خیال میں صنّاعی کی مثال زیور کی سی تھی، جسے کہیں سے لاکر عروسِ شعر کو پہنا دیا جاتا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ صنعتیں کہیں باہر سے نہیں لائی جاتی تھیں، الفاظ کی نشست، ان کے دروبست سے پیدا ہوتی تھیں۔ یہ دراصل کھانے کا رنگ، بو باس اور کسی حد تک ذائقہ تھا۔ چینی کا باسن تو وہ ہیئت تھی جس ہیئت میں تخلیق پیش کی جاتی تھی۔

دراصل صنعت خود الفاظ کے اندر ہی موجود ہوتی ہے۔ لفظ کا استعمال بہت سارے امکانات کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ عام آدمی جب کوئی لفظ استعمال کرتا ہے تو بات وہیں ختم ہوجاتی ہے، سارے امکانات ختم ہوجاتے ہیں۔ لیکن تخلیق کار جب کوئی لفظ استعمال کرتا ہے تو وہ بہت سارے امکانات[۲] کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

قواعد اور صناعی میں یہی فرق ہے۔ قواعد یہ تو بتادے گی کہ یہ لفظ اسم ہے، صفت ہے، فعل ہے۔ باہمی الفاظ یا حروف میں کیا رشتہ ہے۔ مضاف مضاف الیہ، جار مجرور، صفت موصوف وغیرہ۔ لیکن صناعی یہ بتاتی ہے کہ لفظ میں کتنی گہرائی ہے۔ اس میں کہاں تک وسعت ہے وہ دوسرے لفظ کے ساتھ کس حد تک نبھا سکتا ہے۔ "پوشش چھینٹ[۳]" کی گل کاری تو اچھی لگی مگر پوشش کھدّر بہت گاڑھا معلوم ہوا۔

بالکل انسانوں کی طرح لفظ بھی ایک دوسرے سے مل کر رہتے ہیں، اور جب ان کی دوسرے لفظ سے نہیں نبھتی تو "زیرِ قدمِ[۴] والدہ فردوس بریں ہے" جیسے مصرعے وجود میں آتے ہیں۔ الفاظ میں ایک دوسرے کے ساتھ تصادم اور تعاون ہوتا رہتا ہے اور ان کی ترتیب میں جب کسی طرح کا حسن آجاتا ہے تو کبھی معنی چمک اُٹھتے ہیں اور کبھی انھیں کا باہمی میل ملاپ مکمل تخلیق کو چمکا دیتا ہے۔

ان محاسن کی طرف ۲۷۴ھ میں عبداللہ بن معتز عباسی نے توجہ دی۔ اس نے سترہ[۵] محاسن شمار کیے۔ ابو نصر علی بن احمد طوسی نے بھی اس موضوع کی طرف متوجہ کیا۔ مولوی شمس الدین کی "حدائق البلاغت" اس سلسلے میں اہم کتاب سمجھی جاتی ہے لیکن اردو میں کہا جاتا ہے کہ خوب محمد چشتی نے "بھاو بھید" علم بدیع پر کتاب لکھی۔ منشی رنچھور داس جون پوری نے ۱۱۳۵ھ میں "حقائق الانشار" کے نام سے ایک رسالہ لکھا جس میں نثر میں صناعی پر روشنی ڈالی گئی ہے[۶] لیکن سچ یہ ہے کہ بحر الفصاحت میں نجم الغنی نے ستاروں کی طرح چمکتے ہوئے موتی بکھیرے ہیں۔ انھوں نے کل ایک سو گیارہ یعنی ستاون صنائع لفظی اور چون صنائع معنوی پر روشنی ڈالی ہے۔

عزیزی ڈاکٹر رحمت علی خاں نے اپنے غیر مطبوعہ تحقیقی

مقالے میں تین صنعتوں کا اضافہ کیا۔ عزیزی ڈاکٹر محبوبؔ عالم انصاری نے مزید تین صنعتیں دریافت کیں۔ اس طرح ان کی تعداد ایک سو سترہ ۱۱۷ ہو گئی ہے۔

لیکن اس سے بڑا المیہ اور کیا ہوگا کہ چھپنؔ کے بعد سے نقد ادب میں محاسن کی تلاش بے سود سمجھی گئی۔ شعر میں سماج اور عوام 'ہل بیل' 'ہل چینی' وغیرہ وغیرہ تلاش کیے جانے لگے۔ ادبی معیاروں پر ادب کی تفہیم زیاں کاری اور سُود فراموشی کی علامت سمجھی گئی۔ اسلوبیاتی تنقید یا ساختیاتی تنقید نے تعبیر تشریح تجزیہ اور تفہیم میں محاسن کی تلاش فعل عبث بنادی کبھی کبھی بعض مدرسین امتحان کے پرچوں میں گلزارِ نسیم یا مرزا دبیر پر سوال کرتے ہوئے یہ ایک فقرہ بڑھا دیتے ہیں کہ محاسن شعری پر روشنی ڈالیے۔ حالاں کہ اُردو کے مزاج سے یہ محاسن ہم آہنگ تھے۔

اُردو کی وراثت ہندستانی تھی۔ عربی اور فارسی سے اگر نخلستان کی شادابی ملی تھی تو سنسکرت سے ہمالیائی سربلندی بھی عطا ہوئی تھی محترم علی جواد زیدیؔ نے بڑے خوبصورت انداز میں اس طرف اشارہ کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ تجنیسات میں کوئی سنسکرت شعراء سے بازی نہیں لے جا سکتا تھا۔ ڈاکٹر رحمت علی خاں نے اپنے وقیع مقالے میں عربی، فارسی، سنسکرت وغیرہ کے ساتھ تلگو میں بھی صناعی پر روشنی ڈالی ہے اور یہ بتایا ہے کہ تلگو میں ایکا کشری ایک صنعت ہے جس میں ایک ہی حرف کا استعمال کرتے ہوئے پوری نظم کی تشکیل کی جاتی ہے اس طرح یہ صنعت گری ہندستانی ہے اور ہندستان میں تو ہر ورق سے صنعت ترصیع آشکار ہے اور بالخصوص اُردو میں اگر دکنی پر نظر ڈالی جائے تو فخر دین نظامی کی 'کدم راؤ پدم راؤ' سے لے کر غواصی تک وہ سارے محاسن تلاش کیے جا سکتے ہیں جن کے لیے اودھ کی شاعری کو زیادہ "بدنام" کیا گیا۔ نثر میں 'سب رس' کے تمثیلی اسلوب میں جب محاسن کی تلاش کی جائے گی تو تجنیس کی بیشتر اقسام کے ساتھ اس کی مقفیٰ عبارت میں قافیہ معمولہ تک مل جائے گا اور اشتقاق، تاکید المدح، کلام جامع جیسی صنعتیں بھی تلاش کرنے پر مل جائیں گی۔ مراعاتُ النظیر اور حُسنِ تعلیل تو عام بات ہے۔

یہی وراثت دہلی سے گزرتی ہوئی اودھ میں آئی اور بلا شبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ مجسم و شجر جو دکن سے دہلی تک آئے تھے اُودھ میں آکر سجدہ ریز نظر آئے اور یہاں کے آفتاب و مہتاب نے اس صناعی کو تابندہ و درخشندہ بنا دیا۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اودھ کی فضا، نفیس طبیعتیں، مزاج کی لطافت، ان محاسن کو برتنے کیلئے بے حد موزوں بھی تھی اسی لیے یہ صناعی انیسویں صدی ہی میں نہیں بلکہ بیسویں صدی اور دورِ حاضر میں بھی موجود ہے اور یہ وہ ادبی اور تہذیبی میراث ہے جس کے بارِ امانت کو سنبھال کر رکھا گیا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلا نام انشاؔ کا لیا جانا چاہیے جنھوں نے صنعتِ مقلوب کے نادر نمونے پیش کیے اور ایک شعر میں نہیں کئی اشعار میں۔ صرف ایک شعر درج کیا جاتا ہے ؎

فقط اس لفافے پر ہے کہ خط آشنا کو پہنچے
تو لکھا ہے اس نے انشاؔ یہ ترا ہی نام الٹا

یہاں ایسی صنعتوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جو نسبتاً کم معروف ہیں مثلاً میر تقی میرؔ کی محبوب صنعت ایہام یا سوداؔ اور غالبؔ کی نظر کردہ حسن تعلیل اور مراعات النظیر (جو لکھنؤ کے انیسویں صدی کے تقریباً ہر شاعر کے یہاں پائی جائے گی) سے صرفِ نظر کیا گیا ہے اور یہ کوشش کی گئی ہے کہ اودھ کے شعراء نے جس بے تکلفی اور جس حُسن کے ساتھ ایک ایک شعر میں کئی محاسن جمع کیے اور جو صنعتیں نسبتاً کم معروف ہیں انھیں پیش کیا جائے۔

ناسخؔ کی اصلاح زبان کی کوششوں نے لفظ کے نکھار اور مرکبات کو حسین سے حسین تر بنانے کی طرف متوجہ کیا۔ فراغت اور خوش حالی کا دور ہی زندگی کے ان گوشوں کی طرف متوجہ کرتا ہے جہاں حُسن کاری ہوتی ہے۔ حُسن کاری ہی کا ایک نام صناعی تھا۔ اسی لیے اودھ میں صناعی کی روایت نسبتاً ہر جگہ سے زیادہ ارتقا پذیر رہی۔ ناسخؔ کہتے ہیں ؎

وہ آفتاب نہ ہو کس طرح سے بے سایہ
ہوا نہ سر سے کبھی سایۂ سحاب جُدا

اس میں جہاں مراعات النظیر ہے وہیں مذہب کلامی بھی ہے یعنی ایک بات کہی جو دعوے کے طور پر ہے اور پھر اس کے لئے دلیل لائے۔ آفتاب اس لیے بے سایہ ہے کہ سحاب ہمیشہ سایہ فگن رہتا ہے تو آفتاب پر کیسے سایہ ڈالے۔

انیسؔ و دبیرؔ سے پہلے دوسرے مرثیہ نگاروں خصوصاً ضمیرؔ کے یہاں صناعی کا حسن ہے[۱۱]

کس نور کی مجلس میں مری جلوہ گری ہے

میں تمثالیہ، لف ونشر وغیرہ بھی دیگر صنعتوں کے ساتھ ملتی ہیں لیکن صنعتوں کے خدا ہو سخن اور خدائے سخن اور خالق بنائے سخن انیسؔ و دبیرؔ ہیں۔

دبیرؔ نے شاعری میں صناعی کو اس منزل تک پہنچا دیا جس کے آگے سوچتے ہوئے تخیل کے پر جلتے ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، دبیرؔ کے کلام سے معروف صنعتوں کی مثالیں نہیں پیش کی جا رہی ہیں۔ جیسے ایہام، رعایتِ لفظی، صنعت مراعاۃ النظیر، حسنِ تعلیل وغیرہ بلکہ صرف ان صنعتوں کی نشاندہی کی جا رہی ہے جن کی طرف نسبتاً ذہن نہیں جاتا حالاں کہ روزانہ کی بات چیت میں ان میں سے اکثر صنعتیں شرفا اور اہلِ علم کے کلام میں خود بخود آجاتی ہیں۔ مثلاً صنعتِ عکس[۱۲] اس کی تعریف یہ ہے کہ کلام میں دو لفظ لائیں پھر ان کو الٹ پلٹ دیں۔ اس صنعت کی عظمت اس وجہ سے بھی ہے کہ براہ راست قرآنِ حکیم سے استفادہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ؕ

اب مرزا صاحب نے اپنے اسلوب میں اس سے جو فیض اٹھایا ہے وہ دیکھیے[۱۳]

انصاف کہاں سے ہو کہ دل صاف نہیں ہے
دل صاف کہاں سے ہو کہ انصاف نہیں ہے

میر انیسؔ[۱۴] کا بھی انداز دیکھ لیجیے ؎

استادہ آب میں یہ روانی خدا کی شان
پانی میں آگ، آگ میں پانی خدا کی شان

اس سلسلے میں اسی سے ملتی جلتی صنعت صنعت مقلوب ہے، یعنی مصرع کو اگر الٹ دیں تو وہی مصرع بنے۔ مرزا صاحب کے یہاں کئی بند ایسے مل جائیں گے جن میں یہ صنعت موجود ہے۔ ایک بند کی بیت ملاحظہ ہو:

آقائے امم عرشِ معلیٰ کا شرف ہے
یہ فرشِ باآداب ایک آقا کا شرف ہے[۱۵]

دوسرا مصرع اگر الٹ دیا جائے تو بھی یہی مصرع بنے گا یعنی اب اگر اس کے حروف کی ترتیب بائیں جانب سے شروع کی جائے تو یہی مصرع برقرار رہے گا۔

میر انیسؔ نے مقلوب سے ملتی جلتی صنعت کا نمونہ تجنیس قلب میں پیش کیا ہے ؎

زفرزواں ادھر سے دم جست و خیز تھا
الٹا پھرا ادھر سے تو رف رف سے تیز تھا

انیسؔ نے اشارہ بھی کر دیا ہے کہ زفرز کو اگر الٹ دیجیے تو رف رف بن جائے گا اور رف رف کو الٹا تو بھی زفرز۔

مرزا صاحب کے یہاں صنعت جمع، تفریق، اور تقسیم کی بڑی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ صنعتِ جمع کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے کہ ایک یا چند چیزیں ایک حکم میں جمع کر دی جائیں۔ یہ صنعت بھی قرآن شریف سے استفادہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :

المال والبنون زينة الحيوٰة الدُّنيا

یعنی مال و اولاد زندگانیِ دُنیا کی زینت ہیں۔ مال و اولاد کو ایک حکم زینت میں جمع کر دیا ہے۔ اب مرزا صاحب کا استفادہ ملاحظہ ہو[۱۶]

نقاش، نقش، کاتب و خط، بانی و بنا
بود و نبود، ذات و صفت، ہستی و فنا
آدم، ملک، زمین، فلک، گرد کیمیا
دُنیا و دین، حدوث و قدم، بندہ و خدا

سب شاہدِ کمالِ شہِ مشرقین ہیں
جب تک خدا کا ملک ہے مالک حسینؑ ہیں

اس بند میں صرف صنعتِ جمع ہی نہیں ہے صنعتِ تضاد بھی ہے۔ تجنیس بھی ہے، اشتقاق بھی ہے اور مراعاۃ النظیر بھی ہے۔

ثابت لکھتے ہیں کہ اس کمال کو دیکھیے کہ ہر مصرع میں چھ چیزیں لائے ہیں۔ نہ کم نہ زیادہ۔

اسی سے ملتی جلتی ہوئی صنعت تنسیق الصفات ہے یعنی کئی صفات ایک ساتھ مذکور ہوں۔ انیسؔ کہتے ہیں ؎

احسان بھی، حیا بھی، مروّت بھی، قہر بھی
خود موت بھی، حیات بھی، امرت بھی، زہر بھی

بنیاد نکتہ سنج بھی، دانائے دہر بھی
تسنیم بھی، بہشت بھی، کوثر کی نہر بھی

سر شرم سے جھکائے ہے نرگس ریاض میں
جنت سواد میں ید بیضا بیاض میں

صنعت تفریق میں دو امر بظاہر ایک طرح کے ہوں لیکن ان کے درمیان جو فرق ہے وہ واضح کر دیا جائے۔ دبیر کہتے ہیں ؎

آئینے کے آئین پہ میں نے جو کیا غور — منہ پر تو ہے کچھ اور پس پشت ہے کچھ اور
گو چرخ کی گردش سے نہ ہو صاف کبھی دور — ہر حاضر و غائب دل روشن کا ہے اک طور

جن آئینوں میں دونوں طرف ایک چمک ہے
وہ ایک مرا دل ہے اور اک مہر فلک ہے

صنعت تقسیم بھی ایک صنعت ہے اس میں اور لف و نشر میں باریک سا فرق ہے کہ لف و نشر میں اول چند چیزیں بیان کرتے ہیں پھر ان کے منسوبات لاتے ہیں۔ تقسیم میں چند چیزیں یا ایک ہی چیز کے چند اجزا بیان کیے جاتے ہیں پھر ہر چیز یا ہر چیز کے منسوب کو واضح کرتے ہیں کہتے ہیں ؎

تابوت اٹھانے کی جزا قبر کی راحت — دلدل کو بنانے کی جزا ناقۂ جنت
سقائی کے انعام میں کوثر کی حکومت — دولت ہے یہ سب تعزیہ داری کی بدولت

عابد کے لئے طوق پہنتے ہیں تو کیا ہے
وہ طوق نہیں دائرۂ حفظ خدا ہے

اس میں صنعت تقسیم ہی نہیں مذہب کلامی بھی ہے یعنی جزا کو دلیل بنایا ہے مراعاۃ النظیر ورعایت لفظی کے ساتھ دولت بدولت میں تجنیس زاید بھی ہے۔ مسعود صاحب نے میر انیس کے یہاں تینوں صنعتوں کی مثال ایک شعر میں دی ہے یعنی جمع، تقسیم اور تفریق کے بارے میں ؎

نکلا ادھر سے وہ جو اجل کا شکار تھا
بیدل ہوا سوار یہ دو تھا وہ چار تھا

ان صنعتوں کے علاوہ میر صاحب کے یہاں دوسرے مصرع میں سیاقۃ الاعداد بھی ہے۔

ایک اور صنعت مرزا صاحب کے یہاں ملتی ہے جس کو استتباع[19] کہتے ہیں یعنی اس طرز پر مدح کرنا کہ ایک مدح سے دوسری مدح حاصل ہو۔ ایک بند ملاحظہ ہو ؎

خالق نے عطا کی شہ مرداں کو یہ قدرت — بس ان کی زباں سے جو ہو محتاجوں کو حاجت
گردوں نے بلندی لی زمیں نے زر و دولت — یوسف نے لیا حسن سلیماں نے حشمت

پر ان کی قناعت ہے فزوں حد بیاں سے
جز نام خدا آپ لیا کچھ نہ زباں سے

یہاں آخری مصرع میں ابتدائی مصرعوں کی مدح سے مدح نکالی ہے کہ کائنات نے ہر شے آپ سے لی اور آپ نے سوائے ذکر خدا کچھ نہ لیا۔

مرزا صاحب کے یہاں صنعت رجوع کا بھی بڑا خوبصورت استعمال ملتا ہے۔ یہ صنعت جب کئی بندوں میں مسلسل آتی ہے تو نئی صنعت بن جاتی ہے جسے مثالیہ کہتے ہیں۔ یہاں صرف صنعت رجوع کی مثال پیش کی جاتی ہے۔ مثالیہ کی گنجائش نہیں ہے ؎

تاروں کا ہے دعویٰ کہ یہ رخ برج دجیٰ ہے
پر بدر ہے منکر، یہ کہاں مجھ میں ضیا ہے
ذروں کا اشارہ ہے، یہ شمس ضحیٰ ہے
خورشید لرزتا ہے کہ یہ نور خدا ہے

پروانہ و بلبل میں جدا بحث کا غل ہے
وہ کہتا ہے یہ شمع ہے یہ کہتی ہے گل ہے

مرزا صاحب کے یہاں بہت ساری صنعتوں سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف چند کی نشاندہی کی جا رہی ہے جن کی طرف نوق بلگرامی نے بھی متوجہ کیا ہے۔ صنعت تجرید کی مثال ملاحظہ ہو، گھوڑے کا تذکرہ ہے۔ یہ صنعت مبالغۂ مقبول میں بھی آتی ہے اس لئے کہ گھوڑے کے افعال کو جن صفات سے استعارہ کیا ہے وہ سب ممکن ہیں ؎

لڑنے میں یہ ہے عقل، بگڑنے میں جہالت
بڑھنے میں یہ ہے حرص، تو گھٹنے میں قناعت
جانے میں حواس، آنے میں عاشق کی طبیعت
مخفی ہے تو اسرار، عیاں ہے تو کرامت

ہر سو جو نسیم اس کے طرارے کی بہی ہے
سبزے کی طرح رن کی زمیں کھیت رہی ہے

جہالت میں ہی آدمی بگڑتا ہے۔ حواس جاتے ہیں۔ عاشق کی طبیعت بھی

محبوب پر آتی ہے وغیرہ۔

فوق نے بہت سی صنعتوں کی نشان دہی کی ہے، ان میں قافیہ معمولہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اگر لفظ کے ایک جزو کو قافیہ اور دوسرے جزو کو ردیف میں شامل کریں یعنی ایک ہی کلمہ میں ردیف و قافیہ پیدا کریں تو اس کو قافیہ معمولہ کہتے ہیں۔ مثال دی ہے ؎

کیا ہاتھ ہے کیا سینہ ہے کیا چہرہ ہے کیا سر
اے صلِّ علیٰ نور کا مجمع ہے سراسر

موصوف نے صنعتِ ترصیع کو صنعت موازنہ کہا ہے۔ اسی طرح مراعاۃ النظیر کی ایک قسم ایہام تناسب قرار دی ہے، لکھتے ہیں کہ اس کی پر لطف قسم وہ ہے جس کو ایہام التناسب کہتے ہیں۔ مثلاً دو معنی جمع کریں جن کو آپس میں کچھ مناسبت نہ ہو مگر ان معنوں کو جن دو لفظ سے تعبیر کریں ان میں ایک لفظ کے دو معنی ہوں اور معنی دوئم جو غیر مقصود ہوں، ان کو پہلے لفظ سے مناسبت ہو۔ مثلاً ؎

بارش تھی آبِ تیغ کی برسات سے فزوں
بدلی تھی فوجِ شام کی رنگت، گھٹا تھا خوں

یہاں بدلی کو بارش سے اور گھٹا کو برسات سے مناسبت ہے لیکن معنی دوئم مقصود نہیں ہے، بدلی کے معنی بدلنا ہے۔

مرزا صاحب کے یہاں کچھ ایسی صنعتیں بھی ہیں جن کا کوئی نام نہیں مل سکا۔ بحر الفصاحت میں تو اس کا امکان ہی نہیں تھا۔ حیاتِ دبیر اور المیزان میں بھی ان صنعتوں کی کوئی نشاندہی نہیں ہو سکی۔ مثلاً ایک مرثیہ ہے جس میں ہند قید خانۂ شام میں آتی ہے اور اسے کنیزیں بتاتی ہیں کہ قید خانہ میں ایک یوسف ہے۔ مرزا صاحب نے یوسف کا تلازمہ آخر تک برقرار رکھا ہے اور اس طرح سے کہ حضرت یوسفؑ اور حضرت سیّد سجّاد کے موازنے میں مصائب کے رُخ سے حضرت سید سجاد کی برتری ظاہر کی ہے۔ کچھ مصرعے درج کیے جاتے ہیں

یوسف جسے میں کہتی تھی وہ ہے یہی داری
یوسف مجھے کس واسطے تو کہتی ہے ہر بار
آداب بجا لاتی ہوں اے یوسفِ زنداں
اس عہد کے یوسف ہو تمھیں خلقِ خدا میں
فرمایا یہ درجہ تو ہے یوسفؑ سے فزاواں
گھر سے گئے یوسف تو ہوئے مصر کے سلطاں
یوسف نے زمانے میں یہ محشر نہیں دیکھا
یوسف کا فقط باپ کی فرقت میں کُڑھا دل

ہو سکتا ہے اسے صنعت لزوم یا صنعتِ التزام کہا جائے لیکن وہ زیادہ سے زیادہ ایک بند یا دو بند کے لیے ہے۔ یہاں تشابہ الاطراف ہے اور تلمیح کو نبھایا ہے، حسن یہ پیدا کیا ہے کہ حضرت یوسف اور حضرت سید سجّاد دونوں کی علامتوں کو ایک طرح سے روایت بنا دیا گیا ہے۔ اس بے مثال صناعی کی نزاکت نام کا بوجھ نہیں برداشت کر سکتی۔

اسی طرح ایک بند ملاحظہ ہو ؎

ہوتا ہے جو حاضر یہ بہادر سرِ دربار — دربار میں دُر بارِ علی ہوتے ہیں ہر بار
غیر از حسنینؑ ان پہ تصدق مرا گھر بار — عارض ہے قمر بار لبِ لعل گہر بار
یہ والیٔ اقلیم ولایت کا ولی ہے
تصویر تو لائے حسینؑ ابنِ علی ہے

یہاں لفظ 'بار' چھ مرتبہ آیا ہے اور ہر جگہ کہیں دوسرے لفظ کے ساتھ کبھی تنہا نئے معنی دیتا ہے ایک ہی لفظ کے کثیر الجہت استعمال کو اگر صنعت نہ کہا جائے تو پھر کیا کہا جائے اور پھر اس صنعت کا کیا نام رکھا جائے۔

یہ کہنا پڑتا ہے کہ میر انیس نے اس میدان میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں، کہتے ہیں ؎

دولت حاکمِ دوں پر ہے تر اداروں مدار — دارِ دُنیا سے تعلق نہیں رکھتے دیں دار
کیا مجھے دار پہ کھینچے گا وہ ظالم غدار — بخت خفتہ ہیں ترے اور مرے طالع بیدار
کسی سردار نے یہ اوج نہ پایا ہو گا
دارِ طوبیٰ کا مرے فرق پہ سایہ ہو گا

نو بار انیس نے لفظ 'دار' کا استعمال کیا ہے اور ہر بار یہ لفظ ایک نئے معنی دیتا ہے۔ مسعود صاحب نے بھی "انیسیات" میں اس کا تذکرہ نہیں کیا کہ اس صنعت کا کیا نام ہو گا۔ حالاں کہ انھوں نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ انیس کے کلام میں ان صنعتوں کی طرف توجہ کیا ہے جس کو کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ لکھتے ہیں انیس نے ایسی صنعتیں ایجاد کر دی ہیں جن کا نام ابھی تک مقرر نہیں ہو سکا۔ مسعود صاحب نے ایسے مصرعوں کی

فہرست دی ہے۔

(۱) الجھاتے تھے کمند کینے کمان میں

(۲) بیکار کمیں میں ہیں کینوں کی کمانیں

(۳) گویا گلے میں حور کے ہیرے کا ہار تھا

(۴) دہشت تھی کہ وحشت کو ہرن بھول گئے تھے

(۵) تازی کو تیز کر کے یہ غازی نے دی صدا

پہلے مصرع میں تجنیس لاحق اور دوسرے میں تضمین المزدوج کہا گیا ہے لیکن مسعود صاحب نے تفصیل سے یہ بتایا کہ دونوں میں یہ صنعت نہیں ہے

اسی طرح صنعتِ التزام بالزوم کے تحت انھوں نے دو بند لکھے ہیں[۲۳] ؎

اعدا کے حق میں ہو گیا آبِ حسام سم — کرتے تھے آہوؤں کی طرح خوش خرام رم
نیزے تھے خوف سے صفتِ چوبِ خام خم — ایسا لڑا جہاں میں کوئی تشنہ کام کم
دشمن بھی معترف تھے وہ یکار کر گئے
مقتل سے اُڑ کے تا سرِ کہسار سر گئے

رکھتا نہیں کوئی یہ غریب الدیار یار — شمشیر شعلہ بار پڑے سر پہ بار بار
تیروں کی تن پہ دور سے ہوشیار مار — نیزے اٹھا اٹھا کے کریں سب سوار وار
آگے سے تیغ و خنجر و تیر و سناں چلے
پیچھے سے فرقِ پاک پہ گرزِ گراں چلے

اس میں صنعت لزوم کا حسن بھی ہے شبہ اشتقاق[۲۴] سام سم۔ رام رم۔ خام خم، کام کم کے ساتھ صنعت ذو قافیتین بھی۔ دوسرے بند میں ان دونوں صنعتوں کے ساتھ صنعت تکریر بھی ہے اور بے شمار صنعتیں دونوں بندوں میں ہیں۔

ایک ہی بند اگر کئی صنعت رکھتا ہو تو اس صنعت کا کیا نام ہوگا جس کے ذیل میں ساری صنعتیں آتی ہیں؛

ع: عین اس کا ہے وہ چشمہ کہ فیض اس کا ہوا عام
یہ علم کا آغاز ہے اور شرح کا انجام
ب، ا: بے سے برکت اور الف اول اسلام
س: ہے سینِ سعادت کہ اسی نام کا اتمام
عباس
یہ اسمِ مقدس تو سعید ازلی ہے
اعلیٰ نہ ہو کیونکہ کہ شریک اس کے علی ہے۔

تیلگو ادب میں ایکاکشری اس سے کچھ ملتی جلتی صنعت ہے لیکن اُردو میں اس صنعت کا کوئی نام ابھی تک راقم کو نہیں مل سکا۔ انیس کی خوش گوار تقلید کرتے ہوئے نسیم امروہوی نے اپنا معرکۃ الآرا مرثیہ سورہ مریم اسی تکنیک میں لکھا ہے۔ انیس کا کمالِ فن یہی ہے کہ وہ ایک ہی بند میں بیک وقت کئی صنعتیں استعمال کرتے ہیں اور یہ اتفاق نہیں بلکہ شعوری طور پر یہ محاسن ان کے یہاں جلوہ گر ہیں۔ ان کا نظریہ ہے ؏

سامعین جلد سمجھ لیں جسے صنعت ہو وہی

سامعین اسے جلد سمجھ لیتے تھے کہ نہیں کہ کون سی صنعت ہے لیکن سامعین کو یہ اندازہ یقیناً ہو جاتا رہا ہوگا کہ شعر میں یا بند میں کوئی حسن ضرور ہے جو قلب و ذہن کو متاثر کرتا ہے۔ انیس ان صنعتوں کے ساتھ تجنیس میں اپنا کوئی مقابل نہیں رکھتے تھے۔ شاید یہ مبالغہ نہ ہو کہ وہ کہیں کہیں مرزا دبیر سے بھی آگے نظر آتے ہیں۔ کچھ مثالیں ہیں جو پیش کی جا رہی ہیں:

تجنیس[۲۵] تام: خیبر میں کیا گزر گئی روح الامین پر
کاٹے ہیں کس کی تیغ دو پیکر نے تین پر

تجنیس تام اسے کہتے ہیں جس میں دو لفظ ہر لحاظ سے ایک ہوں لیکن معنی میں مختلف ہوں۔ یہ ہر لحاظ سے ایک ہے مگر معنی کے اعتبار سے مختلف ہے۔

تجنیس[۲۶] لاحق میں پہلا حرف تبدیل ہوتا ہے اور اگر پہلا حرف زائد ہو تو اسے تجنیس زائد کہتے ہیں مثلاً ؏

صاحب ہو تو ایسا ہو مصاحب ہو تو ایسا

صنعت تضمین[۲۷] المزدوج کی تعریف یہ ہے کہ رعایتِ قوافی کے بعد اثنائے کلام میں دو ایسے لفظ جمع کیے جائیں جو وزن اور روی میں موافق ہوں مثلاً ؎

ابرِ کرم، خدیوِ عجم، خسروِ عرب — عالی ہمم، امامِ اُمم، شاہِ تشنہ لب

اس میں ترصیع بھی ہے۔

انیس کے یہاں ایسی صنعتیں بھی ملتی ہیں جو بظاہر بہت مشکل ہیں، لیکن انیس انھیں اتنی بے تکلفی سے نظم کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے جیسے **صنعت مبادلۃ الراسین[۲۸]** یعنی دو لفظوں میں حرف اول یا اسم تبدیل ہو جیسے یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

اللہ اللہ عجب فوجِ عجب غازی تھے
عجب اسوار تھے بے مثل عجب تازی تھے

انیسؔ کے یہاں صنعتِ اطراد[29] کی لاجواب مثالیں ہیں یعنی جس شخص کی مدح کرنی ہو اس کے آبا و اجداد کا نام آجائے۔ انیسؔ کا ایک بند ملاحظہ ہو جس میں صنعت اطراد کی نشان دہی کی جارہی ہے ؎

عباسِؑ نامور بھی عجب سج کا ہے جواں
نازاں ہے جس کے دوش منوّر پہ خود نشاں
حمزہ کا رعب، صولتِ جعفرؑ، علیؑ کی شاں
ہاشم کا دل، حسینؑ کا بازو، حسنؑ کی جاں
کیونکر نہ عشق ہو شہِ گردوں جناب کو
حاصل ہیں سیکڑوں شرف اس آفتاب کو

صنعتِ ادماج[30]: یہ وہ صنعت ہے جس میں پورا مصرع دو معنی دیتا ہے۔ انیسؔ کے ان چار مصرعوں کے چوتھے مصرع میں صنعت ادماج ہے۔ حضرت حبیب ابن مظاہر جو بہت ضعیف تھے، ان کیلئے لکھتے ہیں ؎

بڑھتا تھا خون جوشِ شجاعت سے دم بدم — گردن میں وہ کجی تھی نہ مطلق کمر میں خم
ہر نوجواں سے تھا یہ اشارہ بصد حشم — یعنی جہاں سے جائینگے سیدھے جناں میں ہم

یہاں دو معنی ہیں ایک یہ کہ جنت میں بغیر کسی رکاوٹ کے جائیں گے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ جب جنت میں جائیں گے تو کمر خمیدہ نہ ہوگی بلکہ سیدھی ہوگی۔

صنعت تصلیف[31] جس طرح انیسؔ و دبیرؔ اور دیگر مرثیہ نگاروں کے یہاں ہے شاید ہی کسی کے یہاں ہو اس کا مطلب ہے شاعرانہ تعلّی۔ انیسؔ کہتے ہیں ؎

ہے لعل و گہر سے یہ دہن کانِ جواہر — ہنگامِ سخن کھلتی ہے دکّانِ جواہر
ہیں بند مرصع تو ورق خوانِ جواہر — دیکھے اسے ہاں ہے کوئی خواہانِ جواہر
مینائے رقومات ہنر چاہیے اس کو
سودا ہے جواہر کا، نظر چاہیے اس کو

انیسؔ کے فنی سمندر کی یہ کچھ لہریں ہیں جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جن میں بعض دل چسپ پہلو بھی ہیں۔ مثلاً ؎

پیش آجاتا تھا گر کوئی زبردست دلیر
دونوں تشدید شجاعت سے اسے کرتے تھے زیر

قواعد کا تلازمہ ہے زیر، زبر، پیش، تشدید۔ یہاں چاروں موجود ہیں۔

انیسؔ کہیں کہیں صنعت کو اس طرح استعمال کرتے ہیں اور اس کی طرف ایسا اشارہ کرتے ہیں کہ بالغ ذہنی انبساط حاصل ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

بھائی خوش فکر و خوش لہجہ و پاکیزہ خیال — جن کا سینہ گہرِ علم سے ہے مالامال
یہ فصاحت یہ بلاغت یہ سلاست یہ کمال — معجزہ گر نہ اسے کہیے تو ہے سحر حلال
اپنے موقع پہ جسے دیکھیے لاثانی ہے
لطف حضرت کا ہے یہ رحمتِ یزدانی ہے

اس کا دل چسپ پہلو یہ ہے کہ سحر حلال[32] ایک صنعت ہے اور اس بند میں یہ صنعت موجود ہے اس کی تعریف یہ ہے کہ ایک لفظ یا زیادہ لفظ جو بظاہر کلمات سابقہ کا تتمہ ہو اور کلمات آئندہ کے مقدمات میں شمار ہو سکے چنانچہ اس بند میں لفظ کمال تتمہ ہے اور آئندہ کا مقدمہ ہے۔

انیسؔ و دبیرؔ کے یہاں جتنی صنعتیں انسانی ذہن سوچ سکتا ہے وہ سب ہیں۔ انھوں نے جو روایت سازی کی وہ ان کے بعد کے شعرا اور دورِ حاضر کے شعرا کے یہاں ملتی ہے اس لیے بہت صنعتوں کا تذکرہ جو دوسروں کے یہاں کیا گیا ہے وہ سب انیسؔ کے یہاں ہیں لیکن دو صنعتوں کا ذکر انیسؔ کے یہاں ضروری ہے ان میں سے ایک صنعت مکالمہ ہے۔ علم بدیع کے ماہرین نے صنعت سوال و جواب تو لکھی لیکن عام طور سے یہ صنعت صرف ایک شعر میں پائی جاتی ہے۔ انیسؔ کے مشہور مرثیہ "بخدا فارسِ میدانِ تہوّر تھا حُر" میں عمر بن سعد اور حضرت حُر کا مکالمہ ہے۔ یہ صنعت کسی ایک بند یا شعر تک محدود نہیں ہے بلکہ ردالعجز علی الصدر کی طرح کئی بندوں پر محیط ہے۔ یہ صنعت مرثیہ نگاروں کے یہاں عموماً ہے لیکن جو حُسن انیسؔ نے پیدا کیا ہے وہ صرف حضرت امام کا لطف اور رحمتِ یزدانی ہونے کی وجہ سے لاثانی ہے۔ یہ صنعت بند نمبر اکتیس[33] سے شروع ہوتی ہے اور چھتیس[34] تک اس کا سلسلہ چلتا ہے۔ ان بندوں میں صنعت ابداع[35] تو ہے ہی یعنی لفظ سے خوب معنی نکالے۔ ان میں صنعت تدارک یعنی کسی کی اس طرح برائی کرے کہ تعریف معلوم ہو صنعتِ احتجاج بدلیل (یہ مذہب کلامی کی ایک قسم ہے) اور تاکید المدح وغیرہ بھی ہے)

انیس کے دادا میر حسن نے ایک مصرع کہا تھا:

دوں دوں خوشی کی خبر کیوں نہ دوں

اس میں نقارے کی آواز یعنی "دوں دوں" نظم کر دیا تھا۔ غالباً اسی ایک مصرع کی طرف ذہن گیا اور اس صنعت کا کوئی نام نہیں رکھا گیا۔ زبانِ انگریزی میں کہا جاتا ہے onomotopoeia میں یہ ہوتا ہے کہ گونجتی ہوئی چیخ کے لئے Shrill کہہ دیں گے یا پہیے کی کھڑکھڑاہٹ کو Rattling کہہ دیں گے وغیرہ۔ اُردو میں میر انیس نے اس صنعت میں کمال دکھایا ہے اور بہت بڑی بات یہ ہے کہ علم بدیع کے اس رُخ کو علم بیان میں لے آئے اور اس صنعت سے انھوں نے صوتی آہنگ ہی کو پیش نہیں کیا بلکہ فضا آفرینی کی ہے۔ موضوع سے مناسبت رکھنے والے حروف منتخب کر کے پورا منظر نامہ تیار کیا ہے ایک شعر اور ایک بند ملاحظہ ہو ؎

گرما کے سب رگوں میں لہو دوڑنے لگا فرفر فرس کے نتھنوں سے آنے لگی صدا

اور یہ بند

لشکر کے سب جواں تھے لڑائی میں جی لڑائے
وہ بد نظر تھا آنکھوں میں آنکھیں ادھر گڑائے
ڈھالیں لڑیں سیاہ کی یا ابر گڑگڑائے
غصے میں آکے گھوڑے نے بھی دانت کڑکڑائے
ماری جو ٹاپ ڈر کے ہٹے ہر لعین کے پاؤں
ماہی پہ ڈگمگا گئے گاوِ زمیں کے پاؤں

تلمیح تجنیس، مراعات النظیر کے ساتھ جس پہلو کی طرف متوجہ کرتا ہے وہ فضا آفرینی کے لئے کراہت، ڈر، تناؤ پیدا کرنے والے ایسے الفاظ کا انتخاب ہے جن میں کریہہ الصوت حروف بہت آئے ہیں جیسے ڈ، ٹ، ڑ وغیرہ اور گھوڑے کا دانت کڑکڑانا یا تیز روی میں "فرفرانا" میر حسن سے کہیں آگے میر انیس کو لے جاتا ہے۔[۱۴]

انیس کے یہاں ایک صنعت اور ہے صنعتِ ملمع یا تلمیع[۱۵] اس کی تعریف یہ ہے کہ کلام میں دوسری زبان کا ایک رکن لے آنا۔ اس کی مثال عام طور سے انیس کے یہاں سے پیش کی جاتی ہے ؎

پکارا بِاَبِیْ اَنْتَ وَ اُمِّیْ یا شاہ قابلِ عفو نہ تھے بندۂ آثم کے گناہ

کہتے ہیں کہ انگریزی کے ایک بہت بڑے شاعر کی سب سے مشہور نظم میں یہ صناعی درجۂ کمال پر پہونچی ہوئی ہے۔ حالاں کہ تو ل میں بند زندگی اور موسموں کا تذکرہ برباد شدہ دنیا کا بیان لیکن "بے معرف زمین" والی یہ نظم اس لیے بہت اہم سمجھی جاتی ہے کہ اسے سمجھنے کے لئے صنعت تلمیع کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ اس لیے کہ اس میں اطالوی، جرمن، فرانسیسی سے آگہی ضروری ہے۔ نظم شانتی شانتی پر ختم ہوتی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جیمس جوائس کی نثری تخلیق میں کہ نام جس کا یولیسس ہے یہ صنعت پائی جاتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

انیس و دبیر کی روایات کی پاسداری تمام مرثیہ نگاروں نے کی اور ان محاسن کو برقرار رکھا جن کو انیس و دبیر نے منزلِ کمال تک پہنچا دیا تھا عشق، تعشق، پیارے صاحب رشید وغیرہ کے یہاں صناعی ملتی ہے۔ پروفیسر جعفر رضا نے تفصیل سے بتایا کہ دبستانِ عشق، علم بیان کا شیدائی تھا۔ تشبیہ کی لطافت، استعارے کی نزاکت، فضا کی تخلیق ــــ لیکن اس دبستان میں بھی علم بدیع کی مروجہ صنعتوں کے علاوہ صناعی ملتی ہے۔

عروج اے مرے پروردگار دے مجھ کو (عشق)
سچ ہے دُنیا میں شبِ ہجر بلا ہوتی ہے

ــــ کھینچ اے قلم مرقعِ صحرائے کربلا ــــ تعشق کے مرثیے اس سلسلے میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ کبھی کبھی تلاش کرنا پڑتا ہے۔ بہر حال نفیس کے یہاں تجنیس خطی[۱۶] کی ایک مثال ؎

علی کا دبدبہ و رعب جرأت و شہرت حسن کا حُسن حسین حسیں کی سب شوکت

اس میں دو لفظ بغیر رعایتِ نکات و حرکاتِ مشابہ واقع ہوئے ہیں جیسے حُسن، حسن، حسین، حسیں۔

ناسخ و آتش کے شاگردوں نے صناعی کی روایت کو برقرار رکھا۔ ان کے یہاں حسن تعلیل، مراعاۃ النظیر، ایہام تناسب اور رعایتِ لفظی کی کثرت ہے لیکن دیا شنکر نسیم نے انیس و دبیر کے معاصر کی حیثیت سے ان بزرگوں کے ساتھ صناعی کے کمال میں اپنے کو اس منزل تک پہنچایا کہ ان کا نام انیس و دبیر کے ساتھ لیا جانے لگا۔ کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

صنعت مشاکلہ: میں جا کے جلی تو غم نہیں ہائے

ڈر ہے نہ تجھ پہ آنچ آ جائے

اس صنعت میں دو لفظوں کو اس طرح لاتے ہیں کہ اصل سے بھی انھیں نسبت ہو اور اپنی جگہ الگ معنی بھی رکھتے ہوں۔

صنعت توجیہ یا محتمل الضدین

جس کف میں وہ گل ہو داغ ہو جائے　　جس گھر میں ہو وہ گل چراغ ہو جائے

یہ دراصل قرأت کی صنعت ہے، جس طرح پڑھیے نئے معنی حاصل ہوں گے۔

تجنیس محرّف: مشکیں زلفوں سے مشکیں کسواؤ

کالے ناگوں سے مجھ کو ڈسواؤ

مشکیں اور مشکیں میں تجنیس محرف ہے۔

صنعت سوال و جواب:

پوچھا کہ سبب کہا کہ قسمت　　پوچھا کہ طلب کہا قناعت

یہاں بے اختیار یہ عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ منیر شکوہ آبادی کا مشہور قصیدہ " اشکِ زلیخا ہوئے بحر صفت جوش زن" کنایہ کی بہترین مثال ہے لیکن نسیم نے جو خط بکاؤلی کی طرف سے تاج الملوک کو لکھا ہے وہ بے حد بلیغ کنایہ کی دولت لیے ہوئے۔ منیر شکوہ آبادی کے یہاں بھی صناعی اپنے شباب پر نظر آتی ہے۔ ایک صنعت ہے کلام جامع۔ اس کی مختصر تعریف یہ ہے کہ اس میں شکایت زمانہ ہوئی ہے۔ اس صنعت کے سلسلے میں انیس کا بند " ناقدری عالم کی شکایت نہیں مولا" بہت معروف ہے۔ اس کے علاوہ صنعت تکریر کی مشہور مثال زہر عشق سے دی جاتی ہے

عشق سے کون ہے بشر خالی　　کر دیے جس نے گھر کے گھر خالی

لیکن عزیزی رحمت علی خاں کے مطابق تکریر متانف یا مجدد میں جن الفاظ کی تکرار ہوتی ہے ان کے درمیان وقفہ ہوتا ہے۔ منیر کے یہاں سے انھوں نے مثال دی ہے

سر بگریبان فکر، فکر کی دل میں جگہ

خامہ میان دوات، شمع میان لگن

اودھ کے شعرا میں مرزا شوق کا نام بہت مشہور ہے۔ ذرا غور کیجیے: زہر عشق کا پہلا مصرع

لکھ قلم پہلے حمد ربِّ ودود

اس میں صنعت براعت الاستہلال بھی ہے اور صنعت حذف قطع الالف بھی ہے، یعنی مصرع میں الف نہیں ہے۔ ایک شعر اسی صنعت میں ملاحظہ ہو

پیش یوں فرقت حبیب نہ ہو

کسی دشمن کو بھی نصیب نہ ہو

اودھ کے شعرا کی ایک طویل فہرست ہے جن میں محسن کاکوروی، صفی، ثاقب، عزیز وغیرہ کے نام بہت اہم ہیں۔ صرف اشعار درج کیے جا رہے ہیں اور صنعت کا نام درج کر دیا ہے، اہل نظر کے لیے سمجھنے کو کافی ہے

کالے کوسوں نظر آتی ہیں گھٹائیں کالی

ہند کیا ساری خدائی میں بتوں کا ہے عمل　　—— محسن کاکوروی

صنعت تکریر متانف: ایک سر فکر معیشت وہ کرے یا فکر شعر

کام ہے فکر سخن ہر فکر سے آزاد کا　(صفی)

اشتقاق: آتش عشق نے عشاق کو اُف پھونک دیا

تھا ادھر حسن ادھر مہر مبیں کی حدت　(عزیز)

صنعت ایراد المثل: باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے

جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے　(ثاقب)

(دوسرا مصرع ضرب المثل ہے اور یہی نظم کرنا مذکورہ صنعت ہے)

عہد حاضر کا تذکرہ کرتے ہی ایسا معلوم ہونے لگتا ہے جیسے شاعری کا رشتہ الفاظ سے توڑ دیا گیا اور یہ سمجھ لیا گیا کہ شعرا نے ان محاسن شعری کی طرف سے آنکھیں موڑ لی ہیں لیکن قصور شعرا کا نہ تھا قاری کا تھا۔ ان محاسن کی فہم کے لیے جس علم کی ضرورت تھی وہ تیز رفتار زندگی میں ممکن نہ رہ گیا تھا۔ حالاں کہ اقبال جیسے شاعر کے یہاں شاید ہی کوئی ایسی نظم ہو جو صناعی کا شاہکار نہ ہو۔ "مسجد قرطبہ" اور "ذوق و شوق" میں تلمیع، تلمیح، اشتقاق، ابداع، طباق جمع وغیرہ ہر قدم پر ملیں گے۔ بہر حال ضمناً اقبال کا تذکرہ آ گیا ہے۔

اودھ میں جوش ملیح آبادی سے دور حاضر کا آغاز ہوتا ہے صنعت جمع میں تو جہاں سے جی چاہے ان کی کوئی نظم اٹھا لیجیے۔ یہی حال

تنسیق الصفات کا ہے، پھر بھی ایک بند نقل کیا جاتا ہے جس میں دونوں صنعتیں موجود ہیں ؎

آبِ مکاں، امامِ زماں، آیۂ مبیں کنزِ علوم، کاشفِ سرِ کعبۂ یقیں
قاضیِ دہر، قبلۂ دوراں، قوامِ دیں منشائے عصر، معنیِ کن، میرِ عالمیں
تابندگیِ طرۂ طرفِ کلاہِ علم
مولائے جاں، رسولِ تمدن، الٰہ علم

اس میں بہت ساری صنعتیں یکجا ہو گئی ہیں۔ مثلاً پہلے دو مصرعوں میں لف و نشر بھی ہے اور تیسرے و چوتھے مصرعوں میں مراعاۃ النظیر تو ہے ہی مبالغہ مقبول بھی ہے۔ پہلے مصرعہ کے دو رکن صنعت ترصیع میں ہیں۔ جوش کے یہاں صنعتوں کی تلاش کی ضرورت نہیں "جنگل کی شہزادی" ہو یا "حسین اور انقلاب" ہر جگہ صناعی بولتا ہوا پیکر اختیار کر لیتی ہے صنعت توسیم کی مثال ملاحظہ ہو۔ اس صنعت میں قافیہ کی ایسے حروف پر بنیاد رکھتے ہیں کہ دوسرے مصرعہ میں ممدوح کا نام آ جائے۔ مثلاً جوش کہتے ہیں ؎

جس کی رگوں میں آتشِ بدر و حنین ہے جس سورما کا اسمِ گرامی حسینؑ ہے

حسرت موہانی کلاسیکی مزاج کے غزل گو تھے اس لئے کہ ان کے مشہور شعر ؎

جنوں کا نام خرد پڑ گیا خرد کا جنوں
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

میں صنعت عکس ہے اور یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ اس دور کے جتنے ممتاز شعراء ہیں، جن میں حسرت اور ان کے بزرگ معاصرین اور کم عمر شعراء ہیں، ان سب کے یہاں صنعتوں کا التزام ہے چاہے وہ اصغر گونڈوی ہوں یا ریاض خیرآبادی یا مضطر خیرآبادی یا آرزو لکھنوی لیکن جوش کو اور تعجب ہوتا ہے جب مجاز اور علی سردار جعفری کے یہاں صنعتیں ملتی ہیں۔ مجاز کہتے ہیں ؎

سب کا تو مداوا کر ڈالا اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے

اس میں رد الابتدا علی الصدر[۴۳] و صنعت تکریر کی نشاندہی عزیزی رحمت علی خاں نے کی ہے۔ مجاز کا ایک شعر اور ملاحظہ ہو ؎

اے دل کی لگی چل یونہی سہی چلتا تو ہوں ان کی محفل میں
اس وقت مجھے چونکا دینا جب رنگ پہ محفل آ جائے

اب چل اور چلتا میں تجنیس[۴۴] ذیل لطف دے رہی ہے۔ اس کی تعریف یہی لکھی ہوئی ہے کہ ایک لفظ کے آخر میں دو حرف کی زیادتی ہو۔ اس کے علاوہ اور بھی صنعتیں ہیں۔ علی سردار جعفری[۴۵] کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

خواب اب حسنِ تصور کے افق سے ہیں پرے
دل کے اک جذبۂ معصوم نے دیکھے تھے جو خواب

یہ صنعت محاذ بھی کہلاتی ہے اور اکثر نے اسے صنعتِ معاد بھی کہا ہے مگر صحیح نام رد العجز علی الابتدا ہے۔ ان کا ایک بند اور ملاحظہ ہو ؎

صبح سے لے کے تا بہ شام، مست خرام تیز گام
کرتی نہیں کہیں قیام، کرتی نہیں کہیں مقام
جذبۂ شوق ہے تمام منزلِ شوق نا تمام
دامنِ شش جہات میں سیلِ رواں ہے زندگی

اس میں صنعت ذوقافیتیں، قیام اور مقام میں تجنیس، تیسرے مصرع میں تضاد وغیرہ ہے۔

حضرت خمار بارہ بنکوی کی تمام مقبول عام غزلیں صناعی کا حسن رکھتی ہیں۔

اسی طرح ڈاکٹر وحید اختر[۴۶] محسن زیدی[۴۷] کے یہاں بھی صنعتوں کا برمحل اور متناسب التزام ہے۔ وحید اختر کے ایک مرثیہ کے چہرے میں قلم کا قصیدہ ہے۔ اس میں تصلیف سے لے کر تجنیس کے بیشتر اقسام، کلام جامع، صنعت جمع اور مراعاۃ النظیر وغیرہ ہیں۔ ان کے مرثیے "مریم سے بھی سوا ہے فضیلت بتول کی" سے ایک بند پیش کیا جاتا ہے جس میں تجنیس تجاہل عارف سے لے کر صنعت منقطع و رود۔ دُرود میں ہے ؎

بولی جو ہو سو ہو یہ ہے کس حسن کی نمو نیزے پہ سر نہیں یہ ہے صبح کا ورود
ایسا جوان دیکھے کب چشمِ ہست و بود دیکھوں ادھر تو پڑھتی ہے ہر ہر نظر درود
دل کہہ رہا ہے پھول یہ باغِ علیؑ کا ہے
میرے دہن میں خاک یہ چہرہ نبیؐ کا ہے

مجروح سلطان پوری ہمارے عہد کے آتش ہیں۔ ان کی غزل

آ کل کے میداں میں دو رخی کے خانے سے

پڑھئے تو اپنے لہجے کے اعتبار سے یہ آتش کی غزل ؎

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا

کی یاد دلاتی ہے۔ مجروح بھی اسی بانکپن کے ساتھ اپنی کلاہ کج رکھتے ہیں جو آتش کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہاں ان کی شاعری پر تبصرہ کرنا مقصود نہیں ہے۔ صرف یہ عرض کرنا ہے کہ آتش نے جب کہا تھا ؏

شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

تو انھوں نے اپنی شعری روایت کا سلسلہ مستقبل تک پھیلا دیا تھا۔ یہی شعری روایت اور مرصع سازی غزل گو شعراء، بالخصوص اودھ کی ادبی اور شعری روایت کے ورثہ دار اور نمائندہ شاعر مجروح سلطان پوری کے یہاں ملتی ہے۔ ان کے دو بہت مشہور شعر ملاحظہ ہوں ؎

رفتہ رفتہ منقلب ہوتی گئی رسمِ چمن

دھیرے دھیرے نغمۂ دل بھی فغاں بنتا گیا

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر

لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

پہلے شعر میں رفتہ رفتہ اور دھیرے دھیرے نے تکریر پیدا کی۔ نغمہ اور فغاں میں تضاد ہے۔ دوسرے شعر میں جمع ہے، مراعاۃ النظیر ہے اور اب ایراد المثل ہے کہ پورا شعر ضرب المثل بن گیا ہے۔ جب کوئی ضرب المثل نظم کی جاتی ہے تو اسے ایراد المثل کہتے ہیں۔ مجروح کے اس شعر میں صناعی کی یہ کرامت ہے کہ اب یہ شعر ضرب المثل بن گیا ہے۔ ان کے یہاں تلاش کرنے پر بھی کوئی ایسا شعر نہ مل سکا جو آتش کی مرصع سازی کے معیار پر پورا نہ اترتا ہو۔ مثال کے طور پر ان کے دو معروف شعر ؎

دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن جوشِ بہار

رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

شبِ ظلم نرغۂ راہزن سے پکارتا ہے کوئی مجھے

میں فرازِ دار سے دیکھ لوں کہیں کاروانِ سحر نہ ہو

پہلے شعر میں مراعاۃ النظیر، صنعت طباق ہے۔ دوسرے شعر میں ان صنعتوں کے علاوہ صنعت تجاہل عارفانہ بھی آئی ہے۔ لفظ "کہیں" نگینے کی طرح جڑا ہوا ہے اور یہ صنعت شعر کے پیکر میں بول رہی ہے۔

یہ وہ وراثت ہے جو ناسخ اور مصحفی کے زمانے سے ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتی آئی ہے اور یہ وراثت زندہ و تابندہ ہے۔ یہ سچ ہے کہ اب انیس و دبیر نہیں ہیں اور علم بدیع سے زیادہ علم بیان کی طرف توجہ دی جا رہی ہے۔ استعارہ کا ستارہ چمک رہا ہے۔ تشبیہ و کنایہ و مجاز اور پھر دوسری صنعتیں ٹمٹماتی نظر آتی ہیں۔ لیکن آج بھی اعلیٰ علمی سطح رکھنے والے ادبی اذہان، کلاسیکی ادب سے شناسائی تربیت یافتہ ذوق، ادبی معیار رکھنے والے اور محاسنِ شعری تلاش کرنے والوں کو یہ صنعتیں ذہنی حظ و انبساط مہیا کرتی ہیں[۵۵]۔ مشاعروں میں بھی عوام یہ تو نہیں جانتے کہ جس شعر پر وہ داد و تحسین کے پھول نچھاور کر رہے ہیں ان میں کون سے محاسن شعری ہیں لیکن غور کیجئے تو یہ احساس ہوگا کہ عوامی ذہن بھی انھیں اشعار سے زیادہ متاثر ہوتا ہے جن میں رعایت لفظی، مراعاۃ النظیر اور حُسنِ تعلیل کا سحرِ حلال ہوتا ہے۔

اودھ نے نظم کے ساتھ نثر میں بھی ادبی صناعی کے اعلیٰ ترین نمونے پیش کیے ہیں۔ اس سلسلے میں جاہ و قمر کی طلسم ہوش رُبا، آغا جو ہندی کی چھوٹے آغا کی تصحیح کی ہوئی 'بوستانِ خیال' وغیرہ میں سجع، ترصیع، مراعاۃ النظیر اور تجنیس کی مختلف اقسام ملتی ہیں، اور یہ ساری صنعتیں آغا حسن 'امانت' کے ضلع اور جگت اور فقرے بازی سے بالکل مختلف ہیں۔ ان میں سرورِ سخن بھی ادبی صناعی کا اچھوتا نمونہ ہے لیکن بلا شبہ سرور کی فسانۂ عجائب میں یہ تمام صنعتیں معراجِ کمال پر نظر آتی ہیں۔

سرور نے گلزارِ نسیم اور سحر البیان کی طرح ہر قصے کے جھرے میں براعت الاستہلال سے کام لیا ہے یعنی ابتدا میں کسی لفظ سے بعد میں رونما ہونے والے واقعات کی طرف اشارہ ہے۔ رعایتِ لفظی، مراعاۃ النظیر، ایہام التناسب اور صنعتِ تصحیف کے ایسے الفاظ لائیں کہ حرکات کو بدل دیں تو مدح ہجو بن جائے یا صنعت تزلزل کہ اس میں بھی ذرا سی تبدیلی سے مدح ہجو میں بدل جاتی ہے یا صنعت الہزل الذی کہ بظاہر تمسخرانہ و ہزلیانہ ہو مگر مُراد اس سے ہزل نہ ہو ــــ یہ ساری صنعتیں سرور کے یہاں ملتی ہیں۔ ایک بہت مختصر سا ٹکڑا دیکھئے:

"اور تو اور شہدا پیر بخارا کا، شماسا، سید الشہدا،
کا شیدا"[52]

شُہَدا، شُہَدا، شَیدا میں صنعت تجنیس نے بیان کا جو حُسن پیدا کیا ہے اس کے حسن کو سمجھنے کے لئے تربیت یافتہ ذہن کی ضرورت ہے۔ سرور کے یہاں ایک صنعت ہے جس کو کوئی نام نہیں دیا جا سکا، صرف ایک فقرے پر غور کیجیے:

"اصل تو یہ ہے کہ عسل مصفیٰ جنت کی نہر کا حلق سے اُترا"[53]

اس میں اصل اور عسل میں تجنیس نہیں ہے، یہاں وہ صوتی آہنگ ہے جو انگریزی ادب میں پایا جاتا ہے۔

صرف داستانوں ہی میں نہیں، اودھ کی بیشتر نمائندہ تخلیقات میں بھی صناعی ملے گی، چاہے وہ فسانہ آزاد ہو یا سرشار کے ناول۔ ظاہر ہے طویل اقتباسات کی گنجائش نہیں۔ "امراؤ جان ادا" سے کچھ فقرے ملاحظہ ہوں:

رسوا: "امراؤ جان! سنا کیا شعر کہا ہے۔"
امراؤ جان: "سبحان اللہ۔ میں پہلے ہی سمجھ گئی جو چاہیں کہیں، مالک ہیں۔"

اس میں ہجو ملیح اور تاکید الذم بما یشبہ المدح ہے۔ اس لیے کہ 'مالک' داروغہ جہنم کو بھی کہتے ہیں۔ "امراؤ جان ادا" میں صناعی کا باقاعدہ التزام ہے۔ چھوٹے چھوٹے فقرے صنعتوں سے بھرپور ہیں۔ زیادہ مثالوں کی گنجائش نہیں صرف ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو:

"اوّل تو پہلے ہی طبیعت بہت رسا تھی دوسرے لائق احباب کی وساطت سے اونچے اونچے کمروں پر رسائی ہو گئی۔ رسائی کیسی بے تکلفی بڑھ گئی۔!"

یہاں تجنیس، اشتقاق اور "رسائی کیسی" سے صنعت رجوع سامنے آتی ہے۔

اودھ میں ادبی صناعی[54] کی اس داستان معجز بیان کو سمجھنے کے لئے تربیت یافتہ ذوق، کڑھی ہوئی شخصیت، شگفتہ ذہن اور علمی مزاج ضروری ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اہل علم اور شرفا کی صحبتوں میں ان سے موانست اور مجالست رہی ہو۔ اور اگر یہ نہیں تو پھر بقول انیس ؎

ان صنعتوں کو پائے کہاں عقل سادہ کار!

□□

حواشی و تعلیقات

1. نجم الغنی: بحر الفصاحت ص ۹۲۔ 2. رشید حسن خاں: مقدمہ فسانہ عجائب ص ۶۵
3. لفظوں کی چٹانوں سے اُبلتے ہیں معانی
اک بات کے سو رُخ سے نکلتے ہیں معانی (وحید اختر)
4. پوشش چھینٹ قلمکار بہر دشت و جبل۔ سودا
5. قدیر شاگرد مرزا دبیر
6. بحوالہ اردو شاعری میں صنائع و بدائع: عزیزی ڈاکٹر رحمت علی خاں یوسف زئی۔ ریڈر سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد ص ۲
7. ایضاً ص ۹۴
8. نجی خط۔ عزیزی ڈاکٹر محبوب عالم انصاری ریڈر بی این ڈگری کالج، ٹانڈہ
9. فکر و ریاض: علی جواد زیدی ص ۱۱۸
10. یہاں ایک بحث یہ پیدا ہو سکتی ہے کہ اودھ میں ادبی صناعی کا نقطہ آغاز کسے اور کیوں قرار دیا جائے؟ انشا سے ہی اس کا آغاز کیوں؟ وہ سارے دلائل ایک بسیط مضمون کا مطالبہ کرتے ہیں۔ عابد پشاوری کا مضمون "انشا کا وطن" (نیا دور فروری، مارچ ۱۹۹۴ء) اس سلسلے میں فیصلے تک پہنچنے میں ممد و معاون ہوا۔
11. اشعار اور صنعتوں کے انتخاب میں ذاتی وجدان ہی کو دخل رہا ہے، بے شمار اشعار اور بھی ہو سکتے ہیں۔ جتنی صنعتوں کی نشاندہی کی گئی ہے اتنی ہی صنعتیں باقی رہ گئی ہیں۔
12. مہذب اللغات ص ۳۳ 13. حیات دبیر: افضل حسین ثابت ص ۱۴۴
14. یہاں اس کی وضاحت ضروری ہے کہ جتنی صنعتیں مرزا صاحب کے یہاں ہیں وہ سب انیس کے یہاں بھی ہیں، راقم الحروف نے اسی لیے اس کا لحاظ رکھا ہے کہ دونوں کے یہاں الگ الگ صنعتوں کی نشاندہی کی جائے البتہ کہیں کہیں شعر کے حسن نے مجبور کر دیا ہے۔
15. حیات دبیر: افضل حسین ثابت ص ۱۴۴، 16. ایضاً ص ۱۴۴
17. ایضاً ص ۱۱۱ 18. انیسیات ص ۱۲۷

۱۹؎ حیات دبیر ص۱۸۶ ، ۲۰؎ ایضاً ص۱۶۴ ۲۱؎ مہذب اللغات ص۳۳۹

۲۲؎ المیزان : چودھری سید نظیر الحسن فوق بگرامی ص۵۹

۲۳؎ انیسیات ص۱۳۴

۲۴؎ کلام میں ایسے لفظ لانا کہ بادی النظر میں یہ محسوس ہو کہ ایک لفظ سے مشتق ہے مگر ایسا نہ ہو۔ شبہ اشتقاق سے کلام میں صوتی آہنگ کا حسن پیدا ہوتا ہے۔

۲۵؎ مہذب اللغات ص۳۲۵ ۲۶؎ ایضاً ص۳۲۶ ، ۲۷؎ ایضاً ص۳۳۱

۲۸؎ ایضاً ص۳۳۱ ، ۲۹؎ ایضاً ص۳۳۸ ، ۳۰؎ ایضاً ص۳۴۶

۳۱؎ ، ۳۲؎ ، ۳۳؎ مہذب اللغات ص۳۴۶

۳۴؎ اور یہی کمال فن ہے کہ بدیع کو بیان میں لے آئے۔ صوتی آہنگ سے فضا آفرینی اور شعری منظر نامے کا حسن چمک اٹھا ہے۔

۳۵؎ انیسیات ص۱۲۹ ، ۳۶؎ مہذب اللغات ص۳۲۵ ،

۳۷؎ مہذب اللغات ص۳۴۲ ، ۳۸؎ ایضاً ص۳۳۹ ، ۳۹؎ ایضاً ص۳۴۷

۴۰؎ ایضاً ص۳۳۸ ، ۴۱؎ غیر مطبوعہ مقالہ "اردو شاعری میں صنائع بدائع" از ڈاکٹر رحمت علی خاں۔

۴۲؎ عنوان کی پابندی کے خیال سے صرف اودھ کے شعراء تک تذکرہ محدود رکھا گیا ہے ورنہ اقبال، فیض، مخدوم، ناصر کاظمی، احمد فراز، قتیل شفائی، اختر شیرانی، وامق جونپوری، علی جواد زیدی، کیفی اعظمی ان سب کے یہاں وافر صنعتیں ہیں۔

۴۳؎ اردو شاعری میں صنائع بدائع۔ رحمت یوسف ص۴۸

۴۴؎ مہذب اللغات ص۳۲۶

۴۵؎ علی سردار جعفری بلرامپور گونڈہ کے رہنے والے ہیں۔

۴۶؎ وحید اختر کا اصل وطن نصیر آباد (رائے بریلی) ہے۔

۴۷؎ محسن زیدی کا اصل وطن بہرائچ ہے۔

۴۸؎ مجروح کی غزلوں کے بارے میں یہ کہا گیا ہے 'فلمی گانوں کے بارے میں نہیں'۔

۴۹؎ مسعود صاحب نے 'انیسیات' میں اسے تجاہل عارفانہ لکھا ہے۔ لیکن مہذب صاحب نے تجاہل عارف لکھا اور یہی مرجح ہے

۵۰؎ مزاحیہ شعراء مثلاً ظریف لکھنوی۔ ناجیس لکھنوی، شوق بہرائچی ساغر خیامی کے کلام میں متداول صنعتوں کے علاوہ تزلزل الہزل الذی اور تصحیف بکثرت ملتی ہیں۔ یہاں صناعی کلام میں بے انتہا شگفتگی و گدگدی پیدا کرتی ہے۔ طوالت کے خیال سے مثالوں سے گریز کیا گیا۔

۵۱؎ مہذب اللغات ص۳۳۹

۵۲؎ رشید حسن خاں : مقدمہ فسانۂ عجائب ص۳۵

۵۳؎ فسانۂ عجائب ص۲

۵۴؎ یہ صناعی ماضی کا مزار نہیں دور حاضر کی بھی زندہ حقیقت ہے۔ پارلیمنٹ ہو یا اسمبلی یا عوامی رہنماؤں کی تقریریں، اگر صناعی ہے تو پھر یادگار حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ تقریر کا ایک فقرہ ملاحظہ ہو :
"نیتا کی نیتی ہی نہیں، نیت بھی اچھی ہو"
ایک بیان پڑھئے : "کل تک وہ ہمارا ہاتھ تھے آج سفید ہاتھی ہیں"۔
"نوجوان تمہارا ہتھیار نہیں، ہاتھ ہیں" اور صرف سیاست داں نہیں، ہر شعبۂ حیات کا انسان اگر لفظ کے استعمال کا ہنر جانتا ہے تو وہ صناعی برتتا ہے۔

"سر پر تو بال وبال جان، بسانِ سنبل پریشان پریشان ہیں اور اس گل کا گریبان مانندِ گل تا بداماں چاک ہے اور تیری نرگسِ چشم کے خیال میں وہ روز و شب آنکھوں سے آبجو جاری رکھتا ہے اور تیری مژگان رشک سنان کے تصور میں شام و سحر خارِ ہجراں اس کے دل میں کھٹکتا ہے، اور تیرے لعل لبِ خنداں کے دھیان میں غنچے کی طرح آٹھ پہر گردن جھکائے چپ بیٹھا رہتا ہے اور کبھی تیرے دست حنائی، رشک پنجۂ مرجان کی یاد میں برنگ اور رنگ قطرۂ خون دیدۂ خوں بار ہر دم ٹپکاتا ہے ..... اور تیرے فراق پر اشتیاق میں روز و شب بحال پر تعب مانند بلبل دور از چمن نعرہ زن ہے اور رنگ رخسار جو اس گل عذار کا مثل گل۔ سرخ تھا سو کاہش غم سے مثل صد برگ زرد ہو گیا۔"

—— مہجور

[شیخ محمد بخش مہجور کی داستان "نورتن" (۱۸۱۴ء) کا ایک اقتباس۔]

شامِ اودھ

لکھنؤ اے لکھنؤ صورت گرِ شامِ اودھ
مالکِ ملکِ سخن ساقی گرِ جامِ اودھ

لکھنؤ کے پھول ہوں پھل ہوں کہ صوت و رقص ہوں
لاکھوں میں لگتے ہیں یکتا نازک اندامِ اودھ

صبحِ صادق کی اذانیں، شام کے ناقوسِ دیر
قومی یک جہتی پہ قائم ہیں درو بامِ اودھ

یاد کرتا رہتا ہے حضرت محل کا سبزہ زار
جنگِ آزادی کے خوں آشام ایّامِ اودھ

شامِ حضرت گنج ہو یا صبحِ قیصر باغ ہو
کیسے کیسے پیچ ڈالا کرتا ہے دامِ اودھ

صبحِ فیض آباد کا اک نام ہے شہرِ گلاب
لکھنؤ میں گومتی پہ ختم ہے شامِ اودھ

اک دہکتا آگ کا گولا لبِ گیتار گھاٹ
سرجو سے تا گومتی بن جائے ہے شامِ اودھ

"بیلی گارد" لکھنؤ کے دل کا اک ناسور ہے
ہو گئی تھی جس کے آگے کند صمصامِ اودھ

کہنے کو ہر چند ہے وہ "حافظِ شیرازِ ہند"
ہے مگر وامق پرانا بادہ آشامِ اودھ

وامق جونپوری
'لال کوٹھی'
پوسٹ کجگاؤں
جون پور - ۲۲۲۱۳۸

عبدالقوی دسنوی
۰، پرنس کالونی، نعمت پورا،
عید گاہ ہلس، بھوپال - ۱

اودھ پنچ اور اس کی طنزیہ مزاحیہ شاعری

۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے ٹھیک بیس سال بعد جنوری ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ کی سرزمین سے ایک طنز و مزاح سے بھرپور اخبار "اودھ پنچ" جاری ہوا۔ اس اخبار کو اردو طنز و مزاح کے تیسرے دور میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے مدیر منشی سجاد حسین اپنی شگفتہ مزاجی اور طنزیہ و مزاحیہ تحریر کے لیے مشہور رہے

"اودھ پنچ" سے قبل سب سے پہلے ۱۸۵۵ء میں رام پور سے اس رنگ کا اخبار "مذاق" کے نام سے حکیم احمد رضا لکھنوی نے جاری کیا تھا، پھر ۱۸۵۹ء میں "مدراس پنچ" کے نام سے اردو کا دوسرا مزاحیہ اخبار نکلا تھا جس کے مالک شاہ محمد صادق حسینی شریف تھے۔ یہ اردو کا پہلا پنچ اخبار تھا۔ ۱۸۷۶ء میں بمبئی سے "فرحت الاخبار" "روہیلکھنڈ پنچ" مراد آباد اور پٹنہ سے "اپنچ" جاری ہوگئے۔

اودھ پنچ نکالنے کی غرض و غایت مالی فائدہ کے بجائے طنز و مزاح کے ذریعہ قوم میں پیدا شدہ معاشرتی برائیوں کی اصلاح، ذہنی بیداری پیدا کرنا اور انگریزوں کی لائی ہوئی ذہنی غلامی سے نجات دلانے کی کوشش تھی۔ بلاشبہ اس اخبار نے نہایت ہی جرأت مندی اور حوصلہ مندی کے ساتھ انگریزی ذہن و فکر اور تہذیب کا مذاق اڑایا۔ اور ان کی سیاست کو نشانہ بنایا۔ مغربی تہذیب جسے بغیر سوچے سمجھے اہل ہند اختیار کیے جارہے تھے اور اپنے ماضی و مستقبل سے بے خبر ہوتے جارہے تھے جس کے نتیجہ میں بھیانک تباہی کے آثار دکھائی دینے لگے تھے۔ ایسے وقت میں اپنچ نے ہنستے ہنساتے اور طنز کے وار سے مضطرب کرتے ہوئے ہمیں جھنجھوڑنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں وہ بہت حد تک کامیاب ہوا۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے پنچ کی اسی خصوصیت کی طرف اپنی اس تحریر میں اشارہ کیا ہے۔

> "پنچ نے ایک طرف ان حیثیات سے بغاوت کی جو شرق کے لیے باعث ننگ اور اس کی تباہی کا موجب تھیں دوسری طرف اس نے اس کورانہ تقلید کے خلاف علم جہاد بلند کیا جس کی بنا پر لوگ دیوانہ وار مغرب کی پذیرائی اور پرستش کر رہے تھے۔" [۱]

اودھ پنچ نے اصلاحی مقصد کے لیے طنز و ظرافت کا استعمال صرف نثر و نظم کے ذریعہ نہیں کیا بلکہ کارٹون کی مدد سے بھی اپنے اصلاحی کاموں کو آگے بڑھانے کی کوشش کی تھی جس میں انھیں بہت حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس کی باگ ڈور منشی سجاد حسین کے ہاتھ میں تھی جو ایک زندہ دل اور بے باک صحافی اور نڈر اور محب وطن ہندوستانی تھے۔ جن کی ظرافت میں عام طور سے دل آزاری نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ صحتمند انداز سے برائیوں کو دور کرنے کی کوششیں ہوتی تھیں جس کے نتیجہ میں اس کی طنزیہ مزاحیہ مشمولات اور کارٹونوں کو اس زمانے میں بڑی مقبولیت رہی ۱۸۷۷ء سے ۱۹۱۲ء تک تقریباً ۳۵ سال تک اس اخبار نے کبھی اپنی ظرافت سے قہقہہ لگانے اور مسکرانے پر مجبور کیا اور کبھی اپنے طنز کے تیر سے لہولہان اور مضطرب کرتے ہوئے اردو ادب کے طنز و ظرافت کے سرمایہ کو مالامال بھی کیا اور اہل اردو کو اپنی کوتاہیوں کی طرف متوجہ کرنے میں کامیابی بھی حاصل کی۔ بلاشبہ اردو کے طنزیہ مزاحیہ ادب میں اودھ پنچ کی ہمیشہ اہمیت رہے گی اور اس کی زبان و ادب

اور ملک کی خدمات کا ہمیشہ اعتراف کیا جاتا رہے گا۔

پنڈت برج نرائن چکبست نے اودھ پنچ کی مقبولیت اور اس کے متعلق اس طرح کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

"اودھ پنچ ظرافت کا سرچشمہ تھا اور عام طور سے لوگ اس کے فقروں اور لطیفوں پر لوٹ پوٹ رہتے تھے جو پھبتی اس میں نکل جاتی تھی وہ مہینوں زبان پر رہتی تھی،،[2]

اور انھوں نے یہ بھی اعتراف کیا ہو:

"آج نثر اردو جس سلیس اور پاکیزہ روش پر جاری ہے اس کی ایجاد میں اودھ پنچ کا بہت بڑا حصہ ہے،،[3]

اس اخبار کی خوبیوں کے پروفیسر رشید احمد صدیقی بھی معترف تھے انھوں نے اس کی ان خصوصیات کی طرف توجہ دلائی تھی:

"...... اس میں شک نہیں کہ پنچ، ظرافت کا علمبردار تھا اور ظرافت کے اس بے پناہ آلہ نے زندگی کے کسی شعبہ کو اپنے وار سے محفوظ نہ رکھا۔ اردو ادب میں اودھ پنچ اپنے قسم کا اولین پرچہ تھا اور اکثر حیثیت سے وہ ظرافت و طنزیات کے رائج الوقت معیار کا بہترین ترجمان تھا۔"[4]

اودھ پنچ میں لکھنے والے اس زمانہ کے اردو کے تقریباً تمام معروف طنز و مزاح نگار تھے۔ خود منشی سجاد حسین اس میدان میں نمایاں اور ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ انگریزی حکومت کے خلاف آواز اٹھاتے رہے اور ان کی تہذیب کی مخالفت کرتے رہے اور مشرقی اقدار کی ہمنوائی ان کا شیوہ رہا۔ اس اخبار کا موٹو تھا (LIFE IS PLEASURE) یعنی زندگی مسرت ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ مزاحیہ صحافت کو اردو میں اسی اخبار کی وجہ سے مقبولیت حاصل ہوئی سیاسی اور سماجی مسائل پر اس نے ہمیشہ نہایت تیکھے انداز سے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اپنی آواز بلند کرتا رہا۔

یہ اودھ پنچ کی مقبولیت ہی تھی جس کی وجہ سے اردو میں اور بھی بہت سے اخبارات اس طرز کے نکلے جن میں پنجاب پنچ (لاہور) کلکتہ پنچ، (کلکتہ) انڈین پنچ (لکھنؤ) دہلی پنچ (لاہور) بنگال پنچ (کلکتہ) باوا آدم پنچ (بنارس) راجپوتانہ پنچ (اجمیر) میرٹھ پنچ (میرٹھ) سرپنچ (سید پور) کشمیر پنچ (بدایوں) ہریانہ پنچ (جھجھو) کرناٹک پنچ (رائے بیٹھ) دکن پنچ (مدراس) کشا پنچ (الہ آباد) فتح گڑھ پنچ (فتح گڑھ) برار پنچ (کولہاپور) گجرات پنچ (گجرات) فیروز پور پنچ (فیروز پور) سرپنچ (میرٹھ) دکن پنچ (جالندھر) آگرہ پنچ (آگرہ)[5] وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

لیکن ایک خیال یہ بھی ہے کہ اودھ پنچ نے جہاں مزاحیہ صحافت کو فروغ دیا وہاں پھکڑپن اور ابتذال سے نہ صرف دامن نہیں بچا سکا بلکہ اس کی وجہ سے اسے فروغ ہوا۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے تحریر کیا ہے:

"جس زمانہ میں اودھ اخبار روزنامہ کی حیثیت سے نکل رہا تھا ہندوستانی صحافت میں پنچ اخبارات کا بڑا چرچا تھا۔ یہ اخبار مزاحیہ اخبار تھے لیکن جب پھکڑپن پر آجاتے تو حدود سے متجاوز ہو جاتے اور خوب گندگی اچھالتے ان میں سب سے نمایاں اودھ پنچ تھا۔،،[6]

آگے ایک جگہ اپنی اس بات کو انھوں نے اس طرح بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے:

"اودھ پنچ سے اردو صحافت کو نقصان بھی پہنچا ہے اس نے مزاح میں ابتذال اور پھکڑپن کو فروغ دیا۔ بڑے بڑے ادیبوں نے یہی رنگ اختیار کر لیا اور پھر اس کی تقلید میں جو پنچ اخبار ہندوستان کے طول و عرض میں نکلے انھوں نے پھکڑپن ابتذال اور فحش نگاری میں انتہا کر دی۔ یہ رنگ صحافت میں تیس ۳۰ پینتیس ۳۵ سال تک مسلط رہا،،[7]

رام بابو سکسینہ بھی اودھ پنچ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اس کی بعض خامیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں لیکن نرم لہجہ کے ساتھ:

"اودھ پنچ یوں تو ایک ظریفانہ موقر اخبار تھا مگر کبھی کبھی اس کی ظرافت کا رنگ بدل جاتا تھا اور وہ طعن و تشنیع اور ذاتی حملوں پر اتر آتا تھا۔ بعض مضامین کے پڑھنے سے مثلاً وہ جو فسانۂ آزاد، حالی، داغ، گلزار نسیم وغیرہ کے متعلق لکھے گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اودھ پنچ کے صفحات مہذب اور سنجیدہ ظرافت سے گزر کر

پھکڑ کا ایک میدان بن گئے ہیں مگر اقسام ذیل کے مضامین نہایت قابلیت اور شستگی کے ساتھ اس کے صفحات میں درج ہوتے رہے ہیں...»

ان اقتباسات کے مطالعہ سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ اودھ پنچ نے کبھی کبھی حالات اور ماحول سے متاثر ہو کر اردو کے طنز و مزاح کے معیار اور مزاج کو نقصان پہنچایا ہے لیکن اس کا اعتراف تقریباً تمام اہل نظر نے کیا ہے کہ اس کے وجود سے طنز و مزاح کے خزانے میں نمایاں اضافہ بھی ہوا ہے خاص طور سے اردو طنزیہ اور مزاحیہ شاعری نے اودھ پنچ کے زیر سایہ نئی کروٹ لی تھی اور بڑی مقبولیت اور شہرت حاصل کی تھی اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اودھ پنچ نے طنزیہ اور مزاحیہ شاعروں کا اپنے گرد جمگھٹا تیار کر لیا تھا۔ ان شعراء نے ان پینتس سال میں اپنے خوب خوب جوہر دکھلائے ان میں منشی سجاد حسین کے علاوہ احمد علی شوق، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، تربھون ناتھ ہجر، عبد الغفور شہباز، بابو جوالا پرشاد برق، الانسان ضاحک اور اکبر الہ آبادی اہم ہیں۔

منشی سجاد حسین کے یہاں طنز و مزاح میں اصلاحی مقاصد کی اہمیت زیادہ رہی ہے لیکن ان مقاصد کے حصول میں بھی سچائی کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ عبد الغفور شہباز نے قوم اور مذہب کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا لیکن نرم لہجہ کے ساتھ سطحیت کو قریب پھٹکنے نہیں دیا۔ مرزا مچھو بیگ ستم ظریف نے کئی سال تک اودھ پنچ میں بول چال کی زبان میں مضامین لکھے۔ تربھون ناتھ ہجر تحریف نگاری میں نمایاں ہوئے الانسان ضاحک اودھ پنچ کے نامہ نگار رہے۔ اخبار کے ماحول نے انھیں بھی اسی رنگ کا شاعر بنا دیا تھا۔ احمد علی شوق نے معاشرہ کی خرابی اور بری عادتوں کے خلاف آواز بلند کی اور طنز کے وار کیے اور اکبر الہ آبادی نے جو مغرب سے اس قدر متنفر تھے کہ اس کی ہر اچھی بری چیز کی مخالفت میں تسکین محسوس کرتے تھے۔ اپنی طنزیہ مزاحیہ شاعری کا معیار ہمیشہ بلند رکھا۔ یہاں چند شعراء کے کلام کے نمونے درج کیے جاتے ہیں تاکہ اس دور کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کے مزاج و معیار کا اندازہ ہو سکے۔

تن ہو گیا ہے سوکھ کے کانٹا ببول کا   اپنے تو حق میں عشق امر بیل ہو گیا

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں رسن

دو ایک ہاتھ چاہ میں جب ڈول رہ گیا

سجاد حسین

تہذیب قیس

لیلیٰ کے کہنے سننے سے آخر کو قیس نے   لکھوایا نام نجد کے انگلش اسکول میں

اے بی سے بعد پڑھنے گیا ایسی ریڈریں

تعلیم خوش معاشی ہے جن کے اصول میں

شہباز

وہی مجو بھٹیاری جو پہلے تھی سو اب بھی ہو   وہی لہنگا وہی ساری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

وہی کھانا نہ پینا دس بجے جانا کچہری کا   نصیبوں کی وہی خواری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

ستم ظریف

وہ کہہ رہے ہیں ہند میں تکلیف کچھ نہیں

ہم کہہ رہے ہیں ہند میں آرام جھوٹ ہے

الانسان ضاحک

لیکن اس اودھ پنچی جمگھٹے میں سب سے بڑا اور نمایاں نام اکبر حسین اکبر الہ آبادی کا ہے جنھوں نے نہ صرف اودھ پنچ کی مقبولیت اور اہمیت میں اضافہ کیا بلکہ اردو طنزیہ مزاحیہ شاعری کا وقار بہت بلند کیا۔ ان کا اپنا ایک رنگ مزاج اور انداز فکر تھا جو قابل تقلید نہ تھا۔ بعض شعراء نے ان کے رنگ کو اختیار کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بہت زیادہ کامیاب نہیں ہوئے انھیں میں علامہ اقبال بھی تھے۔

اکبر الہ آبادی مشرقی مزاج رکھتے تھے لیکن تنگ نظری پسند نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے اودھ پنچ کے ذریعہ سرسید تحریک کی مخالفت محض مغربیت سے نفرت کی وجہ سے اس انداز سے کی کہ وہ سرسید کے مخالفوں میں شمار کیے جانے لگے۔

اکبر الہ آبادی کے طنزیہ مزاحیہ کلام میں ایک خاص قسم کی سنجیدہ شوخی اور طنز کی تیزی پائی جاتی ہے لیکن انھوں نے کہیں شدت اختیار نہیں کی بلکہ ہمیشہ درمیانہ روی ہی کو پسند کرتے رہے اور ساری

زندگی نہایت احتیاط سے کام لے کر اس میدان میں آگے اور بہت آگے بڑھتے رہے اور تندی و تلخی سے پرہیز کرتے رہے جس کی وجہ سے ہر معیار اور مزاج اور نقطۂ نظر کے لوگوں میں پسند کی نظر سے دیکھے جاتے رہے۔

دراصل اکبر کا مقصد مذاق اڑانا کبھی نہیں رہا۔ وہ اصلاح چاہتے تھے اور قوم کو مغربیت کے اثرات سے محفوظ دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی کو انھوں نے اپنی زندگی کا حاصل سمجھا تھا لیکن اس کے باوجود انھوں نے دوسرے مسائل کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی ہے اور قوم کو متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اکبر کے یہ چند اشعار ملاحظہ کریں۔

مے خانۂ ریفارم کی چکنی زمین پر — واعظ کا خاندان بھی آکر پھسل گیا
کیسی نماز، بال میں ناچو جنابِ شیخ — تم کو خبر نہیں کہ زمانہ بدل گیا

نئی تعلیم کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے
جناب ڈارون کو حضرت آدم سے کیا مطلب

کہاں کی پوجا، نماز کیسی کہاں کی گنگا کہاں کا زم زم
ڈٹا ہے ہوٹل کے در پہ ہر اک ہیں بھی دو اک جام اے صاحب

اکبر الٰہ آبادی اردو طنز و مزاح کے میدان میں تنہا شاعر ہیں۔ جن کا کلام ہر دور میں مقبول رہا ہے۔ آج بھی ان کے یہ اشعار صحافیوں کی تحریروں میں، رہنماؤں کی تقریروں میں، تقاریب اور سنجیدہ محفلوں میں گونجتے اور محظوظ کرتے محسوس ہوتے ہیں جن کی وجہ سے اردو کے پژمردہ خیموں میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں — اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا — کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا

یہ اور اس طرح کے بے شمار اشعار ہیں جو مختلف اوقات میں فضا میں گونجتے رہے ہیں اور اودھ پنچ کی یاد تازہ کرتے رہے ہیں یہ اودھ پنچ ہی ہے جس نے اودھ کو طنز و مزاح کی دنیا میں نمایاں مقام دلا کر اپنی پہچان بنائی ہے۔ □□

حواشی:

۱۔ طنزیات و مضحکات : رشید احمد صدیقی ص ۹۰
۲۔ مضامین چکبست ص ۲۲۸ ۳۔ مضامین چکبست ص ۲۲۹
۴۔ طنزیات و مضحکات : رشید احمد صدیقی ص ۸۸
۵۔ دیکھئے صحافت پاک و ہند میں ص ۲۴۸ از ڈاکٹر عبد الاسلام خورشید
۶۔ صحافت پاکستان و ہند میں : ڈاکٹر عبد السلام خورشید ص ۱۹۹
۷۔ 〃 〃 〃 〃 ص ۲۴۷
۸۔ تاریخ ادب اُردو : رام بابو سکسینہ ص ۱۰۲ - ۱۰۳

اودھ میں فنِ سپہ گری ——— ص ۵۵ کا بقیہ

۸۔ مضمون: میر انیس اور فنِ سپہ گری : سید تقی حسن نقوی۔ سہ ماہی تحریر - دہلی اکتوبر تا دسمبر ۱۹۷۳ء
۹۔ واقعاتِ انیس : سید مہدی حسن احسن لکھنوی ، اصح المطابع لکھنؤ ص ۹۶-۹۵
۱۰۔ فنِ سپہ گری : سید مبارک حسین ۔ ناشر مصنف ۔ لکھنؤ ۱۹۷۴ء
۱۱۔ تذکرۂ ہفت اقلیم (مخطوطہ لکھنؤ یونیورسٹی) امین احمد رازی
۱۲۔ قطرہ محیط بحر ہند : منجانب کمیٹی نمائش صنعت و حرفت بہ مقام قیصر باغ لکھنؤ ۱۸۸۵ء۔ ترجمہ منشی درگا دیال۔ مطبع مصطفائی لکھنؤ ۱۸۸۵ء ص ۳۰
۱۳۔ قطرہ محیط بحر ہند ص ۳۰ ۱۴۔ ایضاً ص ۲۸
۱۵۔ سیاق نامہ : منشی آنند رام مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۸۷۹ء
۱۶۔ مکتب نامہ مسمّٰی بہ علم الحساب : باہتمام محمد عبد الرحمٰن ابن حاجی محمد روشن خاں بار دوم۔ مطبع نظامی کانپور رمضان المبارک ۱۲۷۹ھ
۱۷۔ انشائے دل کشا : سید نثار علی بخاری بریلوی۔ فخر المطابع ۱۲۷۰ھ
۱۸۔ و ۱۹۔ ایضاً ، ۲۰۔ ۲۱۔ سیاق نامہ ، ۲۲۔ انشائے دل کش
۲۳۔ وضع دارانِ لکھنؤ : سید محمد ہادی لکھنوی۔ تصویر عالم پریس لکھنؤ ۱۹۰۸ء ص ۴۵-۴۴
۲۴۔ سلطانِ عالم واجد علی شاہ : سید مسعود حسن رضوی ادیب، (نسیم بک ڈپو؟) اکادمی لکھنؤ ۱۹۷۷ء ص ۳۸
۲۵۔ وزیر نامہ : وزیر السلطان امیر علی خاں، مطبع نظامی کانپور ۱۲۹۳ھ ص ۲۲-۱۱۷
۲۶۔ اودھ پر انگریزوں کا غاصبانہ قبضہ : مرزا علی اظہر برلاس۔ اودھ اکادمی (؟) کراچی ص ۲۸
۲۷۔ ایٹین ففٹی سیون : سریندر ناتھ سین (بحوالہ سلطانِ عالم واجد علی شاہ) ص ۳۴-۳۳
۲۸۔ قدیم ہنر و ہنر مندان لکھنؤ : سید اسرار حسین خاں۔ سرفراز قومی پریس لکھنؤ ۱۹۳۶ء ص ۱۱۲- ص ۱۱۳ و ص ۱۷۳ تا ص ۱۸۴

سبطِ محمد نقوی
چیف ایڈیٹر "ہماری توحید" (ہندی)
امام باڑہ غفران مآب، لکھنؤ-۳

اودھ کے چند نامور تاریخ نگار

اُن کی تاریخیں (۲)

اصل موضوع میں داخلے سے پہلے تاریخ کا موضوع و مقصد کیا ہے! اس کی نسبت مختصر سی گفتگو ہو جائے تو غالباً اودھ کی تاریخ نگاری کی مزاجی کیفیت سمجھنے میں زیادہ آسانی ہو۔ جب اس فن کی تدوین ہوئی تو اس کا مقصد محض واقعات کی جمع آوری تھا۔ یونان میں معقولات کا دور دورہ ہوا تو واقعات کی تصدیق اور اس کے پس پشت کارفرما عوامل کی تحقیق کا عنصر شامل ہوا پولی بی ایس کے نزدیک تاریخ کا مقصد یہ تھا کہ وہ افراد کی اصلاحِ نفس کا موجب بنے۔ بسرو اس سے بھی آگے گیا۔ اس کے نزدیک چونکہ تاریخ "معلمِ زندگی" ہے لہٰذا اس میں دروغ مصلحت آمیز بھی جائز ہے۔ [1]

بسرو کا مصلحانہ یا مصالحانہ نقطۂ نظر سمجھ میں آتا ہے لیکن صداقت تو مخدوش ہو ہی گئی۔ اسی پر بس ہو جاتا تو بسا غنیمت تھا لیکن مغربی تہذیب و سیاست نے تاریخ نویسی کو سیاست کا محض ایک حصہ بنا ڈالا۔ پروفیسر سیلی اور پروفیسر گولڈن اسمتھ جیسے یوروپین فاضلوں نے تاریخ کو سیاست کا محض ایک حصہ تسلیم کیا ہے۔ [2]

اوران خیالات کا پورا پورا اثر پڑا۔ اودھ کی جتنی تاریخ نگاری ہوئی ہے؟ شاید ہی کسی اور خطۂ ارض کی ہوئی ہو۔ اس کثرت کا سبب ظاہر ہے کہ پہلے تھوڑا بہت "خوشنودیِ مزاج" کی مد میں لکھا گیا جیسے ہرچرن کی چہار گلزار شجاعی۔ اسے آپ مدلّل مداحی یا نثری قصیدے کے ذیل میں بھی درج فرما سکتے ہیں۔ مگر ان کی تعداد شاید انگلیوں پر شمار کرنے بھر کی ہو یا اس سے بھی کم ہو۔ پھر ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے اقدامات کو جائز اور اپنے منصوبوں کو اصلاحی و فلاحی ثابت کرنے کے لیے انبار لگوانا شروع کیا۔ غصب اودھ کے بعد تو یہ روایت تیز ہوئی کہ جس کا شمار ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اسی تیر بارانی میں اکّا دُکّا دفاعی کارروائی ہوئی۔ وزیر السلطان سید امیر علی خاں کے وزیر نامہ اور برڈ کی انگریزی کتاب کو جس کا ترجمہ راجیندر پانڈے نے ہندی میں اودھ کی لوٹ کے نام سے کیا ہے اسی قبیل سے شمار کرنا چاہیے۔

ایک سبب یہ بھی ہوا کہ ۱۸۵۷ء کا انقلابی اقدام سب سے زیادہ اودھ ہی میں موثر رہا۔ اسے "غدر" کا نام دے کے اپنے موقف کو برحق ثابت کرنے کے لیے اس کی روداد انگریزوں نے خود لکھنا اور لکھوانا شروع کی۔ ملک آزاد ہوا تو اودھ کی تاریخ نگاری تین دھاروں میں بہنے لگی۔ ایک تو وہ لوگ جو بے لاگ واقعی تاریخ لکھنا چاہتے تھے جس میں بیشتر یونیورسٹیوں کے ریسرچ اسکالر تھے مگر اردو، فارسی پر دسترس نہ ہونے کی وجہ سے یا بعض اور موانع سے ماخذ کے صحیح فہم و درک سے قاصر رہے۔ دوسرا دھارا ان لوگوں کا ہے جو اودھ کے فرماں رواؤں سے ناراض ہیں اور اس کچے مال سے پورا پورا فائدہ لے رہے ہیں جو انگریز چھوڑ گئے ہیں۔ تیسرے دھارے میں وہ لوگ ہیں جو اپنے بس بھر حقائق پیش کر رہے ہیں۔ اسی دھارے میں ان حضرات کو شامل سمجھنا چاہیے جن کا موضوعِ فکر و دائرہ کار ہی تاریخ ہو یہ سب ملا جلا کے فارسی اردو، انگریزی اور ہندی میں بہت بڑا انبار لگ گیا۔

"قلم کاروں کے حالات کی تحقیق تو فردِ واحد کے لیے تقریباً محال ہے۔ اہلِ دانش و بینش کی ایک جماعت اس کے لیے آمادہ ہو تو بات بن سکتی ہے۔ فارسی، اردو سے ناآشنائی نے بھی نتائج کو ناقص اور معیار کو پست کیا ہے

اس سلسلے میں ایک فنی سوال بھی کھڑا ہوگا کہ سیرت و سوانح نگار بھی تاریخ نگاروں کے دائرے میں شامل ہیں یا نہیں؟ مرحوم رئیس احمد جعفری ندوی، جامعی اور پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم کی کاوشیں

واجد علی شاہ کی حیات سے متعلق ہیں مگر واجد علی شاہ کی فرماں روایانہ حیثیت کا جزوی احاطہ کرتی ہیں۔ پروفیسر مرزا اظہر علی کی پیش کش کا نام ہے "کنگ واجد علی شاہ آف اودھ"۔ یہ بھی جامع اور تحقیقی کتاب ہے۔ اس راقم کی کوشش امجد علی شاہ میں بھی فرماں روائی کا پہلو اجاگر ہے۔ ایک صنف ایسی کتابوں کی ہے جن میں اودھ کی ذیلی یا جزوی حیثیت ہے یعنی وہ کتابیں جو ہندستان پر ہیں یا ایسی کتابیں جن کا مرکزی مقام یا ہیرو اودھ کے باہر کا ہے پھر بھی کسی نہ کسی حد تک اودھ کا مذکور ہوا ہے۔ مثال کے طور پر نانا صاحب پیشوا پر پنڈت آنند سروپ شر کی فاضلانہ کتاب لیکن اس میں ایک باب حضرت محل پر بھی ہے اور اودھ کے کچھ دوسرے انقلابی مورچوں کا ذکر ہے۔ ایک صنف ان کتابوں کی ہے جو علم سینہ کا ترجمہ ہیں جیسے پنڈت امرت لال ناگر کی غدر کا پھول یہ تاریخ نہیں ہی جنڈ میں مدرج ہوگی لیکن معلومات تو ہیں عطا ہی کرتی ہے ان سب سوالوں کا کوئی قابل قبول جواب مل سکے تو کام کے حدود معین کرنے میں یقیناً مدد مل سکے گی۔ فی الحال تو یہی ہو رہا ہے کہ اودھ کے کسی پہلو پر لکھنے والے کو مورخ مان لیا جا رہا ہے۔

جہاں تک راقم عاجز کی اطلاع ہے۔ اس موضوع پر چودھری نبی احمد سندیلوی کی کتاب تذکرہ مورخین غالباً ابتدائی کوشش کے طور پر موجود ہے ہر چند کہ نوادر کے حکم میں ہے۔ اس سلسلے کو ہمارے انور حسین اکبرپوری نے آگے بڑھایا ہے لیکن ان کی کوشش ابھی رسم اجرا کی منتظر ہے۔ نیا دور اس موضوع کو وسعت دے رہا ہے۔ اور اب سے مفصل کام یہی ہو سکتا ہے اگر اس سلسلے کو چلایا جائے۔ مصنفوں، نثر نگاروں وغیرہ کے جو تذکرے ہیں ان میں بھی چیزیں موجود ہیں پھر بھی امید ہے کہ اس کام کی طرف ہمارے ارباب قلم ونظر کی توجہ اور بڑھے گی۔ کام آگے بڑھا تو اور راہیں نکلیں گی مثلاً اب تک اردو صحافیوں کے بارے میں ہمارے پاس کچھ نہیں ہے ہر چند کہ اردو صحافت کی تاریخ پر اچھا خاصا مطبوعہ مواد مہیا ہو گیا ہے۔ ان تاریخ نگاروں یا صحافیوں کے حالات کی جستجو زیادہ دقت طلب نہیں ہے جن کے کام دوسرے اصناف میں بھی ہیں۔ دقت انھیں حضرات کے بارے میں ہے جو محض صحافت کے ہو کر رہ گئے۔ یا تاریخ نگار کے علاوہ شخصیت کا کوئی اور پہلو نہیں رکھتے۔

میں نے اس تمہیدی معروضے میں درازنفسی سے کام لیا ہے بمقصود بس یہ ہے کہ صورت مسئلہ واضح ہو جائے۔ اب ہمیں موضوع کی طرف رُخ کرنا چاہیے۔

• ابو طالب کی کتاب اودھ کی قدیم تاریخوں میں شمار ہوتی ہے لیکن مصنف کے ارادے نام سے ہی ظاہر ہیں۔ تفضیح الغافلین یعنی غافلوں، بے سدھ لوگوں کو فضیحت کرنے والی کتاب۔ یہ غافل آصف الدولہ اور ان کے امیروں اور درباریوں کے سوا کون ہو سکتا ہے۔ بڑے حسن عقیدت کو راہ دی جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ ابو طالب بھی تاریخ کو معلم سمجھتا ہے اور افراد کی اصلاح چاہتا ہے مگر اصلاح، تعلیم پند و نصیحت سے ہوتی ہے، یا توبیخ و تفضیح سے! واقعہ یہ ہے کہ ابو طالب کمپنی بہادر کے حلقوں میں مقبول مال تھا۔ وہ بنگال سے لکھنؤ گورنر جنرل لارڈ کارنوالس کے سفارشی خط کے ساتھ آیا تھا۔ اودھ سے نکالا گیا تو چیری کے ساتھ۔ ابو طالب کا گہرا دوست کپتان رچرڈسن اسے اپنے ساتھ یورپ کی سیاحت پر لے گیا ابو طالب سے لکھنؤ کے ریزیڈنٹ مڈلٹن نے راجہ تلوئی بلبھدر سنگھ کے خلاف کمپنی کی مدد کی درخواست کی۔ یہ درخواست ابو طالب نے قبول کی اور مدد دی راجہ گرفتار ہوئے اور زخموں کی تاب نہ لا کر انتقال کر گئے۔ ایسے مقبول کمپنی سے معروضی تاریخ نگاری کی توقع کیسے کی جائے؟ سنہ ۱۲۱۲ھ میں رچرڈسن کی فرمائش پر کلکتے میں کتاب لکھی۔ سیاحت یورپ کی دعوت کو اسی کتاب کا معاوضہ سمجھنا چاہیے[۲]۔

ابو طالب کی سرگذشت حیات کی طرف متوجہ ہونے سے پہلے ممتاز مورخ و استاد مرحوم ڈاکٹر حبیب کے انتباہ کو دیکھ لینا چاہیے۔

ملاحظہ فرمائیں "اودھ کی تاریخی تالیفات میں ابو طالب اصفہانی کی تفضیح الغافلین (یا تاریخ آصفی) ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ ابو طالب کے والد حاجی محمد بیگ خاں جو پیدائش کے لحاظ سے ترک لیکن تہذیبی اعتبار سے ایرانی تھے۔ قسمت آزمائی کے لیے ہندوستان آئے اور نواب صفدر جنگ کی ملازمت میں داخل ہو گئے لیکن نواب شجاع الدولہ ان سے بدگمان ہو گئے اور انھیں گرفتار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ تاہم حاجی محمد خان کو کسی طرح عین وقت پر نواب کے ارادے سے آگاہی ہو گئی اور وہ اپنے اہل وعیال اور تمام جائداد و املاک چھوڑ چھاڑ کر مرشدآباد کی طرف راہ فرار اختیار کر گئے جہاں وہ ۱۷۶۶ء میں فوت ہو گئے۔ شجاع الدولہ نے حاجی محمد خان کا

دو لاکھ روپیہ نقد اور ان کی تمام جائداد ضبط کرلی۔ لیکن ان کے فرزند ابوطالب کا بہت خیال رکھا۔ اپنی کتاب "مسیر طالبی" میں ابوطالب کا کہنا ہے کہ میں لکھنؤ میں ۱۷۵۲ء میں پیدا ہوا تھا اور اگرچہ وہ (شجاع الدولہ) میرے والد کے رویے سے بہت ناخوش تھے پھر بھی انھوں نے اپنے اور ہمارے خاندانی تعلقات کے مدنظر میری والدہ کو خرچ کے لیے روپے دئے اور میری اعلیٰ تعلیم کے بارے میں انھیں پر زور تاکید کی۔ ابوطالب نے مروجہ نصاب کے مطابق جتنی بھی تعلیم ہو سکتی تھی حاصل کی۔ باوجود پریشان حالی کے ان کی تصنیف و تالیف کی ہوئی تقریباً بارہ کتابیں (سب کی سب فارسی میں) ملی ہیں جو ان کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں۔ نظم و نثر میں اور موسیقی اور علم ہیئت ایسے مضامین پر بھی ان کی معرکۃ الآرا تصانیف ہیں "مسیر طالبی" جس میں ان کے یورپ اور افریقہ اور مشرق قریب کے سفر کے حالات ہیں "خلاصۃ الافکار" جو فارسی شعرا کی سوانح عمری ہے اور "تفضیح الغافلین" جو اودھ کے آصف الدولہ کے دور کی تاریخ ہے۔

ڈاکٹر ثروت علی (نیشنل آرکائیوز آف انڈیا) جنھوں نے ابوطالب کی زندگی اور تحریروں کا ہر پہلو سے مطالعہ کرنے کے لیے انتہائی سعی و مشقت کے ساتھ چھ سال صرف کیے ہیں۔ تفضیح الغافلین کا اردو ترجمہ کرکے اسے شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس بنا پر کہ اودھ اور لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت کے بیان میں آصف الدولہ (کے دور) کی تاریخ بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کا فارسی متن جو رامپور لائبریری کے قلمی نسخہ پر مبنی ہے ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے شائع کر دیا ہے۔ قارئین ملاحظہ فرمائیں گے کہ ڈاکٹر ثروت علی کا کیا ہوا۔ ترجمہ بہت صحیح، صاف ستھرا اور واضح ہے۔ یہ فارسی متن کی قابل توجہ ترتیب اور ابوطالب اور اس کے معاصرین کی تحریروں کے وسیع مطالعہ کی بنیاد پر تیار کئے گئے حواشی پر مبنی ہے۔

ابوطالب کی اصل کتاب کی حقیقت کے بارے میں ہمیں یہ یاد رکھنا ہوگا کہ حکومت برطانیہ نے اپنے اثر و رسوخ کا سایہ اودھ پر ڈالنا شروع کر دیا تھا اور ابوطالب نے ایک برطانوی افسر کرنل رچرڈسن کی تجویز سے یہ کتاب لکھنی شروع کی تھی چنانچہ اکثر و بیشتر انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایجنٹ کی طرح لکھا۔ سوچا اور برتاؤ کیا ہے۔ "تفضیح الغافلین" (جس کا انگریزی ترجمہ ۱۸۸۵ء میں ہوئے نے کیا۔ اس مقدمے کا ایک جز معلوم ہوتی ہے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسران نے اودھ کے الحاق کے جواز کے لیے بنانا شروع کیا تھا۔ ڈاکٹر ثروت علی نے نہایت توجہ کے ساتھ کتاب کے ناقدانہ موازنہ کی کوشش کی ہے۔ میں اتنا ہی کہنے پر اکتفا کروں گا کہ وہ سارا مواد جو ہماری دسترس میں ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وارن ہیسٹنگز اور کارنوالس کے بنگال کی بہ نسبت آصف الدولہ کے اودھ میں اوسط درجہ کے تعلیم یافتہ یا غیر تعلیم یافتہ ہندوستانی اشخاص کی حالت بدرجہا بہتر تھی۔[۴]

ڈاکٹر حبیب کے اس ارشاد میں ابوطالب کی سرگرمیاں کافی حد تک آگئی ہیں بس یہ ذکر باقی ہے کہ چودہ سال کی عمر میں ابوطالب اپنے باپ کی طلب پر بنگال چلا گیا تھا۔ مرشدآباد میں اس کی شادی ہوئی اور وہیں عامل مقرر ہو گیا۔ شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد مختار الدولہ کے بلانے پر زین العابدین کے ساتھ لکھنؤ آیا۔ ۱۷۹۱ء میں زین العابدین دوآبے کے انتظام کے لیے بھیجا گیا۔ ابوطالب پھپھوند (اب ضلع اٹاوہ) میں تعینات ہوا۔ اس دوران اس نے ایک انگریز افسر میجر ہو کی جان بچائی۔ لیکن مختار الدولہ کے قتل کے بعد حیدر بیگ خاں نائب ہوا۔ اس نے ابوطالب کو معطل کر دیا۔ ناچار ابوطالب کو بھی اس کے ساتھ لکھنؤ واپس آنا پڑا۔ انگلستان کی سیاحت سے واپس آیا تو بھی برسر کار نہ ہو سکا۔ کافی قرضدار بھی ہو چکا تھا۔ ۱۸۰۶ء میں اسے موندھ (باندہ) میں تحصیلدار مقرر کیا گیا لیکن اسی سال فرمانِ اجل آپہنچا اور وہ چوّن سال کی عمر میں چل بسا۔

ڈاکٹر ثروت علی نے حالات کا ذکر کرتے ہوئے ابوطالب کے مصنفات کی فہرست دی ہے جس میں بارہ تصنیفوں کے نام ہیں۔ ان میں سے صرف تین مسیر طالبی فی بلاد افرنجی، اسی تاریخ آصفی (تفضیح الغافلین) اور مثنوی سرور افزا کو مطبوعہ بتایا ہے۔[۵]

● آپ نے ابھی نیا دور کے ضمیمہ اودھ نمبر (جون ۱۹۹۴ء) میں سید کمال الدین حیدر میر محمد زائر کی تاریخ اودھ کی ایک جلد قیصر التواریخ کی نسبت سید رئیس آغا کا مفصل مضمون دیکھا ہوگا۔ یہ اودھ کی کثیر الحوالہ تاریخ ہو جانے سے کافی اہمیت پا گئی ہے۔ اس کی عصری اہمیت یہ ہے کہ رئیس آغا صاحب کے ہاتھ مصنف کا وہ مخطوطہ بھی لگ گیا جسے حکام کے سامنے اجازۂ اشاعت کے لیے پیش کیا گیا تھا۔ اس میں اور مطبوعہ

صورت میں نمایاں فرق ہے۔ انگریزوں کی تاریخ کے ساتھ دھاندلی کا یہ ایک جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ جیتا جاگتا ثبوت ہی نہیں منہ بولتا ثبوت بھی۔ کاش اس کا صحیح استعمال ہو سکتا۔ اگر یہ مسودہ پہلے منظرِ عام پر ہوتا تو مرحوم رئیس احمد جعفری کو اتنی تیکھی تنقید نہ کرنا پڑتی۔ فرماتے ہیں۔ غدر کے سلسلے میں اودھ کی بہت سی تاریخیں انگریزوں، ہندوؤں اور مسلمانوں نے لکھی ہیں۔ ان میں قیصر التواریخ خاص طور پر اہم ہے۔ یہ تاریخ سید کمال الدین حیدر حسنی الحسینی المشہدی عرف میر زائر نے لکھی ہے۔ لکھنے والے میر زائر صاحب ہیں۔ لکھوانے والے مشہور مورخ سر ہنری ایلٹ ہیں جو گورنر جنرل ہند کے سکریٹری تھے۔ طبع اور اشاعت کا انتظام سر ڈگوجے سنگھ راجا بلرام پور نے کیا تھا جو سرکار کمپنی بہادر اور سرکار انگریز بہادر کی وفاداری اور اپنے ملک کی غداری میں مشہور ہیں۔ چھاپنے والا نول کشور پریس ہے۔[۶] بے احتیاطی کے اور نمونے جو تحقیق کاروں کی طرف سے ظہور میں آئے ہیں۔ وہ قابلِ حیرت ہیں ڈاکٹر جی ڈی بھٹناگر نے یہ بات جانتے ہوئے بھی کہ میر زائر کی کتاب پر انگریزوں کی ایک تثلیث نے نظر کر کے اسے سہ آتشہ بنایا جس کے ارکان میں کلائنٹ اور ڈاکٹر اسپرنگر کے علاوہ سلیمن بھی ہیں۔ غضب اودھ کے سلسلے کی سب سے سرگرم و چالباز شخصیت پھر بھی ڈاکٹر بھٹناگر فرماتے ہیں۔ " کمال الدین حیدر نے بیانِ واقعات میں ناجانب دار رہنے کی کوشش کی ہے "[۷] ہمارے اس دانشور نے اس بات پر بھی دھیان نہیں دیا کہ یہ انہونی ہوتی کیسی؟ کام سر ہنری ایلٹ کی فرمائش پر ہوا تھا۔ جب وہ ۱۸۴۷ء میں لکھنؤ آیا تھا اور میر زائر سے مفصل تاریخ لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ کیا یہ ممکن تھا کہ مال گاہک کی فرمائش کے مطابق نہ ہوتا۔ فرمائش کرنے والا بھی اناڑی نہیں تھا۔ خود پیشے میں تھا اور بہت شاطر کھلاڑی۔ کتاب غضب اودھ سے پہلے ۵۶-۱۸۵۵ء تک تصنیف ہو گئی ہوتی تو نہ اجازت کا سوال اٹھتا نہ اتنی تحریف ہوتی۔ میر صاحب نے اتنی دیر لگائی کہ غضب اودھ کا المیہ پیش آگیا اور صورتحال یہ ہو گئی کہ۔

زباں پہ مہر لگا دی، قلم کو روک دیا

رئیس آغا بتاتے ہیں کہ " سید کمال الدین حیدر نے تاریخ اودھ کا مسودہ جو دو جلدوں پر مشتمل تھا۔ حکام صدر لکھنؤ کی خدمت میں ۱۸۶۰ء اجازتِ طبع کی درخواست کے ساتھ پیش کیا تھا جسے ۱۸۶۱ء میں ایک مشروط حکم کے ساتھ۔۔ حکام صدر نے واپس کر دیا۔ سرکاری حکم میں کہا گیا تھا کہ

> " کمال الدین حیدر کے تئیں تاریخ واپس دی جائے اور آگاہ کر دیا جائے کہ اکثر مقامات پر تاریخ ساتھ خیر خواہی کے نہیں ہوئی ہے۔ لیکن وہ چھاپ سکتے ہیں۔ مناسب ہے کہ اول چھپی جلد مع تحریر قلمی واسطے ملاحظہ کے اس محکمہ میں پیش کرے اور تا حکم ثانی اور نہ چھاپے "[۸]

ہر چند کہ آغا صاحب نے اپنے مضمون میں حذف و اضافہ کے بعض مقامات کی نشاندہی کی ہے۔ پھر بھی یہ ایک ضروری اور مفید و دلچسپ کام ہے کہ رئیس آغا صاحب کے مقبوضہ مخطوطے کو مطبوعہ نسخے سے بالاستیعاب مقابلہ کر کے اختلافِ متن کی نشاندہی کر دی جائے۔ اس سے قبل کہ میر زائر کے حالات کی طرف متوجہ ہوں۔ سر ہنری ایلٹ کی ایک جھانکی سید سلیمان ندوی کے قلم سے دیکھ لیں:

> " ایلٹ کی کتاب کو اپنا گائڈ بنانے والا محقق، مسلمان سلاطین کے عہد کو صرف خون آلود اور خون آشام پاتا ہے جس کے ذہنی اثرات مدتوں کی تحقیق و کوشش کے بعد بھی مشکل سے مٹ سکیں گے۔ ایلٹ شروع انگریزی عہد کا آدمی ہے۔ اور یہ ایک گونہ سرکاری حیثیت بھی رکھتا ہے اور اس نے اپنے کام کے مقصد کو چھپا کر نہیں رکھا ہے۔ اس نے صاف طور سے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ اس کے پیشِ نظر تمام تر یہ ہے کہ اپنے اگلے پیش رو حاکموں کے غیر منصفانہ عہد کی تاریکی کو دکھا کر اپنی قوم کے عہد حکومت کی روشنی دکھلائے تاکہ ہندوستان کے رہنے والے اس کو سایۂ رحمت سمجھ کر اطاعت مندانہ اخلاص کا خراج ہمیشہ پیش کیا کریں "[۹]

ہم میر زائر کے حالات رئیس آغا صاحب کی فراہم کردہ اطلاعات کی بنیاد پر یہاں پیش کرتے ہیں " خود کمال الدین حیدر نے اپنی عرفیت میر محمد زائر لکھی ہے اور اپنا آبائی وطن طول طبس بتایا ہے۔ وہ ایران کے ایک معزز گھرانے کی فرد تھے۔ ان کے اسلاف میں میر عماد خوشنویس

اپنے فن میں طاق اور ایران کے صفوی بادشاہوں کے عہد میں شہرہ آفاق حیثیت کے حامل تھے ۔"

انھیں میر عماد کے صاحبزادے میر ابراہیم خاں ہندوستان آئے ۔ یہ نواب سربلند خاں کی صوبہ داری کشمیر کا زمانہ تھا ۔ میر محسن خاں ان کے بیٹے ساتھ تھے ۔ محسن خاں کے بیٹے میر شرف خاں اپنے باپ سے روٹھ کر کوڑہ جہان آباد (اب ضلع فتح پور) گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی میر زائر کے دادا میر محمد اسمٰعیل عہد آصفی میں اکثر چکلہ دار و عامل کے منصب پر رہے ۔ میر صاحب کے والد بھی سرکاری ملازمت اور مہاراجہ ٹکیت رائے کے درباریوں میں رہے ۔ عہد نواب سعادت علی خاں میں تجارت کرنے لگے ۔ خود میر زائر عہد غازی الدین حیدر میں ملازم ہوئے ۔ اسی عہد میں انگریزی پڑھنا شروع کی ۔ پھر رصدگاہ سلطانی سے متعلق ہوئے اور پھر الگ ہوئے ۔ درمیان میں ترجمہ و تالیف کے اہم کام کئے ۔ ابھی دو ایک ماہ قبل آپ ان سوانح کو ملاحظہ فرما چکے ہیں یہاں بقدر ضرورت عرض کر دیا گیا ۔ پوری سرگذشت کے اعادہ کی ضرورت نہیں البتہ میر زائر کے زمانۂ وفات کے بارے میں اس عاجز کو رئیس آغا کے بیان سے اتفاق نہیں ۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مادہ ہائے تاریخ کے مصرعوں کی آغا صاحب نے کیا قرأت کی ۔ میں انھیں اس طرح پڑھتا ہوں ۔

"کہ پائین شہ والا برون باب وے دفن است"

۱۳۱۰ ہجری

"برون باب سوئے پائے شاہ مدفون است"

۱۲۹۹ فصلی

میں اس پر اعتماد اس لیے کر رہا ہوں کہ نجم نے ہجری والے قطعے میں صاف صاف بتایا ہے کہ ۔

"زیا سے پانزدہ شب چارشنبہ از صفر ناگہ
بہ عمر ہفت و ہشتادم کمر بہر سفر بربست"

یہ سب چیزیں ۱۳۱۰ھ میں واقع ہوئی ہیں ۔ اسی سنہ ہجری میں ۱۵ صفر بدھ کے دن ، ۷ ستمبر ۱۸۹۲ء ہی تھی ۔ یہی میر زائر کی واقعی تاریخ وفات ہے ۔ بیشک سنہ فصلی میں ایک عدد کی کمی ہے اور وہ غالباً اس لیے کہ ۱۲۹۹ف ایک دن پہلے ختم ہوا تھا ۔ ۱۳۰۰ف کا پہلا دن یعنی کنوار کی پہلی ۔ اسی ۱۵ صفر ، چہار شنبہ ۷ ستمبر کو تھی ۔ اس امکان کو یکسر مسترد نہیں کیا جا سکتا کہ زائر کا انتقال نصف شب سے قبل حدود ۱۲۹۹ف میں ہی ہو گیا ہو ۔ سنہ قمری میں غروب آفتاب کے ساتھ دوسری تاریخ شروع ہو جاتی ہے ۔ فصلی میں ایسا نہیں ہے ۔ اس طرح میر زائر کا سنہ ولادت ۱۲۲۳ ہجری قرار پاتا ہے جو ۱۷ فروری ۱۸۰۹ء اور ۶ فروری ۱۸۱۰ء کے حصار میں ہے ۔ معلوم ہے کہ میر زائر کربلائے میر خدا بخش میں تکیہ زن تھے ۔ اب یہ کربلا اپنے بانی کی بجائے محل وقوع کی نسبت سے زیادہ مشہور ہے اور تال کٹورے کی کربلا کہی جاتی ہے ۔ یہیں ضریح کی پائنتی حجرے سے باہر میر زائر دفن ہیں ۔ افسوس ہے کہ میر زائر کے پسماندگان کا نام نظر قاصر سے نہیں گذرا ۔

ان قطعات کے شاعر نجم تھے ۔ سید محمد رضا نجم لکھتے ہیں ۔ ان کی مصنفہ تاریخ کی ایک جلد کا مخطوطہ مدرسہ سلطان المدارس میں محفوظ ہے وہاں کے فاضل کتاب دار مولانا رضا ساجد رضوی زید پوری نجم صاحب کے حالات کی تلاش میں ہیں ۔ مجھے ایسا خیال ہوتا ہے کہ ان کی بعض کتابیں شائع بھی ہو چکی ہیں ۔ اب مجھے مرزا رجب علی بیگ سرور کی طرف متوجہ ہونے کی اجازت دیں ۔

● رجب علی بیگ کی جو کتاب تاریخ کہی جاتی ہے وہ فسانۂ عبرت ہے ۔ یہ بھی ادنیٰ قلم کاروں میں ہیں جو بڑی حد تک حالات کے چشم دید گواہ ہیں اس میں اودھ کے آخری چار بادشاہ مذکور ہیں ۔ معلوم نہیں کہ پہلے بادشاہ غازی الدین حیدر کا ذکر کیوں نہیں ۔ حالانکہ سب سے زیادہ انقلابی واقعہ انھیں کے ہاتھوں پیش آیا یعنی مسند وزارت بساط شاہی سے بدلی ۔ انگریزوں کے دباؤ سے غازی الدین حیدر نے مرکزی شہنشاہیت سے ناتہ توڑ کر کمپنی بہادر کی صیانت و سرپرستی میں آ گئے ۔ مگر سرور کا فسانہ نویس قلم نصیر الدین حیدر سے داستان شروع کرتا ہے ۔ لیکن داستان ادھوری ۔ نہ پیدائش کا ذکر ، نہ تعلیم کا ، نہ تربیت کا ۔ سیدھے تخت نشینی سے داستان شروع کر دیتے ہیں :" پچیس برس کا سن عین شباب ، جوانی کی آب تاب ، مزے کے دن تھے جو تاج و تخت بلا و بخت زیست کی کیفیت ، حکومت کا لطف خوب اٹھایا ۔" [۱۱]

آپ توجہ فرمائیں! گنے چنے دس سال کی فرماں روائی سے دے کے کل پینتیس سال کی عمر۔ کیا زیست کی کیفیت دیکھی ہوگی اور کتنی دیر حکومت کا لطف اٹھایا ہوگا!

عزاداری میں بادشاہ کی دلچسپی کا ماتم کرتے ہیں۔ محرم میں یہ حال تھا کہ راہ چلتوں کو مسکرانا محال تھا۔ روز و شب غم اہل بیت میں رونا، اربعین تک زمین پر سونا، لباس آبی یا سیاہ، ہر دم لب پر نالہ و آہ ہزارہا روپیہ اور جہاں کی نعمت "مرثیہ خوان" اور "سید محتاج آب نان" پاتے تھے۔ مرزا جی ان سطور میں کیا کہہ گئے ہیں وہ اہلِ دانش و بینش پر روشن ہے۔ افسوس ہے کہ راقم عاجز کی نظر امجد علی شاہ کی تصنیف کے وقت اس پہلو پر نہیں گئی ورنہ ذرا تفصیل سے گفتگو ہوتی واقعہ یہ ہے کہ نصیر الدین شاہ حیدر کا دور اودھ کی تعمیر و ترقی کا دور تھا۔ سب سے اہم کام جو اس رفاہ عہد میں ہوا وہ گنگا سے ایک نہر نکال کے گومتی میں ملانا تھا۔ زراعت کی جو آبیاری ہوتی وہ بجائے خود بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ لیکن اس سے بڑھ کر ایک مہتم بالشان یہ بات ہوتی کہ لکھنؤ کے ساتھ اودھ کے باشندوں کے ایک اور حصّے کو اپنی دھرتی پر گنگا جل مل جاتا اور جو عظمت و تقدس برادران ہنود کی نظر میں گنگا کے لیے مخصوص تھا اس میں گومتی بھی شامل ہو جاتی۔ غالباً بادشاہ نے اسے اپنے والد کے نام سے منسوب کیا تھا کیونکہ یہ نہر اگرچہ لکھنؤ میں عوامی پیمانے پر حیدر کی نہر کے نام سے یاد کی جاتی ہو لیکن پڑھے لکھے بزرگوں کی زبان و قلم سے نہر غازی الدین حیدر سُنا بھی، پڑھا بھی۔ لیکن اتنے اہم رفاہی کام پر سرور کی نقرہ بازی ملاحظہ ہو چاہے لطف لیں چاہے عبرت پکڑیں۔ فرماتے ہیں: بیٹھے بیٹھے طبیعت لہرائی، گنگا سے نہر منگائی، منظور ہوا کہ چشمۂ خوشگوار جاری ہو جو بحرِ ہستی میں یادگار ہو، سرسبز ہر ایک کشت کار ہو، مزدور، غریب غربا نہال ہو گئے، کارندے صاحب مال ہو گئے۔" [11] اتنی تعمیری فکر کا نمونہ مرزا جی کی نظر میں بس "طبیعت کی لہر" ہے۔ اتنا ہی نہیں یہ داستان رنگ پر لانے سے پہلے ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ انگریزوں کی سیاہ کاری نظر ہی نہیں آئی۔ انگریزوں کی چیرہ دستی کا بحر اعظم۔ یہ نہر مکمل ہونے ہی نہیں دی گئی؟ رکاوٹ بھی ابتدائے کار میں نہیں کھڑی کی گئی۔ جب پچاس میل کھدائی ہو چکی۔ لاکھوں روپے ڈوب چکے تب بڑے صاحب (ریزیڈنٹ صاحب) پر یہ راز افشا ہوا: "چونکہ گنگا کمپنی کے علاقے سے ہو کے گذرتی ہے لہذا سارا سرحدی علاقہ کمپنی کا ہے۔" برڈ تبصرہ کرتے ہیں: "اگر ریزیڈنٹ کی بات سچ بھی تھی تو اس کا فریضہ تھا کہ کام شروع ہونے سے پہلے ہی بادشاہ کو آگاہ کر دیتا۔ ریزیڈنٹ نے ایسا نہیں کیا۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ریزیڈنٹ کا مقصد ہی یہ تھا کہ وہ بادشاہ کے اقتصادی ذرائع کو بے دست و پا کر دے۔" [12] کیا آدھے سچ کا بیان، وہ بھی تعبیر کو تفریحی انداز میں بیان کر کے تاریخ نگاری کہا جا سکتا ہے؟

آپ کا جواب جو بھی ہو لیکن فسانۂ عبرت کے مسیحا یا اس کے دوسرے جنم کے خالق پروفیسر مسعود حسن ادیب مرحوم کا جواب ملاحظہ فرمائیں: "مبالغہ بھی اس (یعنی سرور کے) زمانے میں بہت مقبول تھا۔ سرور بھی جب کسی کی تعریف یا مذمت میں قلم کا زور دکھاتے ہیں تو مبالغے کے پل باندھ دیتے ہیں۔ ایسے حد سے گذرے مبالغے کا ایک اچھا پہلو یہ ہے کہ پڑھنے والے کو اس پر حقیقت کا دھوکا نہیں ہو سکتا اور اگر وہ بالکل نثری طبیعت کا آدمی نہیں ہے تو مبالغہ کی نئی نئی صورتوں سے لطف بھی اٹھا سکتا ہے۔" [13]

مگر اس پیر دانا کا یہ اندازہ درست ثابت نہیں ہوا۔ ایک بڑے معتبر و باوقار اخبار کے مبصر نے اسے نئی اطلاعات کی کان سمجھا اور ارشاد فرمایا کہ: "یہ تحریریں ان تاریخی صداقتوں کی حامل ہے جن کی تلاش تاریخ اودھ کے مطبوعہ ذخیرہ میں بیکار ہے۔ گویا کہ فسانۂ عبرت کا کتاب نگر اڈیشن کسی غیر مطبوعہ مخطوطہ سے لیا گیا ہے۔ یہ ہے اودھ کی تاریخ نگاری اور یہ ہے اردو کی تبصرہ نگاری اور یہ ہے ہماری غیرت ملی و وطنی ظاہر ہے کہ مرتب کی نظر میں جو ایسا بیان ہو جس پر حقیقت کا دھوکا بھی نہ ہو سکے اسے تاریخی ماخذ کی طرح استعمال کرنا بڑی ستم ظریفی ہے اور یہ ستم ظریفی غاصب انگریزوں کی ستم گاری سے تاریخ ہند کے ساتھ بھی ہوئی ہو اور تاریخ اودھ کے ساتھ تو بے تحاشا۔

سرور کا دکھڑا کہاں تک رویا جائے۔ مختصراً یہ ملاحظہ فرمالیں کہ تیسرے بادشاہ محمد علی شاہ کے ساتھ یہ برتاؤ اس لیے نہیں ہوا کہ تب قلمدانِ وزارت نواب محمد ابراہیم شرف الدولہ کے پاس تھا اور سرور نواب

شرف الدولہ کے متوسلوں اور کاسہ لیسوں میں تھے۔ لیکن جب شرف الدولہ کسی طرح امجد علی شاہ سے سمجھوتے پر آمادہ نہیں ہوئے اور ریذیڈنٹ نے مکرر اشارہ کیا تو شرف الدولہ برطرف ہو گئے اور پھر سرور نے امجد علی شاہ کے نظم و نسق کی کوئی گت نہیں چھوڑی۔ امین الدولہ کے دور تک تو صورت حال یہی رہی لیکن علی نقی خاں کے تقرر کے ساتھ سلطان عالم واجد علی شاہ کے دربار سے سرور کی نیاز مندی کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ اس لیے زہر افشانی کی لے مدھم پڑ گئی۔

سرور کے سوانح کی طرف متوجہ ہونے سے پہلے ایک بات اور عرض کر دی جائے کہ آخر "تفضیح الغافلین" اور "فسانۂ عبرت" کے ہیچ کے نام رکھنے سے کیا اشارہ ملتا ہے۔ آپ میں ایسے حضرات بھی ہوں گے جن کی نظر اس پہلو پر ہوگی اور جن کی نظر نہیں ہے انھیں اب توجہ فرمانا چاہیے۔ کیا کوئی شخص جو بے لاگ تاریخ لکھنا چاہے گا ایسے نام سوچ سکتا ہے۔

سرور کی سکونت میں بڑی بحث ہے۔ زمانۂ ولادت بھی یقینی طور پر معلوم نہیں۔ ڈاکٹر نیر مسعود نے بھی قرائن کی بنیاد پر ان کا سال ولادت سنہ ۱۲۰۰ھ (۱۷۸۶ء) متعین کیا ہے۔ حکیم مظہر حسن کوڑوی کے اس بیان سے کہ سنہ ۱۲۸۵ھ انتقال کے وقت سرور کی عمر صرف پچاسی برس تھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ وطنی نسبت کو یہ راقم ناکارہ بے ثمرہ سمجھتا ہے۔ جب ڈاکٹر حنیف نقوی تسلیم کرتے ہیں تو تذکرہ نگاروں کی تحریر سے استدلال غیر ضروری ہے۔ عشق و مبتلا اور بے جگر انھیں خوش باشان شہر کانپور کہتے ہیں۔ باشندہ یا ساکن یا متوطن نہیں کہتے۔ یہ بات درست بھی ہے کہ وہ کانپور میں رہتے تھے۔ کون نہیں جانتا کہ ڈاکٹر حنیف نقوی سہسوان کے متوطن ہیں لیکن اگر موصوف کو خوش باش شہر بنارس کہا جائے تو اس میں غلط کیا ہوگا۔ یہ بات بھی عرض کرنے کی ہے کہ جب ساری روداد حیات کی نسبت سرور کا بیان تسلیم کرتے ہیں تو وطنی نسبت کے بارے میں کیوں نہیں؟ خوب چند ذکا نے خوش باش و ساکن کو مرادف سمجھ لیا ہوگا۔

سرور اپنے بیان کے مطابق ربیع الثانی سنہ ۱۲۴۰ھ (نومبر دسمبر ۱۸۲۴ء) میں تلاش معاش میں لکھنؤ سے کانپور پہنچے۔ یہیں اپنے معالج حکیم اسد کے کہنے سے فسانۂ عجائب لکھ کے بقائے دوام کی سیڑھی پر پہلا قدم رکھا۔ سنہ ۱۲۴۳ھ (۱۸۲۷ء) میں سرور لکھنؤ واپس آ گئے اور ۱۸۵۶ء تک وہیں رہے۔ سنہ ۱۸۴۳ء میں میر حسن رضوی کے مطبع حسینی محمود نگر سے اس کا پہلا اڈیشن شائع ہوا۔ سلطان عالم سنہ ۱۸۴۷ء میں تخت نشین اور سرور زمرۂ ملازمین میں داخل ہوئے۔ ۷ر فروری سنہ ۱۸۵۶ء کو جب غصب اودھ کا اعلانیہ "کمپنی بہادر" نے جاری کیا تو سرور کاشی نریش مہاراجہ ایشوری پرشاد نرائن سنگھ کے مہمان تھے۔ وہاں سے افتاں و خیزاں لکھنؤ پہنچے مگر حالات کی گھٹا ٹوپ اندھیاری میں جب "لکھنؤ میں دم گھبرانے لگا"، شہر کاٹے کھانے لگا تو حسن اتفاق سے کاشی نریش نے انھیں پھر یاد کیا چنانچہ ۱۶ر ذیقعدہ سنہ ۱۲۷۵ھ ۱۸ر جون سنہ ۱۸۵۹ء کو وہ لکھنؤ سے کانپور گئے اور اپنے متبنّیٰ سید احمد علی کے پاس قیام کر کے ۶ر ذی الحجہ/ ۸ر جولائی کو بنارس پہنچ گئے اور یہیں سنہ ۱۲۸۵ھ میں سفر آخرت پیش آیا اور یہیں مٹی ملی[۱۴]

فسانۂ عبرت کے طبع تازہ کے مرتب، اردو کے عظیم محقق و مبصّر پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کا دیباچہ کتاب میں فرمانا ہے۔ "فسانۂ عبرت اودھ کی شاہی کے خاتمہ کے بعد کتابی صورت میں آئی لیکن غور سے دیکھنے پر صاف پتہ چلتا ہے کہ اس کے مختلف حصّے مختلف زمانوں میں لکھے جا چکے تھے مثلاً شرف الدولہ کی مدح ص ۴۳، ۴۶ اُن کی برطرفی کے بعد ان کے بر سر حکومت پہنچنے کی دعا ص ۵۲، ۵۳ ... شاہی رئیس کی ایجاد ص ۱۱۰، ۱۱۵"[۱۵]

سرور نے شگوفۂ محبت، گلزار سرور اور سبستان سرور کی طرح فسانۂ عبرت کا حق تصنیف و اشاعت بھی مولوی محمد یعقوب انصاری لکھنوی کو بعوض نقد محبّت و امداد و اعانت وہبہ عمل کیا، ہبہ نامہ یکم رجب سنہ ۱۲۷۸ھ کو لکھا گیا۔ ہبہ نامہ کی تحریر کے تیئس ۲۳ برس بعد جمادی الثانیہ سنہ ۱۳۰۱ھ (اپریل ۱۸۸۴ء) میں یہ کتاب مولوی محمد یعقوب کے مطبع نجم العلوم کارنامہ لکھنؤ میں چھپی ... پہلے کے چھپے نسخے میں سرخیاں بہت کم تھیں عبارت پاروں میں منقسم نہ تھی۔ اوقاف کے نشانات معدوم تھے۔ یہ پتہ نہ چلتا تھا کہ کون سا بیان کہاں سے شروع اور کہاں پر ختم ہوتا ہے اور اکثر مقاموں پر کلام کا ربط اور عبارت کا مطلب سمجھنے میں دقّت ہوتی تھی۔ یہ سب نقائص درست کر دیے گئے ہیں۔ بہت سے لفظ

مشکوک تھے جن میں سے بعض کی تصحیح کر دی گئی ہے اور بعض مجبوراً بجنسہ نقل کر دیے گئے ہیں۔ بعض واقعات کی تاریخیں غلط تھیں اور بعض جگہ ہجری اور عیسوی تاریخوں میں مطابقت نہ تھی جہاں تک ممکن ہوا ان کی تصحیح و تطبیق کر دی گئی ہے۔ کہیں کہیں ایک بیان کے دو ٹکڑے کے بیچ میں کوئی دوسرا بیان داخل تھا اب وہ ٹکڑے یکجا کر دیے گئے ہیں اور ایسا کرنے سے ایک آدھ فقرہ جو بے ضرورت ہو گیا تھا حذف کر دیا گیا ہے مثلاً آمدم برسر مطلب، ناتمام مقدمہ سنو، وغیرہ۔ کتاب کے ابتدائی چار صفحوں میں کچھ اعتقادی باتیں اشاروں میں کہی گئی تھیں۔ جن کو تلمیحوں کی کثرت نے چیستاں بنا دیا تھا اور کچھ دنیا کی دو رنگی کا تخئیلی بیان تھا۔ یہ چیزیں کتاب کے موضوع سے کوئی تعلق بھی نہ رکھتی تھیں اس لئے حذف کر دی گئیں۔ آخری چند صفحوں میں مولوی امیر علی کے جہاد کا بیان تاریخی انداز کے بجائے جذباتی انداز میں لکھا گیا تھا وہ بھی حذف کر دیا گیا۔

مصنف نے شاہی رسم کی ایجاد کے بیان میں ایک مستقل تحریر حمد و نعت اور مدح بادشاہ و وزیر کے ساتھ پیشتر لکھی تھی، جس کو بجنسہ کتاب میں شامل کر دیا۔ اب اس کا تمہیدی حصہ الگ کر کے کتاب کے آخر میں ضمیمہ کے طور پر لگا دیا گیا ہے۔ اسی طرح جشن نوروز کی تہنیت میں طولانی نثر اور تین عرضداشتیں جو کتاب میں جگہ جگہ شامل تھیں ان کو بھی ضمیموں میں جگہ دی گئی ہے۔

اب یہ کتاب نئی ترتیب اور موجودہ تہذیب کتابت کے ساتھ پیش کی جاتی ہے۔ امید ہے کہ اس کا مطالعہ دلچسپ بھی ہوگا اور معلومات میں اضافہ بھی کرے گا۔[۱۶]

● منشی رام سہائے تمنا لکھنوی کی یاد تازہ اور اہمیت قائم تو ان کی کتابوں احسن التواریخ، افضل التواریخ اور اشرف التواریخ سے ہے۔ یہ کتابیں خصوصاً افضل التواریخ اب تک تاریخ اودھ کے معروف اور مستند ماخذ کے طور پر استعمال ہو رہی ہیں۔ لیکن تمنا ایک بسیار نویس اہل قلم اور درجنوں کتابوں کے مصنف شاعر اور صحافی تھے۔ ان کے تمام کارنامے اگر آج بسہولت دستیاب ہوتے تو بلا شبہ آج کے تحقیق کاروں اور طلبا کو ان کا نقطۂ نظر سمجھنے میں سہولت ہوتی اور وہ تمنا کے بیانات کو اسی احتیاط سے دیکھتے جس احتیاط و تامل سے دیکھے جانے کے مستحق ہیں۔

تمنا ۱۸۵۴ء میں پیدا ہوئے تھے[۱۷] اور سولہ برس کی عمر میں انسپکٹر سررشتہ تعلیم اودھ کے دفتر میں کلرک ہو گئے یہیں ان کی آبائی صلاحیتوں پر جلا ہوئی جن میں علمی اور شعری روایات بھی شامل ہیں اور یہیں ان کو وہ انگریز بھگتی ملی جس نے اودھ کی تاریخ کو انگریز پسند بنایا۔ یہ سمجھنے کے لیے کہ سکسینہ کایستھوں کے اس خانوادے میں منشی تمنا جس کی ایک نمایاں فرد ثابت ہوئے۔ ریاست اور علم دونوں جمع تھے۔ ہم اس مضمون کو طوالت سے بچانے کے لیے شجرے کو قطع کرتے ہیں۔ لیکن ان کی اہلیہ کشن پیاری کا ذکر ضروری ہے۔ جن سے تمنا کی شادی دس سال کی عمر میں ہوئی تھی اور خود کشن پیاری آٹھ سال کی تھیں۔ اور شاعرہ بھی تھیں ان کے ذوقِ شعر نے تمنا کے فکر و سخن کو ارتقار کا ہموار راستہ مہیا کیا۔ سفرِ حیات میں تو کشن پیاری وفادار اور ہم مذاق رفیقہ تھیں ہی سفر آخرت میں بھی بہت پیچھے نہیں رہیں اور اپنے باکمال شوہر کی وفات کے پچیسویں دن ہی وہ بھی چل بسیں۔

اپنی مثنوی یادگار ریاست اودھ، مطبوعہ ۱۸۷۷ء میں خود تمنا اپنا تعارف یوں کراتے ہیں۔ "منشی رام سہائے تمنا خلف منشی پورن چند ابن ایشوری پرشاد رئیس آبائی ساکن محلہ نوبستہ"، منشی تمنا اپنے دادا کے تخلص کا ذکر کرتے ہیں نہ شاعری کا۔ اگرچہ شعاعی کے رقعات مرتب ہو چکے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمنا کی نظر میں علمی روایات سے زیادہ "ریاست آبائی" کی اہمیت ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ تمنا کی طویل عمر تمام تر علمی سرگرمیوں میں گذری ۳۲ سال کی عمر میں ۱۸۸۶ء تک وہ ۴۲ نثری و شعری تخلیقات کر چکے تھے جنوری ۱۸۸۹ء میں تمنا نے اپنی نظم "مفید التراکیب"، استفادہ طلبائے مدارس ورنیکولر کے واسطے بزبانِ سلیس و محاوراتِ نفیس عمدہ روزمرہ اور صاف بول چال میں بشمول مطالب ضروری زینت ترتیب و تنظیم دی۔ اس کتاب کے آخر میں "تمت" کے بعد فہرست تصنیفات تمنا میں ۴۲ کتابیں مندرج ہیں۔

مدرسہ سلطان المدارس لکھنؤ کے کتب خانہ کے ذخیرۂ آغا ابو صاحب مرحوم میں ان کتابوں سے ۱۰ کتابیں ایک ساتھ مجلد ہیں۔ الف

میں سے بس چند پر تجزیہ خیز گفتگو کے لیے نگاہ ڈالیں گے۔

① نظمِ دلپذیر

یہ تاریخی نام ہے جس سے سمبت ۱۹۳۶ء بر آمد ہوتا ہے۔ یہ بھی ۱۶ صفحات کا رسالہ ہے جس میں ۴۲ بند کا ایک مسدّس ہے۔ سرورق کی لوح سے پتہ چلتا ہے کہ "مشعر حالات جناب مستطاب ہز ہائی نس دی آنریبل مہاراجہ سر دگ وجے سنگھ بہادر کے ایس۔ سی ایس آئی دام اقبالہ ہے۔ یہ مہاراجہ بلرام پور ہیں۔ برطانیہ کے مشہور وفادار جنھوں نے ستائش گروں کا وسیع حلقہ اپنے گرد جمع کر لیا تھا۔ پریس قائم کر کے سید آغا حسن نامی عرف میرن رضوی لکھنوی مشہور خطّاط کے خدمات حاصل کر لیے تھے بلکہ اپنی فضائل نگاری کے لیے انھیں اہلِ قلم بھی بنا دیا تھا۔ میرن رضوی نے حسن التواریخ کے نام سے مہاراج کے حالات میں ایک کتاب لکھی جو مہاراج کے مطبع جنگ بہادر سے شائع ہوئی

مہاراجہ نے اپنے مناقب نگاری کی لے اتنی اونچی کر دی تھی کہ مرزا غالب نے دبدبۂ سکندری کا اپنے نام آنا بند کرا دیا تھا۔ مالک مطبع حسنی کو لکھتے ہیں:-

"شفقی اور مکرمی محمد حسن خاں صاحب کو غالب آزردہ دل کا سلام پہنچے۔ آج بھی آپ کا ایک خط آیا۔ کئی اخبارات آپکے پھیرے۔ کئی خطوط آپ کے پھیرے اور آپ اخبارات بھیجتے جاتے ہیں۔ الٰہی آپ کا خط، خط تھا یا کوئی جھوٹ کی پوٹ بیش تر مجذوبوں کی بڑ اور جو کچھ سمجھ میں آیا وہ غلط اور دروغ اور جھوٹ، یہ محض غلط ہے اور مطبع حضور کا ہو اور تم ہیتم حضور کی طرف سے۔ اللہ اللہ دگ وجے سنگھ کی تعریف میں کہیں سارا ایک صفحہ، کہیں سارا ایک ورق اور اپنے والیٔ ملک اور اپنے بادشاہ یعنی امیر المسلمین نواب کلب علی خاں بہادر کے نام کے آگے یا نام سے پہلے کوئی دو تین لفظ تعظیم کو لکھتے ہو اور بس۔ اور اس قباحت کو نہیں سمجھتے کہ اگر یہ اخبار حضور کی طرف سے ہو تو گویا دگ بجے سنگھ کی تعریف بھی حضور سے ہوگی۔

ہندوستانی عمل داری میں وہ ایک زمیندار مال گذار تھا اب گورنمنٹ ہند نے اس کو جاگیر دار مستقل کر دیا۔ [19]

اِس اقتباس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مہاراجہ نے اپنی حکمتِ عمل اور داد و دہش سے کس قدر مدح سرا اکٹھا کر لیے تھے۔ مرزا غالب کے ایسے شخص تک سے، جو مدح سرائی میں خود بھی بہت محتاط نہ تھے برداشت نہ ہو سکا۔ اس خط میں آگے چل کر غالب نے دو جملے لکھے ہیں جس سے یہ سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے کہ منشی تمنا کے عہد میں وہ طبقہ جو ہر حال میں خوش اور ہر حکومت میں مطمئن رہنے کا ہنر جانتا تھا کس قدر فعّال تھا۔ ...... اس لیے اس معاملہ کو تمنا کی تنہا کمزوری نہیں سمجھنا چاہئے۔ ایسے وقت تداخل میں موقع شناس اس پر چل ہی پڑتے ہیں غالب آگے اور تلخ نوا ہو جاتے ہیں:

نواب محمد علی خاں رئیس ٹونک کا ہر اخبار میں ایک مرثیہ لکھتے ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم طرح طرح سے اطراف و جوانب کے رئیسوں سے بھیک مانگتے ہو۔ بھائی! ایک در گیر و محکم گیر۔۔۔۔ [20]

ہو سکتا ہے کہ بھیک مانگنے کی بات کچھ سخت ہو لیکن یہ تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ منشی تمنا یا منشی محمد حسن یہ سب صلے کی تمنا اور ستائش سے بے پرواہ ہو کے کر رہے تھے۔ منشی محمد حسن کی نسبت تو نہیں کہا جا سکتا لیکن تمنا کے بارے میں معلوم ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ان کے وسائل تباہی کا شکار ہو گئے تھے اور پورے کنبہ کا بوجھ صرف تمنا کی کمائی پر آ پڑا تھا۔ [21]

ایسی صورت میں تماشائے اہلِ نعم دیکھنا ان کی مجبوری بھی ہو سکتی ہے اور مجبوری اور معروضی تاریخ نگاری جمع ہو ہی نہیں سکتیں۔

② رسالہ ضروریاتِ ہند

یہ رسالہ دسمبر ۱۸۸۴ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ پہلا رسالہ ہے جس میں کلارک محکمہ جناب صاحب انسپکٹر بہادر، کے وصف سے منشی تمنا کا تعارف کرایا گیا ہے۔ سو صفحوں کی یہ کتاب نثر میں ہے مگر سجاوٹ کے لیے کہیں کہیں نظم کے ٹکڑے بھی جوڑے گئے ہیں۔

اس میں ہندستان کی ۱۵ ضرورتیں بیان کی گئی ہیں۔ کتاب بہت واضح طور پر واعظان فرنگ کے نصائح کا پرتو معلوم ہوتی ہے۔

تمنا بعد میں ترقی کر کے ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے تک پہونچے اور ضلع اناؤ میں تعینات رہے۔ وہیں سے ۱۹۱۱ء میں پنشن لی۔[۲۲]

اس کے بعد تمنا نے اپنا ماہنامہ دربار، جاری کیا تھا اور کتابوں کے مشہور تاجر لانگ مین گرین اینڈ سنز کے یہاں ملازمت کر کے دلی میں قیام کر لیا۔ چونکہ تمنا کو ملازمت کی وجہ سے دورے پر جانا پڑتا تھا۔ اس لیے پرچے کی دیکھ بھال ان کے چھوٹے صاحبزادے ڈاکٹر گوری سہائے اور برادر زادے منور لکھنوی کے ذمے تھی۔

منور لکھنوی، آنق صاحب کے صاحبزادے تھے اور ان کے دم تک اس خانوادہ شعر و ادب کی روایت پانچ پشتوں تک چلی۔ فرماتے ہیں ؎

شاعری سے نہ منور کو ہو کیوں کر رغبت
پانچ پشتوں سے یہی شوق چلا آتا ہے

جناب نادم سیتاپوری بتاتے ہیں کہ تمنا نے ایک ماہانہ رسالہ گلدستۂ سخن کے نام سے ۲۴، جولائی ۱۸۷۶ء سے نکالا تھا اور ۱۰ ستمبر ۱۸۸۲ء سے مہر ظرافت کے نام سے ایک مزاحیہ ہفتہ وار بھی تمنا کی ادارت میں نکلا تھا۔[۲۳]

تمنا کے شعری کارناموں میں قابل ذکر چیز رباعیات عمر خیام کا ترجمہ ہے بلکہ کہہ سکتے ہیں کہ منظوم شرح ہے۔ صورت اس کی یہ ہے کہ پہلے چار مصرعوں میں لفظی ترجمہ کرنے کی سعی کی ہے اور بعد میں مفہوم کی تشریح قطعہ میں بطور نمونہ ایک رباعی ملاحظہ فرمائیں۔

خیام

جملہ رفتگان ایں راہ دراز	باز آئندہ کو کہ بما گوید راز
زنہار ازیں سرا چہ از روئے نیاز	چیزے نہ گذاری کہ نمی آئی باز

ترجمہ

اس منزل دور کو جو پہونچے جا کر	کچھ راز کہا نہ واپس آ کر دم بھر

ہرگز ہرگز سرائے فانی میں بھی
کچھ چیز نہ چھوڑ دو، واپس آنا نہیں گھر

تشریح قطعہ

مرا جب آدمی پھر اس سے ملنے کی ہوس کیا ہے
نہ تم ہمدرد ہو جس کے تو پھر وہ دور درس کیا ہے
تمنا بعد مردن واپسی جب غیر ممکن ہے!
ضرورت کیا ہے چھوڑے کوئی شے یاں پیش و پس کیا ہے

یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ تمنا کے کارناموں کی مکمل تلاش و تحقیق کی ضرورت ہے۔ اسی ذیل میں ان کی ادبی و افادی اہمیت کا تعین بھی ہو سکتا ہے لیکن ان کے رنگ و آہنگ کو دیکھتے ہوئے ان کی تاریخی تصنیفوں پر اعتماد کرنا، خصوصاً اودھ کی تاریخ کو معروضی سمجھنا خلاف احتیاط ہوگا۔ اس کثیر التصانیف نثار شاعر و صحافی نے ۱۹۲۲ء میں حیات فانی سے منہ موڑا۔ افسوس کہ وفات کی تاریخ معلوم نہ ہو سکی۔ ان کے صاحبزادے نے وفات کے آٹھ سال کے اندر ۱۹۴۰ء میں حالات ترتیب دے کر شائع کئے۔ لیکن تاریخ وہ بھی ذکر نہ کر سکے۔

● اس قسط میں بھی راجہ درگا پرشاد مہر سندیلوی کا ذکر کر کے سلسلۂ کلام ملتوی کرتا ہے۔

ڈاکٹر شکیل احمد صدیقی (اب مرحوم جوانا مرگ) نے اپنے مجمل مگر معلوماتی مضمون " اودھ کا ایک قصبہ سندیلہ " میں ان صاحبان کمال کی فہرست دی ہے۔ جو خاک سندیلہ سے اٹھے۔ صدیقی صاحب نے مختلف طبقات قائم کر کے ان کے ذیل میں نام مندرج کیے ہیں۔ راجہ درگا پرشاد کا نام چار طبقوں میں مذکور ہوا ہے جس میں سندیلہ کی تاریخ نگاری میں خاص طور سے جگہ ملی ہے۔

...راجہ صاحب کے مورخ ہونے میں کوئی کلام نہیں ہے۔ انھوں نے تاریخ کی کتابیں لکھی ہیں لیکن مورخ سے بڑھ کر ان کی حیثیت شاعر کی ہے۔ ان کی شاعری اس قصبہ کے لیے باعث فخر ہے۔ انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں اس ملک کے فارسی گو شعرا میں ان کا شمار صف اول میں کرنا چاہئے۔ ان دو صدیوں میں فارسی کے ایسے بلند پایہ شاعر کم ہی ہوئے ہیں۔ ان کی فارسی دانی کو ایرانیوں تک نے سراہا ہے۔ چنانچہ ذکار الملک وزیر صیغۂ علمی سلطنت ایران نے ان کی کتاب "گلستان ہند" پر ریویو کے سلسلے میں لکھا تھا کہ

بلندی مقام آں بخت یار را در دانستن فارسی معلوم می نماید. لیکن مورخ اور شاعر دونوں کے راستے الگ الگ ہیں. مورخ شاعری میں حقائق کی جستجو کرتا ہے برخلاف اس کے شاعر حقائق کو مبالغہ کی چاشنی کے بغیر کم ہی بیان کرتا ہے. اس لیے ایک عمدہ شاعر اعلا درجے کا مورخ نہیں ہو سکتا.

راجہ صاحب انگریزوں کے بڑے مداح تھے. ہمیں یہاں اس سے بحث نہیں کہ راجہ صاحب نے انگریزوں کی شان میں جو قصیدے لکھے ہیں وہ قابلِ ستائش ہیں یا موجبِ حرف گیری. البتہ یہ ضرور ہے کہ اگر تاریخ اُن سے محفوظ رہتی تو اچھا رہتا.....،،

درگا پرشاد کی ولادت سندیلہ میں ہوئی جہاں ان کے ایک بزرگ رائے کنور سین کے سندیلہ و ملیح آباد کی چکلہ داری پر عہد نواب شجاع الدولہ (۱۷۵۴ - ۱۷۷۵) میں سرفراز ہونے کے بعد اس خاندان کی سکونت ہوگئی تھی. درگا پرشاد کی ولادت ۱۸۴۶ء میں ہوئی تھی.

درگا پرشاد کی تعلیم پانچ سال کی عمر میں مکتب سے شروع ہوئی ابھی مروجہ نصاب کی تحصیل میں مشغول تھے کہ راجا گووردھن لال اور ان کے صاحبزادے کنور جمعیت رائے کا انتقال ہو گیا اور خاندانی کوائف تعطل و تفرقہ کا شکار ہو گئے. اس سے مہر کی تعلیم میں بھی خلل پڑا. جب معاملات رو براہ ہوئے اور یہ خاندان جو علاقہ اور عہدہ سبھی سے محروم ہو کر آوارہ وطن ہو گیا تھا. پھر سندیلہ واپس آیا. اس کے بعد ہی غصبِ اودھ کا واقعہ پیش آگیا. نئے آقاؤں نے قدیم علاقہ کے چند دیہات اور باقی کے معاوضہ میں زرِ نقد کی دہانید کی. یہ مراحل طے ہو ہی رہے تھے کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی لہر آگئی. اور اس میں مہر کے والد راجہ دھنپت رائے نے انگریزوں کی وفاداری کے بڑے جوہر دکھائے. فرنگی جوہر شناسوں نے پوری قیمت لگائی. اپنا پورا علاقہ تو ملنا ہی تھا. ضلع لکھیم پور کھیری کے کسی انقلابی رئیس کا ضبط شدہ علاقہ سرسوا بھی بطور انعام ملا. اپنے اس کارنامے سے راجہ دھنپت رائے جعفر ثانی بن گئے. ان کے قطعہ تاریخ وفات میں شمس الشعرا سید مقصود علی پہانوی نے ان کے سیرت کے اس پہلو کو خاص طور سے نمایاں کیا. نہیں کہہ سکتے کہ یہ طنز و تعریف کی راہ سے یا تاکید الذم بما یشبہ المدح کی صورت میں تھا. شمس الشعرا اس خانوادے کے متوسل تھے اور پھر معاملت ایسے نکتہ رس، معنی یاب، سخن سنج سے تھی. دو شعر ملاحظہ فرمائیے.

خوشا ممدوح دریا دل کرم گستر سحابانی
وحید العصر دھنپت رائے راجہ جعفر ثانی
رقم زد کلکم اے مقصود سالِ انتقال او
جہاں دایم بدرد از انتقالِ حاتم ثانی
سبت ۱۹۲۴

انقلابی تحریک کے سرد پڑ جانے یا سامراجی اصطلاح میں غدر فرو ہونے کے بعد مہر کی تعلیم کا سلسلہ پھر سے شروع ہوا چودھری محمد ایراس کام کے لیے متعین ہوئے جو خاندان کی پریشانیوں کے دور میں بہت مددگار ثابت ہوئے تھے. اس کے علاوہ راجہ دھنپت رائے نے جو بقول مہر خود بڑے صاحبِ فضل و کمال تھے. اپنے ولی عہد کی تعلیم و تربیت میں دلچسپی لی.

اس طرح مہر کی فارسی تعلیم کا سلسلہ رہا. ان کے پاس عجم کے شعرا و فضلاء کی بھی آمد و رفت رہتی تھی. جس سے ان کے ذوق کو اور بھی جلا ہوئی. جب مہر نے محسوس کیا کہ " دریں روز از تغیّر اوضاعِ روزگار زبان فارسی از پایہ اعتبار افتادہ و زبانِ اردو آب و رنگے تازہ یافتہ،، تو اردو میں بھی تحصیلِ کمال کی کوشش کی. مولانا ظہور حسن لکھنوی سے تلمذ اختیار کیا. اس طرح اردو شعر گوئی کا مذاق پیدا ہوا. مہر کو بحکم سرکار انگریزی کی بھی تعلیم دی جا رہی تھی. یہ اشتغال تین سال تک رہا تھا کہ ۱۸۶۷ء میں اُن کے والد کا انتقال ہو گیا اور مہر مشاغل ریاست کے ہجوم میں ایسا کھوئے کہ انگریزی تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا. لیکن فارسی کا ذوق اُن کا جزوِ عنصری بن گیا تھا اور اس سے ان کی شیفتگی تمام عمر رہی اور اس زبان کے ذریعہ انھوں نے علم و ادب کی بڑی مایہ ناز خدمتیں کیں اور ہندوستانیوں کی فارسی دانی کا پایہ ایران تک مسلم ہوا. ان کی جن کتابوں کا حال راقم السطور کو معلوم ہو سکا ہے ان میں سے بیشتر فارسی میں ہیں. وہ کتابیں یہ ہیں:

گلستانِ ہند، بوستانِ اودھ، حدیقۂ عشرت، مخزنِ اخلاق،

مثنوی مہر تاباں، مثنوی مہر الفت، تاریخ اجودھیا، پند دل پسند اور تواریخ سندیلہ۔ ڈاکٹر مسعود حسن رضوی ردولوی، ہسٹری آف انڈیا کا ذکر کرتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ یہ گلستان ہند کا انگریزی نام ہے یا اس کا ترجمہ۔ ڈاکٹر مسعود اس فہرست میں گلستان ہند کا نام نہیں لیتے۔ اس سے معاملہ دریافت طلب بن گیا ہے۔ ڈاکٹر مسعود ایک انگریزی نام، "ہسٹری آف فرسٹ ورلڈ وار" کا لیتے ہیں۔ اس کی بھی تصریح نہیں ہے کہ یہ کتاب کس زبان میں ہے۔

ڈاکٹر صدیقی مرحوم کا بیان ہے کہ تواریخ سندیلہ ۱۹۱۵ء میں کارونیشن پریس سے نکلی۔ پند دل پسند، جو نظر قاصر سے گذر چکی ہے ۱۹۰۲ء ۱۳۲۶ھ میں شائع ہوئی تھی۔ یہ سوال تحقیق طلب ہے کہ ان بارہ برسوں میں کیا مہر کا سریع السیر قلم آرام کرتا رہا یا کچھ اور چیزیں ان کے قلم سے نکلیں۔ ہو سکتا ہے کہ تواریخ سندیلہ میں دوسرے مصنفات کی فہرست دی گئی ہو۔

پند دل پسند میں مہر نے بتایا ہے کہ وہ مہابھارت کے ترجمہ میں مشغول ہیں اور دعا کی ہے کہ "خدا ایش بسرانجام رساند"۔ کچھ خبر نہیں کہ یہ دعا قبول اور کارنامہ مکمل ہو سکا یا نہیں! ڈاکٹر مسعود ردولوی بتاتے ہیں کہ یہ منظوم ترجمہ نامکمل رہا اور سرانجام کو نہیں پہونچا۔

ہو سکتا ہے کہ ان کا پایۂ شاعری، پایۂ تاریخ نگاری سے بلند تر ہو۔ جیسا کہ ڈاکٹر صدیقی کی رائے ہو۔ لیکن تاریخ نگار کی حیثیت سے بھی ان کی جو جگہ ہے اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ ایودھیا کی اہمیت محتاج بیان نہیں مگر اس کی تاریخ نگاری میں اولیت کا سہرا مہر ہی کے سر رہا کیونکہ شری امرت لال ناگر کا کہنا ہے:-

"ایودھیا کی تاریخ لکھنے کی لگن راجہ دشرتھ کے وزیر سمنت کی اولاد اودھو داسی لالہ سیتا رام جی کے علاوہ اور بھلا کس کو ہو سکتی تھی!"

اس کا مطلب یہ نکلا کہ ہندی میں اودھ داسی لالہ سیتا رام جی سے پہلے کسی نے اس موضوع پر اتنا تفصیلی کام نہیں کیا تھا۔ معلوم ہے کہ اودھ داسی جی کی اس موضوع پر پہلی تقریر ۱۹۲۰ء کے پاس کی ہے۔ مہر کی کتاب ۱۹۰۲ء میں شائع ہو چکی تھی۔ راقم السطور کو اودھ داسی کی کتاب "ایودھیا کا اتہاس" دیکھنے کا شرف بھی ملا ہے اور اس میں کچھ بھی ایسا نہ ملا جو مہر کی کتاب سے الگ یا نیا محسوس ہوتا۔ اس طرح سندیلے کی تاریخ جن حضرات نے لکھی سب کی مساعی قابل تحسین ہیں لیکن منظر عام پر سب سے پہلے مہر ہی کی کاوش آئی اور اس اعتبار سے یہاں بھی "الفضل للمتقدم" مہر ہی کا حصہ ہے۔

آپ نے ابھی ملاحظہ فرمایا کہ تازہ مسلط سفید فام آقاؤں کی خدمت مہر کے والد نے اس طرح کی کہ "جعفر از بنگال" سے تشبیہ پائی۔ مہر کا مسلک بھی یہی رہا۔ بلکہ اور دوسرے حکام کی مدح سرائی پر ہی اکتفا نہیں کی پریس قائم کیا تو اسے صاحب بہادر کے نام سے منسوب کیا۔ کون پریس اور کون سرائے۔ مسٹر ٹی جی کون ڈپٹی کمشنر ہردوئی کے ہی نام سے منسوب کئے۔ اسی پر بس نہیں۔ راجہ صاحب اپنے سعادت کیش فرزندوں کو بھی یہی سبق پڑھاتے ہیں:-

"پند دل پسند" میں ایک عنوان ذکر "حقوق بادشاہ و حاکم وقت" کا بھی قائم کیا ہے۔ اس میں فرماتے ہیں۔

بر رعیت حق سلطاں بس بود	خدمت او لازم ہر کس بود
حافظ جان بنی آدم است	قبلۂ دوراں شاہ عالم است
پس ترا باید کہ حق شہ بداں	فرق خود را خوش بنہ بر آستاں
انچہ خود کردم بتو آموختم	شمع دانش در رہت افروختم

حکومت حامی طبقہ کی عام کمزوریوں سے مہر کافی حد تک محفوظ بھی تھے جس دور میں برا تمام جانبدارانہ تاریخ نگاری ہو رہی تھی اور کرائے کے مصنف تلاش کئے جا رہے تھے۔ اس وقت بھی مہر نے اپنے قلم سے شہنشاہان ہند یا فرماں روایان اودھ کے دامن کو داغدار بنانے کی کم سے کم کوشش کی ہے۔ اس وقت کے حالات دیکھتے ہوئے یہ بسا غنیمت ہے۔ اتنا ہی نہیں شاہان و شہزادگان ہند سے اپنے رشتۂ دیرینہ و عقیدت کے اظہار میں کوئی تکلف نہیں کیا۔

اس مجموعۂ کمالات نے ۱۹۲۰ء میں جان جان آفریں کو سپرد کی۔[۲۶]

اب آئندہ قسط میں منشی نول کشور، حکیم نجم الغنی خاں، مولوی رئیس احمد جعفری ندوی اور پروفیسر مرزا علی اظہر برلاس کے بارے میں گفتگو کا قصد ہے۔ بشرطیکہ ادارہ نیا دور ضرورت محسوس کرے

ویسے ہمارے تازہ دم قلمکاروں کو یہ مورچہ سنبھال لینا چاہئے اور ہمارے جرائد کو ان مضامین کا خیر مقدم کرنا چاہئے۔

حاشیے

1. محمد عرفان خاں، مضمون، تاریخ نگاری اور اس کی مشکلات۔ ماہنامہ جامعہ نئی دہلی۔ بابت نومبر ۱۹۷۶ء
2. سبط محمد نقوی۔ امجد علی شاہ ص ۲۵۵، بحوالہ سندر لال۔ بھارت میں انگریزی راج ج ۱ ص ۱۱
3. ڈاکٹر ثروت علی، تاریخ آصفی۔ اردو ترجمہ تفضیح الغافلین دہلی۔ ۱۹۳۸ء ص ۱۲
4. وہی ج
5. وہی ص ۱۴
6. امجد علی شاہ ص ۲۵۷۔ بحوالہ رئیس احمد جعفری ندوی۔ واجد علی شاہ اور ان کا عہد ص ۵۹۵
7. وہی بحوالہ ڈاکٹر جی ڈی بھٹناگر۔ اودھ انڈر واجد علی شاہ ص ۱۳ حاشیہ ص ۱۱
8. سید رئیس آغا مدیر عجم، مسودہ مضمون۔ کمال الدین حیدر، مخطوطہ تاریخ اودھ، مضمون نگار کا دستی مسودہ۔
9. امجد علی شاہ ص ۲۵۸ بحوالہ مقالات سلیمان، دار المصنفین اعظم گڑھ ص ۳۹۰۔
10. مرزا رجب علی بیگ سرور، فسانۂ عبرت۔ کتاب نگر لکھنؤ ص ۹
11. وہی ص ۱۶
12. امجد علی شاہ ص ۶۹ بحوالہ اودھ کی لوٹ ص ۱۳۱
13. فسانۂ عبرت ص ۷
14. یہ ساری اطلاعیں ڈاکٹر حنیف نقوی کے مضمون، مقدمہ کلام سرور مشمولہ دوماہی اکادمی، لکھنؤ بابت مارچ۔ اپریل ۱۹۸۸ء سے بصد تشکر مستعار ہیں۔ افسوس ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا وہ مضمون جس میں سرور کے سفر عاقبت سے بحث ہے وہ فی الوقت دستیاب نہ ہو سکا۔
15. فسانۂ عبرت۔ ص ۷
16. وہی ص ۸
17. اعلام و انکار ۱۹۸۲ء بحوالہ گنپت سہائے سری واستو، اردو شاعری کے ارتقا میں ہندو شعراء کا حصہ ص ۴۷۹
18. وہی ص ۵۴ بحوالہ مالک رام معاصرین ج ۱ ص ۲۰۸
19. وہی ص ۵۷ بحوالہ محمد اکرام، غالب نامہ ص ۲۲۷
20. وہی ص ۵۸ بحوالہ غالب نامہ ص ۲۳۸
21. وہی ص ۵۸ بحوالہ گوری سہائے فرزند تمنا، انتخاب کلام تمنا مع مختصر تبصرہ ص ۵
22. وہی ص ۶۵ بحوالہ گنپت سہائے۔
23. وہی ص ۶۱ بحوالہ ہفت روزہ پیام اسلام لکھنؤ مورخہ یکم فروری ۱۹۶۰ء مضمون، انیسویں صدی میں لکھنؤ کی اردو صحافت
24. وہی ص ۳۹ بحوالہ ڈاکٹر شکیل احمد صدیقی، ضمیمہ روزنامہ قومی آواز لکھنؤ۔ مورخہ ۲۳ دسمبر ۱۹۷۳ء
25. ڈاکٹر مسعود حسن رضوی ردولوی۔ مضمون، تعلقداران اودھ اور ان کے ادبی خدمات مشمولہ ضمیمہ اودھ نمبر نیا دور لکھنؤ۔ بابت جون ۱۹۹۴ء ص ۲۲
26. اعلام و انکار ص ۵۸ بحوالہ گوری سہائے ص ۵

> "اس پیرایۂ بیان سے لطف اندوز ہونے کے لئے کلاسیکی ادب سے شناسائی اور تربیت یافتہ ذوق کی بھی ضرورت ہے اور اس معاشرے کے آداب و اطوار سے واقفیت بھی ضروری ہے ..... نگارش کے اس انداز اور ترصیع کے اس فن اور حسن کو سمجھنے کے لئے ذہن کا تربیت یافتہ ہونا اور کلاسیکی اسالیب سے واقفیت ضروری ہے ورنہ یہ سب بے جان لفظوں کا کھیل نظر آئے گا۔"
>
> ——— رشید حسن خاں
>
> مقدمہ فسانۂ عجائب، ص ۶۶-۶۷

حسن واصف عثمانی

کلن کی لاٹ، حیدر مرزا روڈ، لکھنؤ

لکھنؤ کا گم شدہ دسترخوان : چند پہلو

بازیافت نہ سہی، بازخوانی فرض

کھانا، کھلانا اور پکانا روزمرّہ کی زندگی کا ایک حصہ ہے جس کا مقصد صرف شکم سیری نہیں ہے نہ پیٹ بھرنے اور بھرلینے کا ڈھنگ ہے بلکہ یہ ایک ثقافتی عمل ہے اور کام و دہن کی تربیت سے وابستہ اور حواس خمسہ کی تہذیب کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ہر ایک ثقافت زندگی کے ہر پہلو اور زندگی کی ہر سطح پر جمالیات کا اپنا منفرد شعور پیدا کرتی ہے۔ کھانا خوش رنگ، خوشبودار اور خوش مزہ ہوتا ہے تو وہ شکم سیری ہی نہیں کرتا بلکہ لذّت اور ذائقہ کے اس معیار پر کھرا اترتا ہے جو کسی نہ کسی مخصوص ثقافت نے صدیوں کی روایتوں کے سلسلے کے بعد بنائے ہوتے ہیں۔ اس کی افادیت شکم سیری کو اہمیت نہیں دیتی بلکہ کھانے کھلانے کے سارے عمل کو انھیں خصوصیات اور نفاست و لطافت سے ہم آہنگ کرتی ہے۔ اس صدی میں مغربی دنیا کے ایک عظیم دانش ور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے اسی لیے یہ بصیرت انگیز بات کہی ہے کہ جب کسی تہذیب پر زوال آتا ہے تو سب سے پہلے اس کا دسترخوان اُلٹتا ہے۔

لکھنؤ کی تہذیب کے زوال میں کوئی شک نہیں۔ یہ المیہ بھی ایک کڑوی سچائی کی طرح سب کو تسلیم ہے۔ پھر کیا تعجب کہ لکھنؤ کا دسترخوان بھی اُلٹ گیا ہے۔ یہ دسترخوان صرف شاہی دربار، امیروں کے محلوں اور رئیسوں کے درباروں اور ڈیوڑھیوں تک محدود نہیں تھا شاہی دسترخوان بھی تھے اور رئیسوں کے دسترخوان بھی تھے مگر گلی کوچوں، بازاروں اور عام گھروں میں بھی لکھنؤ کا دسترخوان اپنی انفرادیت کے ساتھ موجود تھا۔ یہ ایک مشترکہ سماجی عمل تھا۔ بازار میں شیرمال، کباب، قورمہ، پلاؤ اور فیرینی کا رواج تھا۔ طباخی کے فن کاروں کا ایک طبقہ تھا جس نے نمکین اور میٹھے کھانوں کی تیاری اور فراہمی میں اپنی فن کاری کے کمال دکھائے تھے وہ دربار، بازار اور گھروں کی ضرورتوں کو یکساں مہارت سے پورا کرتے تھے۔ ان فن کاروں کا احترام سماجی اور تہذیبی زندگی میں شامل تھا۔ لکھنؤ میں ان کی شہرت اور ان کے نام اہمیت سے لینے اور یاد رکھنے کی روایت کا پتہ رجب علی بیگ سرورؔ اور عبدالحلیم شررؔ کی تحریروں سے بھی ملتا ہے۔ اور اس کی جانب بے ساختہ اشارے پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ نے بھی کیے۔ شعری اور نثری کتابوں میں اس کا براہ راست کم لیکن بالواسطہ حوالہ اور تذکرہ بہت ملتا ہے۔ شاید لکھنؤ کے دسترخوان کی پوری بازیافت بہت دشوار ہے لیکن اس کی تاریخ، اس کی نفاست اور لطافت کے معیاروں کی تاریخ کی بازیافت بے شمار منتشر تحریروں کے جائزے سے ضرور ممکن ہے اس سے زیادہ حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ بیسویں صدی کی آخری دہائی میں بھی لکھنؤ والوں کے اجتماعی حافظہ میں اپنے دسترخوان کی انفرادیت اور امتیاز کا شعور باقی ہے، بہت

حسن واصف عثمانی صاحب مرحوم اِس خاکسار سے بیحد شفقت فرماتے تھے۔ یہ فرمائشی مضمون نیادور میں اُن کی آخری تحریر ہے اور میرے لئے ایک قیمتی اثاثہ۔ ——— امجد حسین

سے نام زندہ ہیں اور باورچیوں اور طباخوں کی گزشتہ فن کاری کے وارث بھی موجود ہیں جو بہت بھول جانے کے باوجود بہت کچھ نہیں بھول سکے ہیں۔ زمانے کی تبدیلی، تہذیب کے زوال اور ناقدری نے ان کو اپنے بزرگوں کی فن کاری سے دور کر دیا ہے۔ لیکن نفاست و لطافت کا شعور و احساس لکھنؤ کے ماہر باورچیوں اور طباخوں کی سب سے خصوصیت اور انفرادیت ہے۔ پکانے کے ڈھنگ، مسالوں کے انتخاب اور ان کے استعمال میں ایک خاص تناسب کا لحاظ آج بھی لکھنؤ کے دسترخوانوں کو انفرادیت عطا کرتا ہے۔ نفاست و لطافت کے معیاروں کی بازیافت کی ضرورت بالکل نہیں کیوں کہ یہ تو اب بھی سلامت ہیں۔

خود ہماری نسل نے اس بزرگ نسل کی بیگموں، خواتین اور گھر والیوں کو دنیا سے رخصت ہوتے دیکھا ہے جو اپنے ہاتھ سے ہانڈی پکانے کو فرض سمجھتی تھیں۔ کھانوں کو مزے دار اور لذیذ بنانے کے گر جانتی تھیں۔ ان کا ذوق نفاست و لطافت کو روزمرہ کے کھانوں میں بھی برقرار رکھتا تھا۔ ہماری نانیوں، دادیوں اور ماؤں تک اپنی ثقافت کی روایت سلامت رہی۔ کسی کے پکائے ہوئے کھانے میں لذت، ذائقہ اور لطافت نہ ہو تو یہ بڑی بوڑھیاں کس حقارت سے کہتی تھیں کہ کیا پھوہڑ ماری تھی کہ ہاتھ میں ذائقہ ہی نہیں۔

لکھنوی دسترخوان کے ایک سرسری جائزے سے نفاست و لطافت کی دو بنیادی خصوصیات بنیادی اصول اور بنیادی رجحان نظر آتی ہیں۔ عرب و عجم سے لے کر ہندستان تک تنور کی گرم بازاری صدیوں سے چلی آرہی ہے۔ تنوری روٹی، نان خمیر اور نان فطیر کا رواج صدیوں سے چلا آتا ہے۔ لکھنؤ کے دسترخوان نے اس میدان میں ایک طرف باریک ہلکی اور آسانی سے ہضم ہونے والی چپاتی کا اضافہ کیا تو دوسری طرف میدے، گھی اور دودھ کی آمیزش سے شیرمال ایجاد کی جس کی لذت بے مثال تھی۔ تافتان بھی لکھنوی ایجاد ہے مگر اس میں شیرمال کی طرح خستگی نہیں ہوتی۔ شیرمال قورمہ اور کباب کی لذت کو دوبالا کرتی ہے۔ لکھنؤ نے تافتان سے زیادہ فن کاری پوری اور پراٹھے کی تیاری میں دکھائی۔ پوری کا آٹا گوندھتے وقت اس میں گھی دے کر اس کو خستہ بنا دیا۔ پراٹھے

گرم رہنے تک نرم رہتے تھے پھر ان میں سختی آجاتی تھی۔ لکھنؤ کے باکمالوں نے ورقی پراٹھے ایجاد کیے اور ان کے آٹے میں زیادہ سے زیادہ گھی کھپانے میں کامیابی حاصل کرلی۔

کلچہ ایران اور افغانستان سے آیا تھا اور ہندستان میں ہر جگہ پھیل گیا تھا لیکن ہر جگہ اس میں مقامی اثر غالب ہوا۔ لکھنؤ والوں نے بھی کلچہ میں تصرف کیا اور اس کی تکونی شکل متعین کی اور اس کے اندر پرت پیدا کیے اور اس طرح اس کو نہاری سے وابستہ کیا۔ آج بھی لکھنؤ کا کلچہ سارے ہندستان میں اپنی انفرادیت رکھتا ہے اس کی لذت اور نفاست دونوں بے مثال ہیں۔ نہاری بھی اپنے مخصوص مسالوں اور ان کے امتزاج سے جداگانہ لذت رکھتی ہے جو اور کہیں نہاری میں نہیں ملتی۔ بلا شبہ الہ آباد کی مشہور نہاری بے حد لذیذ ہوتی ہے لیکن اس کی لذت کا دارومدار اس پر ہے کہ یہ پائے اور اس کی ہڈیوں کے روغن سے تیار ہوتی ہے۔ لکھنؤ والے پائے کی نہاری بہت کم پسند کرتے ہیں لکھنؤ کی نہاری اپنے خاص مسالوں اور گوشت کی بوٹیوں سے تیار ہوتی ہے۔ دہلی کی طرح اس میں بے تحاشا سرخ مرچ نہیں ہوتی جو اپنی تیزی سے اصل ذائقے ہی کو غارت کردے۔

لکھنؤ کے ماہر باورچیوں کا یہ قول بھی نقل کیا جاتا رہا ہے کہ:

"اصل کھانا تو بس قورمہ چپاتی ہے باقی سب امیروں کے نخرے ہیں۔" واقعہ یہ ہے کہ لکھنؤ کے دسترخوان نے قورمہ اور چپاتی کی نفاست اور لطافت کو آسمان تک پہونچا دیا تھا۔ چپاتی کا باریک، نرم اور سرخ چتی دار ہونا لازمی شرط تھا۔ ماہر باورچی پاؤ بھر آٹے کی سولہ چپاتیاں توے سے اتار لیتے تھے جو ٹھنڈی ہونے پر بھی نرم رہتی تھیں ان کا جوڑ قورمہ تھا جو عمدہ قسم کے گوشت سے تیار کیا جاتا تھا۔ قورمہ میں تیاری کے بعد بھی شوربہ بالکل نہیں ہوتا تھا۔ اس کے مخصوص مسالے، گوشت کا جوہر اور گھی کے تار کی وجہ سے قورمہ بے حد لذیذ ہوتا تھا۔ قورمہ کا تار اور مسالہ لعاب دار، خوش رنگ اور خوشبودار رکھا جاتا تھا۔ لعاب پیدا کرنے میں دھیمی آنچ میں پکنے کو بھی دخل تھا اور بالائی، بادام اور گھی کے تار کو بھی۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ایک کردار نے لکھنوی ذوق کی نمائندگی کرتے ہوئے بڑے مزے سے کہا ہے کہ:

"یہاں تو جب تک قورمہ میں شیرۂ بادام نہ ہو وہ حلق سے نہیں اترتا۔"

لکھنوی دسترخوان پر شوربہ دار سالن بھی نظر آتے ہیں۔ ان کا ذائقہ الگ شان رکھتا تھا۔ قورمے میں ہلدی نہیں پڑتی تھی۔ سالنوں کے مسالے میں ہلدی شامل تھی۔ درباروں سے زیادہ عام گھروں میں سالن کا چلن تھا۔ پھر بھی ترکاری دار سالن معیوب نہیں کیے جاتے تھے۔ تلی اروی اور تلے آلو کے سالن خاصے کی چیز سمجھے جاتے تھے ان کے پکانے میں اہتمام اور مہارت سے کام لیا جاتا تھا۔

قیمہ، کوفتہ اور کباب خاص و عام کے دسترخوان کی زینت ہوتے تھے۔ قیمہ سادہ، دو پیازہ، سیم کے بیج، ٹماٹر اور آلو کے ساتھ پکتا تھا اور چنے کی دال کے ساتھ بھی۔ مگر اہمیت دو پیازہ قیمہ کو حاصل تھی۔ پراٹھے، شیرمال اور چپاتی تینوں ہی دو پیازہ قیمہ کے جوڑ تھے۔ کوفتے کا خستہ اور نرم ہونا ضروری تھا اور یہ لعاب دار شوربے میں گھی کے تار کے ساتھ دسترخوان پر پیش ہوتا تھا۔ اس کے مسالوں میں گرم مسالہ شامل تھا۔

لکھنؤ میں شامی کباب، سیخ کے کباب، گلاوٹ کے کباب گھروں کی طرح بازار میں بھی عام طور پر تیار ہوتے تھے۔ لکھنوی کبابوں میں بہت باریک پسے ہوئے قیمے اور کباب کے خاص مسالوں کے استعمال کی وجہ سے لذت اور ذائقہ کا ایک نیا اور بلند معیار قائم ہوا اور لکھنؤ کے کبابچیوں کے نام، ان کی شہرت اور ان کے کمال کا اعتراف سارے ہندستان میں کیا جانے لگا۔ تاریخ کے صفحوں پر ان باکمالوں کے نام درج ہوئے جن کے حالات معلوم نہیں مگر ان کی فن کاری اور مہارت کی داستان زندہ ہے۔

بہتر سے بہتر کی تلاش نے جو ذوق پیدا کیا تھا وہ پلاؤ کو بریانی پر اور فرنی کو کھیر پر ترجیح دینے کا سبب بنا۔ بریانی میں چاولوں پر گوشت کی تہ پر تہ لگا کر اس کو دم دیا جاتا ہے۔ اس میں رنگ اور خوشبو کے لیے زعفران کے استعمال کے باوجود لکھنوی نفاست کو

یہ بریانی چاول اور گوشت کا ملغوبہ نظر آتی تھی۔ اس لئے لکھنؤ میں پُلاؤ اور اس کی بے شمار اقسام لکھنؤ کے ذوق کی علامت بن کر سامنے آئیں۔ پُلاؤ بھی عرب و عجم سے آیا تھا مگر لکھنؤ نے پُلاؤ کی لطافت کو پروان چڑھایا اور پلاؤ کو بریانی سے بالکل الگ کرنے کے لئے ساری توجہ یخنی دار پلاؤ پر کی، جس میں چاول میں گوشت کا جوہر اور ذائقہ حل ہو جاتا ہے۔ پلاؤ کی اس خاص لذت کو بڑھانے کے لئے دوگوشتہ اور سہ گوشتہ پلاؤ کا رواج ہوا۔ کم از کم مقدار کے چاول میں گوشت کی زیادہ سے زیادہ مقدار کے جوہر، ذائقہ اور مزے کو شامل کرنے کا طریقہ اس کے سوا کوئی نہ تھا کہ عملی طور پر پلاؤ یخنی میں تیار ہو۔ پُلاؤ کی حقیقی لذت لکھنؤ والے ہی جانتے تھے اور اسی لیے وہ بے یخنی کے تیار ہونے والے پلاؤ کو جو بریانی کے قریب ہوتا ہے، بڑی حقارت سے دھوبیا پلاؤ کہتے تھے۔

لطافت کی تلاش میں لکھنؤ والوں نے ملائی کو بالائی کا نام دے کر بالائی کو دسترخوان کی زینت بنایا اور کھیر میں دُودھ، چاول اور شکر کی آمیزش اور پکانے کے طریقے کو مزید ترقی دے کر فرنی رائج کی۔ فرنی میں دودھ کی زیادہ مقدار میں پسے ہوئے چاول کم مقدار میں ڈال کر یوں پکائے جاتے ہیں کہ وہ باہم ایک ہو جائیں اور ٹھنڈا ہونے پر جم سکیں۔ فرنی مٹی کے پیالوں میں سوندھے پن اور لطافت کی وجہ سے لکھنوی ذوق کی پُوری طرح تسکین کرتی تھی، اور گلی کوچوں اور بازاروں میں بالائی کی طرح عام طور پر ملتی تھی۔ یہ رواج اب بھی ہے اور بالائی اور فرنی کی قدر دانی میں لکھنؤ والے سب سے آگے ہیں۔

نفاست اور لطافت کے ترقی یافتہ شعور نے لکھنؤ میں مٹھائیوں مربّوں اور حلووں کی تیاری پر پُورا اثر ڈالا۔ یہاں برفی، قلاقند، گلاب جامن، امرتی، جلیبی، نکتی اور لڈّو جیسی عام مٹھائیوں کی لذّت، رنگت اور ذائقہ کا معیار کاریگر حلوائیوں نے ایسا بلند کیا کہ سارے اودھ بلکہ شمالی ہند سے دکن تک ان کے نام کا طوطی بولنے لگا۔ ان ماہروں کی بڑی تعداد لکھنؤ سے نکل کر ملک میں پھیلی اور لکھنؤ کا نام روشن کیا۔ ان مٹھائیوں کی طرح مربّہ سازی بھی لکھنؤ میں اہمیت رکھتی تھی۔ لکھنؤ کے دورِ شباب میں باورچیوں، طباخوں، مربّہ سازوں کے گھرانے، محلے اور علاقے شہرت رکھتے تھے۔ وہ اپنے خاندانی فن کی ترقی پر پوری توجہ دیتے تھے اور جدّتوں سے کام لے کر عوام و خواص سب کو متاثر کرتے تھے۔

مربّہ سازی کے میدان میں سیب، بہی، آنولا جیسے مُربّوں کو دل و دماغ کی فرحت اور ہاضمہ کی طاقت بڑھانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ حکیموں کے نسخوں میں سیب کے مُربّے کو ہمراہ ورقِ نقرہ یا ہمراہ ورق طلا استعمال کرنے کی ہدایت عام طور پر کی جاتی تھی۔ طرح طرح کے لذیذ حلوے بھی طبّی فائدوں کے پیشِ نظر تیار ہوتے تھے ان کو طاقت و توانائی عطا کرنے والی غذا کا درجہ حاصل تھا اس لیے ان میں بادام، پستہ اور دیگر خشک میوے، زعفران اور کبھی کبھی مشک بھی شامل کی جاتی تھی، یا بعض یونانی دواؤں کو حلوے کے اجزا میں شامل کیا جاتا تھا۔

غذائیت کے صحت اور جسم کی طاقت اور توانائی کے تعلق کا پورا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ اس لیے ہر موسم میں پیدا ہونے والی سبزی، ترکاری بھی بڑے اہتمام سے استعمال کی جاتی تھی۔ اس میں سستی اور آسانی سے دستیاب ہونے والی ترکاریوں سے پرہیز بالکل نہیں تھا بلکہ بطورِ خاص ان کو استعمال میں لایا جاتا تھا۔ سبزیوں اور ترکاریوں کے پکانے میں لکھنؤ کے ماہر باورچیوں نے اپنے فن کی پوری مہارت سے کام لیا۔ ہر ایک ترکاری کو کئی کئی ڈھنگ سے پکانے کے طریقے کر کے سبزی خوری میں نئی لذّت پیدا کر دی۔

حامد علی خاں بیرسٹر نے اس صدی کی پہلی دہائی میں اپنے ایک ماہر باورچی کا تذکرہ کیا ہے جو صرف بھنڈی کی ترکاری کو اسّی الگ الگ طریقوں سے پکاتا تھا اور ہر ہانڈی کا ذائقہ الگ ہوتا تھا۔

لکھنوی دسترخوان کی سرسری جھلک اس کے متنوع، رنگارنگی اور فن کارانہ وسعتوں کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ یہ بلا مبالغہ سیکڑوں اقسام کے نمکین اور میٹھے کھانوں سے آراستہ تھا۔ مشرقی تمدن اور تہذیب کی صدیوں سے چلی آنے والی روایتوں نے اس کو ہمہ گیر بنا دیا تھا۔ داستان امیر حمزہ، طلسم ہوش رُبا اور دوسری داستانوں

جسٹس مرتضیٰ حسین
'المرتضیٰ'، بارود خانہ، گولہ گنج لکھنؤ

فیض آباد: ماضی اور حال کے آئینے میں

فیض آباد مشرقی اتر پردیش کے تلب میں واقع ہے جو لکھنؤ سے ایک سو چھبیس ۱۲۶ کلو میٹر پورب دریائے گھاگرہ کے اس حصہ کے دکھنی کنارے پر بسا ہوا ہے جو سرجو ندی کہلاتا ہے۔ اجودھیا فیض آباد شہر سے چھ کلو میٹر پورب ہے۔ آبادی کے اضافے اور بہت سی نئی عمارتیں بن جانے کے سبب یہ فاصلہ اور بھی کم ہو گیا ہے۔ اس وقت فیض آباد اور اجودھیا ایک ہی میونسپلٹی کے حلقے میں ہیں۔

فیض آباد اور اجودھیا درحقیقت ایک ہی داستان کے مختلف حصے ہیں۔ اس لیے اجودھیا کے ذکر کے بغیر فیض آباد کا تذکرہ ادھورا رہے گا۔ تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ کسی زمانے میں اودھ کا سارا علاقہ اجودھیا کہلاتا تھا اور اس کا رقبہ بارہ جوجن یعنی ۴۸ کوس تک پھیلا ہوا تھا۔ موجودہ اجودھیا صرف ۶ میل کے رقبے میں ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ فیض آباد کا ضلع ہی نہیں بلکہ آس پاس کے دیگر اضلاع کے علاقے عہد قدیم میں اجودھیا میں شامل تھے۔

ہندوؤں کے لیے اجودھیا ایک متبرک زیارت گاہ ہے۔ یہ کوشل خاندان کی راجدھانی تھی۔ بھگوان رام اسی خاندان کے تھے۔ راجہ منو سے ستاون پشت بعد رام چندر جی کا اوتار ہوا اور راجہ ستر اپر جاکر یہ سلسلہ ختم ہوا۔ رام چندر کے زمانے میں اجودھیا کی شان و شوکت کے تذکرے رامائن اور مہابھارت کی مقدس کتابوں میں ملتے ہیں۔

سنت تلسی داس نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "رام چرتر مانس" کے "اودھ کانڈ" میں رام اور سیتا کی نگری اجودھیا کے بارے میں فرمایا ہے ۔

کہی نہ جائے کچھ نگر وبھوتی   جنو اتینو وریچی کرتوتی

"نگری کی خوبی کا حال کچھ نہیں کہا جاتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے برہماجی کی کاری گری اتنی ہی ہے اس کے پرے سنسار کچھ بھی نہیں ہے۔"

کوشل خاندان کی ایک سو اٹھاون پشتوں نے اجودھیا پر حکمرانی کی تھی۔ جین دھرم والوں کے لیے بھی اجودھیا ایک بڑا تیرتھ استھان ہے۔

اجودھیا مسلمانوں کی بھی زیارت گاہ ہے کیونکہ وہاں ۳ پیغمبروں یعنی حضرت نوح، حضرت شیث اور حضرت ایوب علیہم السلام کے مزار ہیں۔ سورج بنسی راجہ سترا کے زوال کے بعد اجودھیا اُجاڑ ہو گیا اور اس کی سیاسی اہمیت ختم ہو گئی۔ گیارہویں صدی عیسوی تک اس کا کوئی تذکرہ کتابوں میں نہیں ملتا ہے۔ گیارہویں صدی عیسوی میں سپہ سالار مسعود وہاں پہونچے۔ اس کے بعد یہ علاقہ دہلی کی مرکزی حکومت کا حصہ ہو گیا۔ اور سپہ سالار مسعود افسانوی کردار بن گئے۔ اجودھیا سے بہرائچ جانے والی شاہراہ کے ایک حصہ کو اس علاقے کے لوگ بالے میاں کے بے سر کی فوج کے قیام کی جگہ بتاتے ہیں۔

کوئی دو سو سال بعد جب دہلی سلطنت کا اودھ پر قبضہ ہوا تو اجودھیا اودھ کی راجدھانی بن گیا۔ پندرہویں صدی میں جون پور کے شرقی بادشاہوں نے اس علاقہ کو فتح کر لیا مگر ان کے زوال کے

بعد یہ پھر دہلی کی مرکزی سلطنت کا حصہ ہو گیا۔ شہنشاہ اکبر کے زمانے میں ان کی پوری مملکت بارہ صوبوں میں منقسم تھی جن میں اودھ کے صوبے کو خاصی اہمیت حاصل تھی۔ اس وقت یہ صوبہ مشرق میں بنارس تک اور مغرب میں بریلی تک پھیلا ہوا تھا۔ اس صوبے کا گورنر اجودھیا میں رہتا تھا۔ عہدِ اکبری میں ہی یہ صوبہ شیخ زادوں کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ جب سلطنتِ مغلیہ پر زوال آنا شروع ہوا تو شیخ زادوں نے جگہ جگہ آزاد حکومتیں قائم کر لیں۔ اس زمانے میں شیخوں اور پٹھانوں کے درمیان لڑائیوں کے واقعات بھی تاریخ کے صفحات پر نظر آتے ہیں۔

فیض آباد کی کہانی نے ۱۷۲۲ء میں اس وقت ایک فیصلہ کن موڑ لیا جب سلطنتِ مغلیہ کی مرکزی حکومت نے شیخ زادوں کی سرکوبی کے لیے ایک تجربہ کار فوجی افسر سیّد محمد امین نیشاپوری کو اودھ کا صوبیدار بنا کر بھیجا۔ انھوں نے اجودھیا کی آبادی سے ذرا ہٹ کر لچھمن گھاٹ کے مقام پر سرجو ندی کے کنارے، کیوڑے کے جنگل میں انتظامِ حکومت کی خاطر خیمے نصب کرائے جنھیں "قلعہ مبارک" کا نام دیا گیا۔ برسات کا موسم آیا تو پھر اور ہٹ کر ایک وسیع چھپّر ڈلوایا۔ اس کے گرد ایک بڑے رقبے میں کچی دیواروں کا بہت بڑا حصار بنوایا جس کے اندر خام دیواروں کی چھپّر پوش عمارتوں میں فوجی رسالے اور عملہ کے لوگ اور دیگر متعلقین رہنے لگے۔ یہ حصار ایک چھوٹا سا شہر تھا جس میں فوجی اور شہری ضرورتوں کی ہر چیز مہیا تھی۔ چھپّروں اور کچی عمارتوں کی وجہ سے اس شہر کا نام "بنگلہ" پڑ گیا۔

برہان الملک کے انتقال کے بعد ان کے بھانجے اور داماد صفدر جنگ اودھ کے دوسرے نواب ہوئے۔ ان کے زمانے میں برہان الملک کی بنوائی ہوئی کچی عمارتوں کے دن پھرے۔ پھاٹک بنے بازاریں سجیں، حویلیاں کھڑی ہوئیں۔ پرفضا نزہت گاہیں قائم ہوئیں اور بنگلہ کا نام تبدیل ہو کر فیض آباد ہو گیا۔

شجاع الدولہ اودھ کے تیسرے نواب ہوئے۔ ان کا دل فیض آباد سے اچاٹ ہوا اور لکھنؤ پر ریجھا مگر یہ عشق ان کو راس نہ آیا۔ انگریزوں سے ان کی لڑائی ٹھنی ۱۷۶۴ء میں بکسر کی لڑائی میں انھوں نے شکست کھائی اور بے سروسامانی کے عالم میں بھاگ کر فیض آباد آئے۔ قلعہ میں جو کچھ ساز و سامان موجود پایا اسے کر راتوں رات چل کھڑے ہوئے اور لکھنؤ پہونچے اور وہاں بھی ایک ہی رات قیام کر کے جو کچھ ہاتھ آیا ساتھ لیا اور بریلی کی راہ لی تاکہ روہیل کھنڈ کے افغانوں کے ساتھ جا کر پناہ لیں۔ لڑائی کے نو مہینے کے بعد شجاع الدولہ کی انگریزوں سے صلح ہوئی اور کچھ شرائط و قیود کے بعد ان کو دوبارہ اودھ میں حکمرانی کا موقع ملا۔ صلح سے کچھ پہلے شجاع الدولہ اتفاق سے فرخ آباد پہونچ گئے۔ وہاں ان کی ملاقات ایک تجربہ کار سپہ سالار احمد خاں بنگش سے ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے شجاع الدولہ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ اب کی جو عنانِ حکومت سنبھالو تو لکھنؤ میں نہ رہنا بلکہ فیض آباد کو دارالحکومت بنانا یہ مشورہ شجاع الدولہ کو پسند آیا اور انھوں نے سترہ سو پینسٹھ ۱۷۶۵ء میں فیض آباد کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ یہاں انھوں نے پھر سے فوجی بھرتی شروع کی۔ نئے رسالے مرتب کئے اور نئی عمارتوں کی بنیاد ڈالی۔ پرانے حصار کو ایک نئے شہر پناہ کی حیثیت سے از سرِ نو تعمیر کرایا۔ اس حصار کے ہر طرف دو دو میل کا میدان چھوڑ کر چاروں طرف گہری خندق کھدوا کر قلعہ بندی کرائی اور ملازمین سرکار اور افسرانِ فوج کو حکم دیا کہ اپنی حیثیت اور ضرورت کے مطابق قطعاتِ زمین لے کر شہر پناہ اور خندق کے درمیانی میدان میں مکانات تعمیر کرائیں۔

شجاع الدولہ بڑے بیدار مغز حکمراں اور اعلا صلاحیتوں کے انسان تھے۔ ان کی بنوائی ہوئی عالی شان عمارتوں میں سے کچھ گر گئی ہیں مگر اس دور کی جو عمارتیں اب بھی موجود ہیں ان میں بہو بیگم صاحبہ کے مقبرہ کو چھوڑ کر سب شجاع الدولہ کے زمانے کی ہیں۔ کچھ ان کی خود بنوائی ہیں اور کچھ ان کے متوسلین کی۔

انھوں نے بہت سے باغ بھی لگوائے تھے جن میں سے انگوری باغ، موتی باغ، لال باغ، آصف باغ اور بلند باغ کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے۔ ان باغات میں لال باغ کے حسن و دلکشی کی اتنی شہرت تھی کہ شہنشاہِ دہلی شاہ عالم جب الٰہ آباد سے پلٹے تو اس باغ کی سیر کے

شوق میں فیض آباد گئے اور وہاں کچھ روز قیام کیا۔ چوک سے پچھم جانے والی سڑک پر نواب شجاع الدولہ ہی کے زمانے میں دو رویہ املی کے پیڑ لگے تھے۔ یہ جگہ اب بھی املی کی قطار کے نام سے موسوم ہے۔

نواب شجاع الدولہ کو شہر کی درستی کا اس قدر شوق تھا کہ وہ صبح و شام سڑکوں اور مکانوں کا معائنہ کرتے تھے۔ مزدور پھاوڑے اور کدالیں لیکر ان کی سواری کے ساتھ ہوتے تھے۔ جہاں کہیں کسی مکان کو ٹیڑھا یا اپنی حد سے بڑھا ہوا پاتے یا کسی دوکاندار کو دیکھتے کہ اس نے سڑک کی زمین بالشت بھر بھی دبالی ہے تو فوراً کھدوا کر برابر اور سیدھا کرا دیتے۔ انھوں نے شعر و ادب، موسیقی رقص اور دیگر فنون لطیفہ کی بھی ہمت افزائی کی۔ صاحبان علم و ہنر کی انھوں نے ایسی قدر شناسی کی کہ اجڑی ہوئی دہلی اور دیگر مقامات کی ساری خلقت فیض آباد کی طرف ٹوٹ پڑی اور وہاں کی علمی ادبی، ثقافتی اور سماجی عظمتیں اس وقت کے شاہجہان آباد کو آنکھیں دکھانے لگیں۔

منشی فیض بخش مصنف تاریخ فرح بخش نے عہد شجاع الدولہ کے فیض آباد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب میں پہلے پہل گھر چھوڑ کر فیض آباد گیا ہوں۔ ستاز نگر ہی تک پہونچا تھا جو شہر کے مغربی پھاٹک سے چار میل کے فاصلے پر تھا میں نے دیکھا کہ ایک درخت کے نیچے مٹھائیاں، گرم گرم کھانا کباب، سالن، روٹیاں اور پراٹھے وغیرہ بک رہے ہیں۔ سبیلیں رکھی ہوئی ہیں۔ نان خطائیاں، مختلف قسم کے شربت اور فالودہ بھی بک رہا ہے اور صدہا آدمی خریداری کے لیے ان دوکانوں پر گرے پڑتے ہیں۔ مجھے خیال گذرا کہ میں شہر کے اندر داخل ہو گیا اور خاص چوک میں ہوں مگر متحیر تھا کہ ابھی تک شہر کا پھاٹک تو آیا ہی نہیں میں اندر کیسے پہونچ گیا؟ لوگوں سے پوچھا تو ایک راہ گیر نے کہا جناب شہر کا پھاٹک ابھی چار میل ہے۔ آپ کس خیال میں ہیں۔ اس جواب پر حیرت کرتا ہوا میں شہر میں داخل ہوا تو عجیب چہل پہل نظر آئی۔ رنگینیاں تھیں اور دلچسپیاں۔ جدھر دیکھتا ہوں ناچ ہو رہا ہے۔ مداری تماشا کر رہے ہیں۔ وہ لوگ طرح طرح کے سیر اور تماشوں میں مصروف ہیں۔ میں یہ رونق اور ہنگامہ دیکھ کے مبہوت رہ گیا۔ صبح سے شام تک کوئی وقت نہ ہوتا جب نوجوانوں اور پلٹنوں کے نقاروں کی آواز نہ سنی جاتی ہو۔ پہروں اور گھڑیوں کے بتانے کے لیے بار بار نوبت بجتی اور گھڑیال پر موگریاں پڑتیں جن کے شور و غل سے کان اڑے پڑتے سڑکوں پر دیکھئے تو ہر دم گھوڑوں، ہاتھیوں اونٹوں، خچروں، شکاری کتوں گائے بھینسوں، بیلوں، چھکڑوں اور توپوں کے گذرنے کا سلسلہ جاری رہتا جن کا شمار اور حساب اندازے سے باہر تھا اور راستہ چلنا دشوار تھا۔

•

ایک عجیب رونق اور تمکنت کا شہر نظر آیا جن میں وضعداران دہلی میں سے خوش پوشاک اور وضعدار شریف شہزادے، حاذق اطبائے یونانی، اعلا درجے کے مردانے اور زنانے طائفے ہر شہر اور ہر مقام کے مشہور اور باکمال گویے سرکار میں ملازم تھے اور بڑی بڑی تنخواہیں پاتے اور عیش و فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے۔ ادنی اور اعلاسب کی جیبیں روپیوں اور اشرفیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ بلکہ ایسا نظر آتا جیسے یہاں کبھی کسی نے افلاس و احتیاج کو خواب میں بھی نہیں دیکھا ہو۔ نواب وزیر (شجاع الدولہ بہادر) شہر کی سر سبزی و رونق اور رعایا کی خوشحالی میں ہمہ تن مصروف ہیں اور معلوم ہوتا تھا کہ فیض آباد چند ہی روز میں دہلی کی ہمسری کا دعوا کرے گا۔

چونکہ کسی مملکت اور کسی شہر کا رئیس اس نفاست اور شان و شکوہ سے نہیں رہتا تھا جس طرح نواب شجاع الدولہ رہتے تھے اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی نظر آتا تھا کہ کہیں لوگ اس بے جگری سے ہر کام اور ہر موقع و محل پر دولت صرف کرنے کو تیار نہیں ہو جاتے تھے اس لیے ہر قسم اور ہر جگہ کے اعلا دست کاروں، صناعوں اور طالب علموں نے وطنوں کو خیرباد کہہ کے فیض آباد ہی کو اپنا مسکن بنا لیا۔ اور یہاں ہر زمانے میں ڈھاکے، بنگالے، گجرات، مالوہ، حیدر آباد، شاہجہان آباد لاہور، پشاور، کابل، کشمیر اور ملتان وغیرہ کے طالب علموں کا ایک بھاری گروہ موجود رہتا جو علمار کی درسگاہوں میں تعلیم پاتے اور اس سرچشمۂ علم سے جو فیض آباد میں جاری تھا سیراب ہو کر اپنے گھروں کو واپس جاتے۔ کاش نواب وزیر اور دس بارہ سال جی جاتے تو گھاگھرا کے کنارے ایک نیا شاہجہان آباد آباد ہو جاتا اور دنیا

ایک نئی زندہ دہلی کی صورت دیکھ لیتی "

نو سال کی حکمرانی کے بعد ۱۷۷۵ء میں شجاع الدولہ کا انتقال ہوا انھیں کی بنوائی ہوئی ایک عمارت ان کی آخری آرام گاہ بنی جو گلاب باڑی کے نام سے آج بھی فیض آباد کی کھوئی ہوئی عظمتوں کی جیتی جاگتی علامت ہے ان کے چمن کے گلاب دور دراز تک مشہور رہیں۔

آصف الدولہ اودھ کے چوتھے فرماں روا ہوئے۔ انھوں نے لکھنؤ کو اپنا دارالحکومت بنا لیا۔ اس لیے ان کے تخت نشین ہوتے ہی فیض آباد خالی ہونے لگا۔ حاکم کے ساتھ ہر وہ محکوم چلا گیا جو جا سکتا تھا۔ فیض آباد اجڑتا رہا اور لکھنؤ بستا رہا۔ حتیٰ کہ محلوں، بازاروں اور باغوں کے نام بھی فیض آباد سے لکھنؤ چلے گئے۔ فیض آباد میں رکنے والی ایک گراں قدر ہستی آصف الدولہ کی والدہ محترمہ امتہ الزہرا بیگم صاحبہ کی تھی جن کا خطاب بہو بیگم تھا ۱۸۱۶ء میں ان کی وفات ہوئی اور وہ اس مقبرہ میں دفن ہوئیں جو بہو بیگم کا مقبرہ کہلاتا ہے اور بلا شبہ فیض آباد کی سب سے پُر شکوہ عمارت ہے۔ ادھر عرصہ سے اس کی باہری چونا کاری نہیں ہوئی ہے جس کے سبب یہ عالیشان عمارت سیاہ پوش ہو کر ذمہ داروں کی تغافل کیشی کا ماتم کر رہی ہے۔

گلاب باڑی کے علاوہ عہد شجاع الدولہ کی عمارتیں جو اب بھی قائم ہیں ان میں چوک کا وہ مرکزی حصّہ ہے جو ترپولیا کہلاتا ہے اس کی مختلف سمتوں میں اونچے اونچے عالی شان در بنے ہوئے ہیں۔ چوک کے بیچوں بیچ لوہے کا ڈھلا ہوا گھنٹہ گھر ہے جس کی سوئیاں کبھی وقت کا صحیح طور پر ساتھ نہ دے سکیں۔ کہا جاتا ہے کہ بلرام پور کے مہاراجہ نے برطانی عہد میں اسے لگوایا تھا۔ گھنٹہ گھر کے مغرب میں ایک عالیشان مسجد نواب شجاع الدولہ کے ایک عہدے دار حسن رضا خاں کی بنوائی ہوئی ہے جو چوک کی مسجد کہلاتی ہے۔ مسجد کے شمال میں ایک پختہ سرائے ہے جس میں اب ترکاری منڈی ہے۔ اسی زمانے میں ایک کوٹھی چھاؤنی کے علاقہ میں گپتار گھاٹ کے پاس ہے جو محکمہ زراعت کے قبضہ میں ہے۔ دوسری کوٹھی دریا کے کنارے دل کشا کوٹھی کے نام سے ہے جس میں محکمہ افیون کا دفتر ہے۔ امام باڑہ جواہر علی خاں بنی خانم کا مقبرہ موتی مسجد اور وثیقہ اسکول کی مسجد بھی شجاع الدولہ کے زمانے کی یادگاریں ہیں۔

اب سے تقریب ساٹھ سال پہلے جب میں نے ہوش سنبھالا تھا تو چوک کی مسجد کے چاروں طرف اور گھنٹہ گھر کی ہر سمت میں نیچی نیچی دوکانیں تھیں جن کے آگے ٹین کے سائبان تھے۔ گھنٹہ گھر کے مشرق میں ایک قطار چھپر کی دوکانوں کی تھی جن میں گرمی میں شربت اور جاڑوں میں چائے ملتی تھی۔ انھیں دوکانوں میں اور ان کے آس پاس خونچوں والے مٹی کے سکوروں میں کھیر اور ایک خاص قسم کی چائے کے ساتھ استعمال ہونے والے بسکٹ بیچتے تھے جو "پاپے" کہلاتے تھے۔ کھیر کے پیالے فیض آباد کے چوک میں اب بھی مل جاتے ہیں۔ مگر "پاپے" نہیں ملتے۔ جس کا سبب یہی ہے کہ اب نئے نئے قسم کے بسکٹ بنانے کی فیکٹریاں کھل گئیں ہیں۔ مذکورہ بالا چھپر کی دوکانوں سے اُتر لوہے کا ایک گول کٹہرہ تھا جس میں ہفتے کے مقررہ ایام میں عیسائی مبلغین کھڑے ہو کر اپنے مذہب کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔

مسجد کی اتری دوکانوں میں ایک دوکان پھیکو حلوائی کی تھی جس کی راب‌ڑی بہت مشہور تھی۔ چوک کی مسجد کے سامنے سڑک کی پٹری پر پھولوں کے ہار اور گجرے بکا کرتے تھے۔ بنی خانم کا مقبرہ میں نے ہمیشہ ویران دیکھا۔ خورد محل کے نشانات بھی مٹ چکے۔ وہاں میں نے ایک چھوٹی سی درگاہ دیکھی تھی جس میں ایک کرگخ کا پیڑ تھا۔ اس مناسبت سے وہ کرگخ کی درگاہ کہلاتی تھی۔ اب وہاں ایک بہت بڑی درگاہ بن گئی ہے موتی محل میں قدیم پھاٹکوں اور دیواروں کے آثار اب بھی اپنی زبانِ بے زبانی سے ؎

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ
آثار پدیداست صنا دید عجم را

سُنا رہے ہیں۔

جواہر علی خاں کا امام باڑہ فرقہ شیعہ کے امور مذہبی کی ادائیگی کا مرکز ہے اسی کے احاطہ میں ان لوگوں کی جامع مسجد ہے۔ موجودہ پیش امام مولوی ابن حسن صاحب قبلہ کی کوششوں سے اس مسجد کی از سر نو تعمیر اور تزئین ہو گئی ہے۔ حضرات اہل سنت کی جامع مسجد "ٹاٹ شاہ کی مسجد" کے نام سے مشہور ہے۔ موتی مسجد کے پائیں وسیع احاطہ میں حکیم نواب شجاع الدولہ مرحوم کے خاندان کے لوگ وثیقہ اسکول کی

مسجد کے احاطے میں عرصۂ دراز سے ایک عربی اسکول بہو بیگم صاحبہ کے وثیقہ کی آمدنی سے قائم ہے۔

سرکٹ ہاؤس، ٹاؤن ہال، کچہریوں کی عمارتیں اور مردہ عجائب گھر جس کی عمارت میں اب محکمۂ پلاننگ کا دفتر ہے انگریزی عہد کی یادگاریں ہیں۔ اس طرف آواس وکاس اور محکمۂ تعمیراتِ عامہ کے زیر اہتمام بہت سی رہائشی کالونیاں بن گئی ہیں۔

اجودھیا کے تقدس کی ضمانت وہ پرانے مندر ہیں جو رام کوٹ لچھمن مندر، ہنومان گڑھی، منی پربت، سورگ دروازہ اور گپتار گھاٹ کے نام سے مشہور ہیں۔

گپتار گھاٹ کی مذہبی اہمیت کے بارے میں کہاوت ہے کہ یہیں پر سرجو ندی میں ڈوب کر بھگوان رام نے اپنی جیون لیلا ختم کی تھی۔

ان تمام متبرک مقامات کی رونق رام نومی، جنم اشٹمی، دسہرہ اور دیگر تہواروں کے موقعوں پر سجاوٹ اور عقیدت مندوں کی آمد نیز مذہبی رسوم کی ادائگی کے ذریعہ دوبالا ہو جاتی ہے۔

مسلمانوں کے جذباتی لگاؤ کا مرکز اجودھیا کا ایک قبرستان ہے جس میں کئی لمبی لمبی قبریں ہیں۔ ان میں سے ایک قبر حضرت شیث پیغمبر کی بتائی جاتی ہے۔ اس کی لمبائی نو گز ہے وہاں ہر سال میلے کی شکل میں عُرس ہوتا ہے۔

فیض آباد اور اجودھیا کے درمیان سڑک سے کچھ دکھن ہٹ کر ایک مقام ہے جہاں ایک بہت پرانی اور وسیع مسجد کے کچھ کھنڈر اور پرانی قبریں ہیں۔ یہ جگہ وہیں کی ایک صاحب قبر "بڑی بوا" کے نام سے موسوم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بڑی عبادت گزار اور اللہ والی بی بی تھیں۔ قدرت نے ان کو حسن ظاہری بھی عطا فرمایا تھا۔ اس زمانے کے شہر کوتوال نے ان سے شادی کرنا چاہی مگر وہ راضی نہ ہوئیں۔ کوتوال نے کچھ عالموں اور بزرگوں کو بیچ میں ڈالا مگر ناکامیاب رہا۔ تب اس نے ان معظمہ سے زبردستی شادی کرنے کی ٹھانی اور انھیں اپنے ارادے سے مطلع کیا۔ انھوں نے کوتوال سے دریافت کرایا کہ اس کو ان میں کون سی ایسی کشش نظر آئی جس سے وہ اتنا بضد اور ظلم و جور پر آمادہ ہے۔ اس نے جواب کہلایا کہ اس کو اُن کی آنکھیں بہت پسند آئیں۔ یہ سن کر انھوں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی دونوں آنکھیں نکال کر ایک پتے پر رکھیں اور خادمہ کے ہاتھ کوتوال کو اس پیغام کے ساتھ بھجوادیں کہ تجھے جو چیز پسند ہے وہ حاضر ہے مگر یاد رکھنا کہ فیض آباد میں اب کوئی عالم رہے گا نہ ظالم"، کیا عجب کہ ان کے دل سے نکلی ہوئی اس آواز ہی کا اثر ہو کہ فیض آباد کی پوری تاریخ مذہبی رواداری اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی سے بھری ہوئی اور ظلم و ستم کی کہانیوں سے خالی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ انھیں کے دل کی پکار کا یہ سبب ہو کہ فیض آباد میں پیدا ہونے والا ہر صاحب علم و کمال مہرِ عالم تاب کی مانند ابھرا تو مشرق سے مگر چمکتا ہوا مغرب کی طرف بڑھا اور اسی سمت غروب ہو گیا۔

شعر و ادب، موسیقی، کھیل کود اور سیاست کے میدان میں بھی فیض آباد کا بلند مقام رہا ہے۔ ناخدائے سخن میر ببر علی انیسؔ ان کے صاحبزادے میر نفیسؔ، خواجہ حیدر علی آتشؔ، نواب سید محمد خاں رندؔ میر علی اوسط رشکؔ، پنڈت برج نرائن چکبستؔ اور امیر اللہ تسلیمؔ وغیرہ مملکت شعر و ادب کے وہ تاجدار ہیں جن کو جنم دینے پر سرزمین فیض آباد ہمیشہ ناز کرے گی۔ انقلاباتِ زمانہ کے ہاتھوں میر انیس مرحوم کے مکان میں فیض آباد کی میونسپلٹی نے کانجی ہاؤس بنالیا تھا۔ سید اظہر علی عرف مولوی انجمن صاحب مرحوم سید اظہر حسین صاحب مرحوم ریٹائرڈ آئی اے ایس افسر اور اُن کے رفقائے کار کی مساعی جمیلہ کی بدولت وہاں پر ایک ادبی مرکز قائم ہو گیا ہے جس کے ایک حصہ میں فیض آباد کے شمس و قمر انیسؔ و چکبستؔ کے نام سے ایک لائبریری بھی ہے۔

مرزا جعفر حسین جوادب، صحافت نیز تصنیف و تالیف کے میدانوں میں ایک منفرد مقام رکھتے تھے فیض آباد ہی کے تھے۔

ملکۂ غزل اختری بائی بھی جو بعد میں بیگم اختر کے نام سے مشہور ہوئیں فیض آباد کی تھیں۔ فٹ بال کے کھلاڑیوں میں فیض آباد چھاونی کے محلہ لال کرتی کے دو بھائی ولی محمد اور نور محمد اپنے وقت کے بہترین کھلاڑی تھے۔ ہاکی کے کھلاڑیوں میں براؤن ہیرا اور متین الدین کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ پنالٹی کارنر مل جانے پر گول کرنے میں متین صاحب کو بڑی مہارت تھی۔ فیض آباد میں ان کھیلوں کا اب بھی چلن ہے۔

ہندوستان کی آزادی کی جنگ میں بھی فیض آباد کا پورا اشتراک

عمل رہا ہے۔ فیض آباد کے مولوی احمد اللہ شاہ نے ۱۸۵۷ء کی اس لڑائی میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا تھا مگر دراصل وہ جنگ آزادی کی پہلی لہر تھی۔ وہ ایک درویش تھے اور مولوی کے نام سے مشہور تھے۔ انھوں نے اپنی تقریروں کے ذریعہ انگریزی سرکار کو ہلا دیا تھا۔ ان کی قیادت میں باغیوں نے انگریزی فوج سے جگہ جگہ ٹکر لے کر ان کے دانت کھٹے کر دیے تھے بالآخر اپنے ہی ایک ساتھی کی غداری سے ان کا کٹا ہوا سر انگریزوں کو ملا اور انھوں نے اسے شاہجہاں پور کی کوتوالی کے دروازے پر ٹنگا دیا۔ ان کی موت کی خبر جب انگلستان پہنچی تو انگریزوں نے چین کی سانس لی کیونکہ ان کی نگاہ میں شمالی ہندستان میں انگریزوں کے سب سے بڑے دشمن کا خاتمہ ہو گیا تھا۔

علم و سیاست کے میدانوں میں یکساں پیش رفت کرنے والی فیض آباد کی دو نمایاں ہستیاں مولانا حسین احمد مدنی اور اچاریہ نریندر دیو ہیں۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں جب انگریزوں کے خلاف پورے ملک میں نفرت کے جذبات پھیلے ہوئے تھے مولانا حسین احمد مدنی نے اپنے پیر و مرشد مولانا محمود الحسن کے ساتھ ریشمی رومال کی تحریک میں حصہ لیا تھا جو انگریزی حکومت کے خلاف چلائی گئی تھی۔ انھوں نے ترکی اور دیگر عرب ممالک میں جاکر ہندوستان کی آزادی کے لیے فضا ہموار کی تھی۔ وہ جمعیتہ علمائے ہند اور دیوبند کے مدرسہ کے بانیوں میں بھی تھے۔ اچاریہ نریندر دیو سوشلسٹ طرز فکر کے حامی تھے۔ جنگ آزادی میں جیل گئے تھے اور لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے تھے۔ ابھی حال میں فیض آباد میں ان کی یاد میں ایک بہت اچھا ہال "نریندر ہالیہ" کے نام سے بن گیا ہے۔ ایک اور کل ہند سطح کی قابل ذکر سیاسی شخصیت ڈاکٹر رام منوہر لوہیا کی تھی جو فیض آباد کی تحصیل اکبر پور کے موضع شہزاد پور میں پیدا ہوئے تھے۔

میرے تعلیمی دور میں فیض آباد شہر میں دو ہائی اسکول اور ایک انٹرمیجیٹ کالج تھے تحصیلوں میں بھی ہائی اسکول تھے۔ اب جگہ جگہ ہائی اسکول انٹرمیڈیٹ کالج اور متعدد ڈگری کالج ہیں شہر میں دو یونیورسٹیاں ہیں جن میں سے ایک زراعتی ہے اور وہ آچاریہ نریندر دیو کے نام سے منسوب ہے اس کے علاوہ پالی ٹکنک اور آئی ٹی آئی بھی قائم ہیں۔

فیض آباد کی قدیم صنعتوں میں پہلے قصبہ ٹانڈہ اور اس کے نواح میں جامدانی اور ڈوریا کی بنائی کا کام اعلیٰ پیمانے پر ہوتا تھا اب وہاں پرانی چال کے کپڑوں میں تہبند اور انگوچھے وغیرہ بنتے ہیں اور نئی قسم کے ٹیریکاٹ اور دیگر اچھے کپڑے بُنے جاتے ہیں۔

فیض آباد شہر میں لکڑی کے صندوقچے، قلمدان، عطردان اور سنگاردان بہت اچھے بنتے تھے جن پر پیتل کے نفیس کام کی پھول پتیاں بنی ہوتی تھیں اب اس کام کا صرف ایک کارخانہ رہ گیا ہے۔ کھانڈ بنانے کا کام پہلے شہر کے محلے کاندو ٹولہ میں بہت ہوتا تھا اب وہاں رام دانے اور مُرمُرے کی لیّا، شکر کے گٹے اور بتاشے بکثرت بنتے ہیں۔ ناریل کے حقّے جنھیں گڑگڑا کہتے ہیں وزیر گنج کے محلے میں بنتے تھے اور چوک میں گھنٹہ گھر کے دکھن میں ان حقوں کی کئی دکانیں تھیں۔ اب یہ کام نسبتاً کم ہو گیا ہے اور چوک میں ناریل کے حقّے کی صرف ایک دوکان ہے۔ تمباکو کی کاشت اجودھیا اور اس کے آس پاس بہت کافی رقبہ میں ہوتی ہے۔

قصبہ مبارک پور کی لکڑی کی کھڑاویں پہلے بہت مشہور تھیں فیض آباد میں اب بھی کہیں کہیں لکڑی کی کھڑاویں بنانے کی دکانیں ہیں۔ سینگ کی کنگھیاں پہلے کی طرح اب بھی فیض آباد میں بنتی ہیں اور باہر جاتی ہیں۔ اس طرف فیض آباد میں بیڑی بنانے اور جوتہ و چپل سازی کے کام کو بہت فروغ ہو گیا ہے۔ جوتہ سازی کے لیے فیض آباد مشرقی یوپی کا آگرہ کہا جا سکتا ہے۔ حکومت کا محکمہ انڈسٹریز فیض آباد میں جدید صنعتوں کو بڑھاوا دے رہا ہے۔ مسودہ میں ایک شکر مل اور اکبر پور میں سوت کی کتائی کی مل کھل گئی ہے۔ ترکاریوں کے بیج کا کام اب فیض آباد میں اعلا پیمانے پر ہوتا ہے۔ سیکڑوں کمپنیاں اس کام کو کر رہی ہیں۔ اور فیض آباد میں تیار کیے ہوئے بیج نہ صرف ہندوستان کے مختلف حصّوں میں بلکہ بیرونی ممالک کو بھی بھیجے جاتے ہیں۔

پھلوں میں امرود، شریفہ اور بیر فیض آباد میں اچھے اور بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ دریا کے کنارے ریتی کے علاقے میں ترکاریاں بہت پیدا ہوتی ہیں جن میں بڑے سائز کے بنڈے خصوصیت کے ساتھ
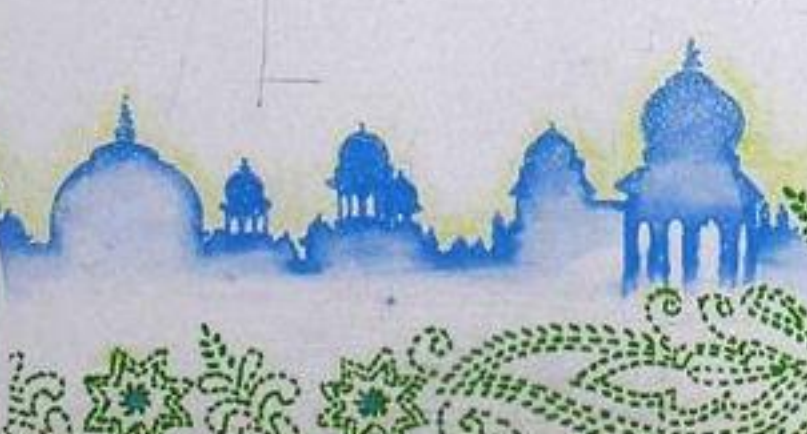
مشہور ہیں۔ وہاں کے تربوز کافی بڑے اور خوش ذائقہ ہوتے ہیں۔

فیض آباد کے تذکرے کے ساتھ وہاں کی ضلع جیل بھی قابل ذکر ہے۔ اس کا احاطہ بہت بڑے رقبے میں ہے میرے بچپن میں اس کے چاروں طرف کی سڑکیں زیادہ تر سنسان رہتی تھیں اور رات کو ان سڑکوں پر کھمبوں میں مٹی کے تیل کی لالٹینیں جلا کرتی تھیں اب وہ سڑکیں کافی مشغول رہتی ہیں۔ اسی جیل میں عظیم انقلابی اشفاق اللہ خاں کو ۱۹ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو پھانسی دی گئی تھی اور انھوں نے تختۂ دار چومتے وقت اپنی اس آخری خواہش کا اظہار کیا تھا ؎

کچھ آرزو نہیں ہے، ہے آرزو تو یہ ہے رکھ دے کوئی ذرا سی خاکِ وطن کفن میں

گورنمنٹ کالج کے ایک استاد مولوی عبد اللہ مرحوم تھے جن کا تعلق افغانستان سے تھا انھوں نے اشفاق اللہ خاں مرحوم کی تجہیز و تکفین کے انتظامات کئے تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ جب انھوں نے اشفاق اللہ خاں کی لاش پر ان کے کاندھے سے لٹکا ہوا کلام پاک دیکھا تو ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا ؎

سوئے جاناں می روم بپیغامِ جاناں در بغل

فیض آباد ہی کی جیل میں مولانا حسرت موہانی، لال بہادر شاستری، فیروز گاندھی، اجیت پرشاد جین، جگن پرشاد راوت، گوپال نرائن سکسینہ، بابا راگھو داس، ٹھاکر وسودھا سنگھ، ڈاکٹر جتیلے، جے رام ورما، ہرگووند سنگھ اور بندباسنی پرشاد سنگھ وغیرہ نے قید و بند کی اذیتیں برداشت کی تھیں۔

فیض آباد کی آبادی ہمیشہ سے مخلوط رہی ہے۔ وہاں ہندوؤں مسلمانوں اور کشمیری برہمنوں کے مقتدر گھرانے زمانۂ قدیم سے مل جل کر رہتے ہیں۔ تقسیمِ وطن کے بعد بہت سے قدیم مسلم گھرانے ہجرت کر گئے اور پاکستانی مہاجرین کثیر تعداد میں آکر آباد ہو گئے۔ ان کے آنے سے نئے مکانوں اور شاندار دوکانوں کا اضافہ ہوا اور ہر قسم کی تجارت کو فروغ ملا۔ ان کے زیر اثر پرانی دکانوں نے بھی نئے چہرے نکال لئے۔ آج کا فیض آباد ہمارے صوبے کی ایک کمشنری ہے وہاں پرانی آبادیاں بھی قائم ہیں اور نئی آبادیاں بھی چھلک رہی ہیں۔

□□

لکھنؤ کا گمشدہ دسترخوان۔ صفحہ ۱۲۴ کا بقیہ

میں کھانوں کے سیکڑوں نام ملتے ہیں، ہر کھانے کی بے شمار اقسام کی جانب اشارہ ملتا ہے۔

یہ کہنا تو دشوار ہے کہ لکھنوی دسترخوان، اس کے کھانوں، اور ان کی تیاری کے ماہرانہ طریقوں، مسالوں اور ان کے امتزاج کے ضابطوں کی پوری بازیافت آسان یا ممکن ہے لیکن کچھ نہ کچھ تو ممکن ہے اور اسی لئے اس تہذیبی سرمایے کی بابت تحریری ذخیرے کی بازخوانی لکھنؤ والوں پر فرض ہے۔ □□

اُردو نثر کے سرچشمے

زندگی جن کے تصور سے جِلا پاتی تھی
ہائے کیا لوگ تھے جو دامِ اجل میں آگئے

حسن واصف عثمانی حق گو صحافی، منفرد ادیب، صاحب طرز انشا پرداز، سنجیدہ تخلیق کار اور اسلامیات کے ممتاز اہل قلم تھے ندائے ملت، قومی آواز، عزائم اور صحافت سے وابستگی کے ساتھ نیا دور کے قلمی معاونین میں بھی تھے۔ ان کی پُرخلوص شخصیت محبت آمیز رویہ اور بے لوث، بے غرض وابستگی نے انھیں ایسی ہر دلعزیزی عطا کی تھی۔ ۱۰ر نومبر کو انھوں نے اس عالم خاکی سے کنارہ کیا۔ ادارہ ان کے انتقال کو اُردو ادب کے لئے نقصان عظیم تصور کرتا ہے اور مرحوم کے لئے دُعا مغفرت کرتا ہے۔ □□

امیر حسن نورانی ایک محقق، مدرس، قومی یک جہتی کے علمبردار اور اعلا پائے کے ماہرین علم و ادب میں سے تھے، ۱۸ر نومبر ۱۹۹۴ء کو انھوں نے انتقال کیا۔ ان کا سلسلۂ خدمات اسلامیہ کالج، لکھنؤ یونیورسٹی اور دہلی یونیورسٹی تک پھیلا ہوا ہے "اُردو کے چاند ستارے" اور "مولانا آزاد: حیات اور خدمات" ان کی وقیع تصانیف ہیں۔

ادارہ ان کے انتقال کو علم و ادب اور اودھ کی تہذیب اور وضعداری کی روایات کیلئے ناقابل تلافی نقصان سمجھتا ہے۔

ایڈیٹر

سید علی اشرفی
سجادہ نشین - کچھوچھہ شریف
فیض آباد

آٹھویں صدی ہجری کے صاحبِ کرامت بزرگ

سید اشرف جہانگیر سمنانی علیہ الرحمۃ

ضلع فیض آباد میں اشرف پور کچھوچھا اور رسول پور درگاہ گرام سبھاؤں کو ملا کر ٹاؤن ایریا اشرف پور کچھوچھا جسے کچھوچھا شریف کے نام سے کافی شہرت حاصل ہے۔

وہاں پر حضرت مخدوم سلطان سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ کا آستانہ مرجع خلائق ہے۔ اور بلا امتیاز مذہب، قوم، ذات برادری، زمان، علاقہ، امیر، غریب ہندوستان کے مختلف علاقوں سے نیز بیرون ملک سے زائرین وعقیدت مند حاضری دیتے رہتے ہیں، دفع آسیب کے لیے آستانہ پر خصوصی طور پر ہزاروں افراد شفایاب ہونے کے لئے حاضری دیتے ہیں۔

حضرت مخدوم سلطان سید اشرف جہانگیر سمنانی قدس سرہٗ کے پہلو میں آپ کے بھانجے اور معنوی فرزند حضرت سید عبدالرزاق نورالعین جو حضرت سیدنا شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی غوث اعظم کی نسلِ پاک سے ہیں کا مزارِ اقدس ہے۔

حضرت نورالعین کے دو فرزند حضرت سید شاہ حسن خلفِ اکبر سجادہ نشین اور حضرت سید شاہ حسین خلفِ ثانی سجادہ نشین کے مزارات حضرت کے گنبد کے سامنے صحن پہ واقع ہیں۔ ان دونوں بزرگوں کی اولادیں نیز ان کے سجادہ نشینان ہر سال ۲۵ محرم سے ۲۹ محرم تک مختلف مراسم عرس و مراسم سجادگی ادا کرتے چلے آرہے ہیں۔

حضرت مخدوم سلطان سید اشرف جہانگیر کے وصال کی تاریخ ۲۸ محرم ۸۰۸ھ ہے۔ حضرت کے وصال کے وقت تقریباً ۸۳ لاکھ مرید تھے۔

ساتویں صدی ہجری کے آخر ربع میں سادات حسینی کی ایک مضبوط سلطنت خراسان میں قائم تھی جس کی عظمت اور جلالت کا سکہ دیگر سلاطین کے دلوں پر تھا۔ اس کی دو وجوہات تھیں، اول تو اس حکومت نے عادل، مدبّر سلاطین کے ہاتھوں استحکام پایا۔ دوسرے حکمراؤں کی سیادت اُن کی دینی برتری اور مذہبی تشخص کا سبب تھی۔

تیسری صدی ہجری میں سید تاج الدین بہلول نوربخشی نے اس سلطنت کی بنیاد رکھی تھی، جو بڑے صاحبِ فضل و کمال ہوشمند انسان تھے۔ آپ کے بعد آپ کے فرزند اور اولادیں والیٔ سلطنت ہوئیں اور اسی تسلسل میں حضرت قدوۃ الکبریٰ مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے والد حضرت سید ابراہیم شاہ تخت نشین ہوئے۔ حضرت سید ابراہیم کی سلطنت کا پایۂ تخت سمنان تھا۔

سمنان کوہِ البرز کے جنوب میں تہران (قدیم رے) اور دامغان کے بیچ میں واقع ہے جو ایران کا ایک نہایت قدیم شہر ہے۔

اسی سرزمین پر آٹھویں صدی ہجری کی ابتدا میں سادات حسینی کے ایک فرزند سید اشرف پیدا ہوئے۔ جو بعد میں قدوۃ الکبریٰ محبوب یزدانی غوث العالم جہانگیر اوحدالدین کے القاب و منصب سے نوازے گئے۔

حضرت مخدوم سلطان سید اشرف جہانگیر سمنانی کا سلسلۂ نسب حضرت سیدنا امام حسینؓ سے ہے۔

حضرت مخدوم سید اشرف جہانگیر کے والد ماجد والیٔ سلطنت کے ساتھ ساتھ ایک بلند مرتبہ عالم فاضل اور وقت کے ولی کامل تھے اور امور سلطنت کے انہماک کے باوجود درس وتدریس کا سلسلہ بھی

جاری رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کے دورِ حکومت میں ہزاروں طلبہ مختلف علوم وفنون کے ماہر وکامل ہو کر نکلے۔ جنھوں نے براہِ راست سلطان سید ابراہیم سے علم کے اسباق ختم کرائے تھے۔

حضرت مخدوم سلطان سید اشرف سمنانی کے استاد مولانا عمادالدین تبریزی استاد تھے۔ ایک سال کی مدت میں حضرت قدوۃ الکبریٰ نے ہفت قرأت کے ساتھ قرآن عظیم ختم فرمایا۔ سلطان حضرت سید ابراہیم خود بھی اپنے لختِ جگر کی علمی استعداد سے متعلق اساتذہ کو ہدایت دیا کرتے تھے۔ اور خود بھی نگرانی فرماتے تھے۔ چنانچہ جب آپ چودہ سال کے ہوئے تو آپ تمام علوم متداولہ پر عبور حاصل کر چکے تھے۔ معقولات ومنقولات دونوں پر یکساں حاوی تھے۔

حضرت مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانی جب پندرہ سال کے ہوئے تو والدِ ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اور رسم کے مطابق تاجِ شاہی آپ کے سر پر رکھا گیا آپ کی قابلیت، فراست، عدل وانصاف کی دھوم مچ گئی۔ خوشحالی اور فارغ البالی گھر گھر پھیل گئی۔

بارہ سال کا آپ کا عرصۂ حکمرانی صرف دنیاوی امور میں ہی نہیں گزرا۔ بلکہ آپ کا بڑا وقت سلوک کی تعلیم میں اور علمی مشاغل میں صرف ہوا۔ حضرت عبدالرزاق کاشانی سے خصوص الحکم پڑھی اور سلسلہ وحدۃ الوجود کی حقیقت سے پوری طرح واقفیت حاصل کی۔ اور ہر وقت اللہ کی یاد میں مستغرق رہنے لگے۔ اور معرفتِ الٰہی کا مقصد بن چکا تھا۔

آپ نے ترکِ سلطنت کیا اور تاجِ شاہی اپنے چھوٹے بھائی کے سر پر رکھا۔ اور ان کو نصیحت فرمائی کہ عدل وانصاف وشریعتِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی پابندی رکھنا اور فرمایا کہ "دائرہ رجال الغیب کی حفاظت کرنا۔ اور پر زور تاکید فرمائی کی سورہ مدسبع الشئر کی مداومت کرنا اور دنیا کا کوئی کام شریعت کی پابندی میں مانع نہ ہو۔ چھوٹے بھائی کو سلطنت تفویض کرنے کے بعد رختِ سفر باندھا۔ سفر کرتے ہوئے آپ بخارا پہنچے۔ وہاں سے سمرقند آئے جہاں سمرقند کے شیخ الاسلام سے ملاقات فرمائی۔ مہینوں جنگلوں، پہاڑوں اور ناقابلِ گزر راستوں سے منزل بہ منزل سفر طے کرتے ہوئے اس

آستانہ حضرت مخدوم سلطان سید اشرف جہانگیر سمنانی رح کچھوچھہ شریف

وقت کے) صوبہ سندھ (آج کے صوبہ پنجاب) کے شہر اوچھ پہنچے۔

اوچھ شہر اس وقت حضرت مخدوم جلال الدین جہانیاں جہانگشت رح کے قیام کی وجہ سے مرجع خلائق تھا۔ دوران قیام اوچھ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت نے آپ کو خرقۂ خلافت عطا فرمایا اور فرمایا کہ فقیر نے جو کچھ آج تک اکابرینِ مشائخ سے نعمتیں حاصل کی تھیں وہ سب کی سب تم کو دیدیں۔

اوچھ شریف سے دہلی حضرت نظام الدین اولیاؒ کے روضہ کی حاضری دیتے ہوئے دیگر بزرگان سلسلہ چشتیہ کے مزارات پر حاضر ہوتے ہوئے دو سال تک پیدل سفر کرتے ہوئے بنگال میں داخل ہوئے۔

پنڈوہ شریف (بنگال) میں آپ کے پیر و مرشد حضرت سلطان المرشدین علاؤالحق والدین گنج نبات آپ کے منتظر تھے۔

پنڈوہ شریف میں حضرت مخدوم سید اشرف جہانگیر کی آمد پر سلطان المرشدین شیخ علاؤالحق والدین گنج نبات کا مع اصحاب شہر کے باہر تشریف لاکر استقبال کرنا ایک غیر معمولی اور کافی اہم بات تھی۔ جوق در جوق لوگ جمع ہو گئے۔ حضرت سید اشرف سمنانی نے شیخ کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ حضرت شیخ نے اٹھا کر سینہ سے لگالیا۔ چار سال تک حضرت شیخ کی خدمت میں رہے۔ مجاہدات ومکاشفات، اشغال ذکر وفکر ہر طرح سے پیر و مرشد کی نگاہ میں کامیاب قرار پائے اور خطاب جہانگیر سے سرفراز ہوئے۔

ایک روز حضرت شیخ جب اسرار وحدت بیان فرمارہے تھے اور حضرت انہماک سے پیر و مرشد کی تقریر سُن رہے تھے تو تقریر ختم ہونے پر حضرت پیر و مرشد حضرت مخدوم سید اشرف کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا۔ فرزند اشرف میں نے اپنی استعداد و مقدور بھر کوشش کے ذریعہ تمھیں تعلیم دی اور تربیت کی۔ ہدایت و اسرارِ غیبی سے آگاہ کیا۔ اب مناسب ہے کہ تمھارے لیے کوئی مقام تجویز کیا جائے جہاں جاکر مخلوق خدا جو گمراہی کے دلدل میں پھنسی ہے اور فریب خوردہ صفات میں گرفتار ہے وہ تم سے فیض پائے۔ شیخ نے آپ کے لیے جونپور کا علاقہ منتخب فرمایا اور عید کا دن روانگی کے لیے متعین ہوا۔

آپ منزل بہ منزل کوچ فرماتے رہے۔ قصبۂ محمد آباد گہنہ (ضلع اعظم گڈھ) میں مناقب اصحاب رسول ؐ پر ایک بہت ہی جامع تقریر فرمائی۔ مولانا سید خاں اور ان کے معاون قاضی حمید الدین پوری عقیدت سے حاضرِ خدمت رہے۔ اور کثیر تعداد میں لوگ مشرف بیعت ہوئے۔ ظفر آباد (ضلع جونپور) کی آمد پر وہاں کے ایک مشہور نوجوان عالم دین شیخ کبیر نے انتہائی عقیدت کے ساتھ شرفِ بیعت حاصل کیا۔ دیگر بیشتر افراد بھی حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔ جونپور ہوتے ہوئے حضرت بیرونِ ہند کے سفر کے لیے روانہ ہوگئے۔

بیرون ہند کے سفر سے واپسی پر حضرت پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایک عرصہ تک قیام فرمایا۔ حضرت شیخ نے قدوۃ الکبریٰ حضرت مخدوم سلطان سید اشرف جہانگیر سمنانی کو مرکزِ رشد و ہدایت و مقام آرام گاہ آخرت سے آگاہ فرمایا۔

بیرونِ ہند کے سفر میں حضرت بصرہ، کربلائے معلیٰ، کاظمین شریفین، نجف اشرف ہوتے ہوئے بغداد تشریف لائے اور اپنے بھانجے جو حضرت غوث اعظم ؓ کی اولاد سے ہیں حضرت سید عبدالرزاق نور العین کو اپنی فرزندی میں قبول فرمایا اور انھیں اپنا روحانی جانشین مقرر فرمایا۔

بغداد سے دمشق بعد عید الفطر مدینہ منورہ اور حج کے قریب مکۃ اللہ تشریف لے گئے۔

حضرت اشرف یمن تشریف لے گئے، جہاں شیخ نظام الدین یمنی آپ کے گرویدہ ہوگئے۔ بیرونِ ہند سے واپسی پر جب ہندستان کے سفر میں بہار پہنچے تو وہاں حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الدین یحییٰ منیری ؒ کا وصال ہو چکا تھا۔ مخدوم الملک کی وصیت کے مطابق آپ کا جنازہ رکھا تھا۔ تارک السلطنت سید زادہ آکر نماز پڑھائیں گے۔ حضرت میر شریف پہونچے اور مخدوم الملک کی نماز جنازہ ادا فرمائی۔

پیر و مرشد کی ہدایت کے مطابق حضرت مخدوم سید اشرف سمنانی جونپور تشریف لائے، حاکمِ جونپور نے قیام کی درخواست کی، آپ نے فرمایا کہ تمھاری حدودِ سلطنت سے باہر رہوں گا۔ آپ کا کچھوچھہ شریف اُس دور میں شاہانِ شرقی جونپور کے حدود سلطنت میں تھا۔ جونپور سے جب آپ بعد میں ہڑ تشریف لائے۔ قرب و جوار کے لوگ آپ کی زیارت کے لیے امنڈ پڑے، اس گاؤں کے بڑے رئیس ملک محمود تھے۔ انھوں نے شاندار استقبال کیا۔ زیارت سے مشرف ہوئے۔ بیعت سے سرفراز فرماتے گئے۔

موضع مذکور سمت مغرب میں قریب ہی ایک گول تالاب کا آپ نے معائنہ کیا جس کے بیچ و بیچ ایک ٹیلہ تھا۔ حضرت نے فرمایا یہی وہ جگہ ہے جو میرے پیر و مرشد نے بہ نظرِ کشف دکھائی تھی۔ ملک محمود جو سلسلہ اشرفیہ سے وابستہ ہو چکے تھے فرمایا کہ اس ٹیلہ پر ایک جوگی جادوگر رہتا ہے۔

چنانچہ جادوگر نے اپنے جادو کے تمام کمالات اور شعبدے دکھائے اور جب اسے یقین ہوگیا کہ باطل حق پر فتحیاب نہیں ہو سکتا تو وہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، اور حضرت کے پیروں پر گر پڑا۔ اور اسلام قبول کیا، اس کے ساتھ ہی اس کے پانچ سو چیلے بھی مسلمان ہوگئے۔ اس کے اسلام لانے کے بعد قرب و جوار کے پانچ ہزار مشرکین دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔

حضرت کے وصال کے وقت تقریباً ۸۳ لاکھ مرید تھے جن میں ۵۳ لاکھ غیر مسلم حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔

وصال سے قبل حضرت نے قبر تیار فرمائی اور ایک شبانہ روز
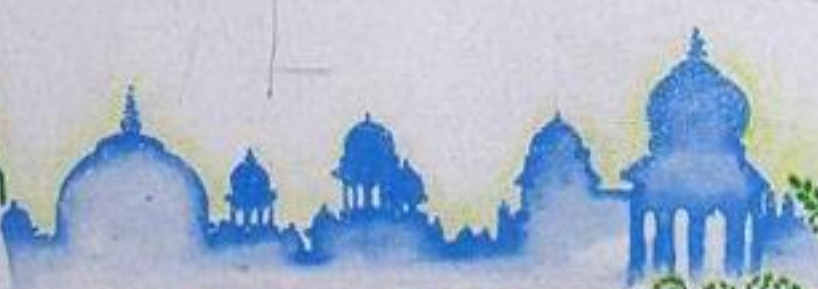
اس قبر میں رہے ـــــ دوسرے روز صبح ایک مضمون تحریر کرکے لائے جو رسالہ "قربیہ و بشارۃ المریدین" کے نام سے مشہور ہے۔ جو عقائد، اعتقادات، بشارت و ہدایت پر مشتمل ہے۔ تفصیلِ متن لطائف اشرفی میں موجود ہے۔

حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اخبار الاخیار میں ذکر کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دنیا میں صرف تین محبوب گزرے ہیں۔ پہلے محبوب سبحانی شیخ عبدالقادر جیلانی، دوسرے حضرت نظام الدین اولیا محبوب الٰہی، تیسرے غوث العالم محبوبِ یزدانی مخدوم سید اشرف سمنانی۔

حضرت قدوۃ الکبریٰ غوث العالم محبوب یزدانی سلطان سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ کو اپنے وقت کے بیشتر علوم و فنون میں دسترس تھی۔ قرآن مجید، علم حدیث و فقہ پر پورا عبور تھا۔ علم تصوّف میں کمال ادراک تھا۔ قوت حافظہ ایسی تھی کہ ایک سال کے عرصہ میں آپ نے سبع قرأت کے ساتھ قرآن پاک حفظ فرمایا۔ آپ کی تصانیف میں ایک کتاب فتاویٰ اشرفیہ بھی تھی جو جامع ازہر کی قدیم لائبریری میں ہے۔

ایک طرف اگر آپ کی عملی زندگی ترک دنیا کا نمونہ پیش کرتی ہے تو دوسری طرف آپ کا تفقّہ یہ بتاتا ہے کہ راہِ طریقت کے رہبر علم دین میں کسی سے کم نہیں۔ حضرت کے ملفوظات، تصانیف، خطوط آپ کی علمی قابلیت پر شاہد ہیں۔

لطائفِ اشرفی خود آپ کے وسعتِ علم اور علمی بصیرت کا پتہ دیتی ہے۔ یہ کتاب تصوّف اسلام کی تمام بنیادی کتابوں کا نچوڑ ہے۔

آپ کے سیکڑوں اشعار لطائفِ اشرفی، مکتوباتِ اشرفی اور دوسری تصانیف میں موجود ہیں۔

دیوان اشرف کے اشعار جو عالمِ بے خودی میں کہے گئے ہیں شعری لطافت، جذبہ اور سوز و گداز میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں۔

حضرت مخدوم سید اشرف سمنانی نظم و نثر پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ نثر میں ان کی انشار پردازی کے نہایت عمدہ نمونے ملتے ہیں اگرچہ ان کی فطری روش سادہ نگاری ہے پھر بھی زمانے کے علمار اور امرار میں رائج طرز نگارش نے ان کو پر تکلف اور دشوار راہ پر ڈال دیا تھا۔

حضرت مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانی کی تصانیف :۔

(۱) نحو اشرفیہ (جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ کتاب عربی میں تھی۔ حضرت نورالعین اس کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں "افضلِ روزگار را دستور شد") (۲) شرح ھدایہ (یہ فقہ پر تھی) (۳) شرح عوارف، (۴) شرح خصوص الحکم، (۵) فوائد العقائد۔ (یہ کتاب پہلے فارسی میں لکھی گئی، اس کے بعد اسی کتاب کا عربی ترجمہ کیا۔) فتاویٰ اشرفیہ (جامع ازہر کی قدیم لائبریری میں ہے) (۷) زیج سامانی (۸) تفسیر نور بخشیہ (۹) کنز الاسرار (۱۰) دیوان اشرف (۱۱) رسالۂ غوثیہ (۱۲) رسالہ در مناقب خلفائے راشدین (۱۳) مُراۃ الحقائق (اصلاحات تصوف کی تشریح پر مشتمل) (۱۴) بحر الذاکرین (۱۵) حجتہ الذاکرین (۱۶) حاشیہ بر حواشی مبارک (مولانا برہان الدین مرغیانی) (۱۷) کنز الدقائق (۱۸) شیخ علاء الدولہ سمنانی کی لکھی ہوئی کتاب تاریخ کی فہرست اسمار رجال بھی آپ نے ترتیب دی تھی۔ (۱۹) بشارت الاخوان (۲۰) مکتوباتِ اشرفی مرتبہ حضرت نظام یمنی (۲۱) مکتوبات اشرفی مرتبہ حضرت در یتیم (۲۲) لطائف اشرفی (ملفوظاتِ حضرت مخدوم سمنانی مرتبہ حضرت نظام یمنی (۲۳) مکتوباتِ اشرفی (جمع شدہ حضرت نورالعین) (۲۴) ضمیمہ مکتوباتِ اشرفی (۲۵) اشرف الانساب (یہ کتاب قزوین میں لکھی گئی) (۲۶) فوائد الاشرف (گجرات میں لکھی گئی) (۲۷) اشرف الفوائد (گجرات میں لکھی گئی) (۲۸) بشارت الذاکرین (۲۹) تنبیہ الاخوان (سیف خاں کے لیے لکھی گئی) (۳۰) ارشاد الاخوان (یہ کتاب بھی سیف خاں کے لیے لکھی گئی) (۳۱) ترجمہ قرآن پاک بزبان فارسی بہ عہد سلطانی (یہ قرآن پاک قدیم ترک زمانے کی لائبریری مدینۂ منورہ سے

لکھنؤ

مانا بہت حسیں ہے، مانا بہت جواں ہے
یادوں کی سرزمیں ہے، خوابوں کا آسماں ہے
بستی ہے صاحبوں کی، شہرِ سخن وراں ہے
سب کچھ ہے پھر بھی جیسے ہر شے دھواں دھواں ہے
میں جس کو ڈھونڈتا ہوں وہ لکھنؤ کہاں ہے

ہیں میرؔ و میرزا بھی، دفن اپنے لکھنؤ میں
غالبؔ ہیں اک اضافہ ناسخؔ کی آبرو میں
رطب اللساں یگانہؔ، آتشؔ کی گفتگو میں
تھی ان کی جو زباں اب سب کی وہی زباں ہے
میں جس کو ڈھونڈتا ہوں وہ لکھنؤ کہاں ہے

ذہنِ دبیرؔ دیکھا، طبعِ انیسؔ دیکھی
جوشِ ملی جہاں بھی ہم کو نفیسؔ دیکھی
ہر شمعِ انجمن کی اپنی جلیس دیکھی
کیا نامِ شوقؔ ہے جو اب تک ادب کی جاں ہے
میں جس کو ڈھونڈتا ہوں وہ لکھنؤ کہاں ہے

محسنؔ کی اُف وہ نعتیں حضرت امیرؔ کی سی
دنیا، کسی فقیرِ روشن ضمیر کی سی
سب خصلتیں کماں سے اک چھوٹے تیر کی سی
شاید کہ نام اسی کا معراجِ عاشقاں ہے
میں جس کو ڈھونڈتا ہوں وہ لکھنؤ کہاں ہے

کیا بات ہے صفیؔ کی غزلوں کے بانکپن کی
کلیاں چٹک رہی ہوں جیسے کسی چمن کی
توصیف کس زباں سے ہو آرزوؔ کے فن کی
جو مصرعِ غزل ہے، بس اک کھنچی کماں ہے
میں جس کو ڈھونڈتا ہوں وہ لکھنؤ کہاں ہے

مرزا عزیزؔ ہوں وہ یا میرزا یگانہؔ
ہر اک کا ہر سخن تھا، کس درجہ عارفانہ
مجھ سے سنو کہ میں نے دیکھا ہے وہ زمانہ
سر پر انھیں کا سایہ اب تک رواں دواں ہے
میں جس کو ڈھونڈتا ہوں وہ لکھنؤ کہاں ہے

جوشؔ و نسیمؔ و چکبستؔ، اپنی ہی سرزمیں کے
اصغرؔ، فراقؔ، حسرتؔ، شیدا اسی حسیں کے
اردو جہاں جہاں ہے، سب خوشہ چیں یہیں کے
جو ذرّہ جس جگہ ہے، روشن گرِ جہاں ہے
میں جس کو ڈھونڈتا ہوں وہ لکھنؤ کہاں ہے

سالکؔ، مجازؔ، افسرؔ، سب نقشِ جاوداں ہیں
سب اپنے کارواں کے خود میرِ کارواں ہیں
ہے باغِ لکھنؤ اک، یہ اس کے باغباں ہیں
ہے کم ضرور پانی چشمہ مگر رواں ہے
میں جس کو ڈھونڈتا ہوں وہ لکھنؤ کہاں ہے

کیا فن تھا کارچوبی، کیا شے تھی جامدانی
ململ کی اور چکن کی، اللہ ری قدردانی
مٹی کے تھے کھلونے، یا شاہ کارِ مانی
پکوان ہیں نہ ویسے، نہ ویسی اب زباں ہے
میں جس کو ڈھونڈتا ہوں وہ لکھنؤ کہاں ہے

کیا رعبِ آصفی تھا، فن میں عمارتوں کے
دروازے جن پہ وا تھے، ساری بشارتوں کے
اختر پیا، سے سنیئے، قصے مہارتوں کے
رنگین دم قدم سے جن کے یہ داستاں ہے
میں جس کو ڈھونڈتا ہوں وہ لکھنؤ کہاں ہے

عمر انصاری
امین آباد لکھنؤ

امامباڑہ مغل صاحبہ
وزیر باغ روڈ، لکھنؤ
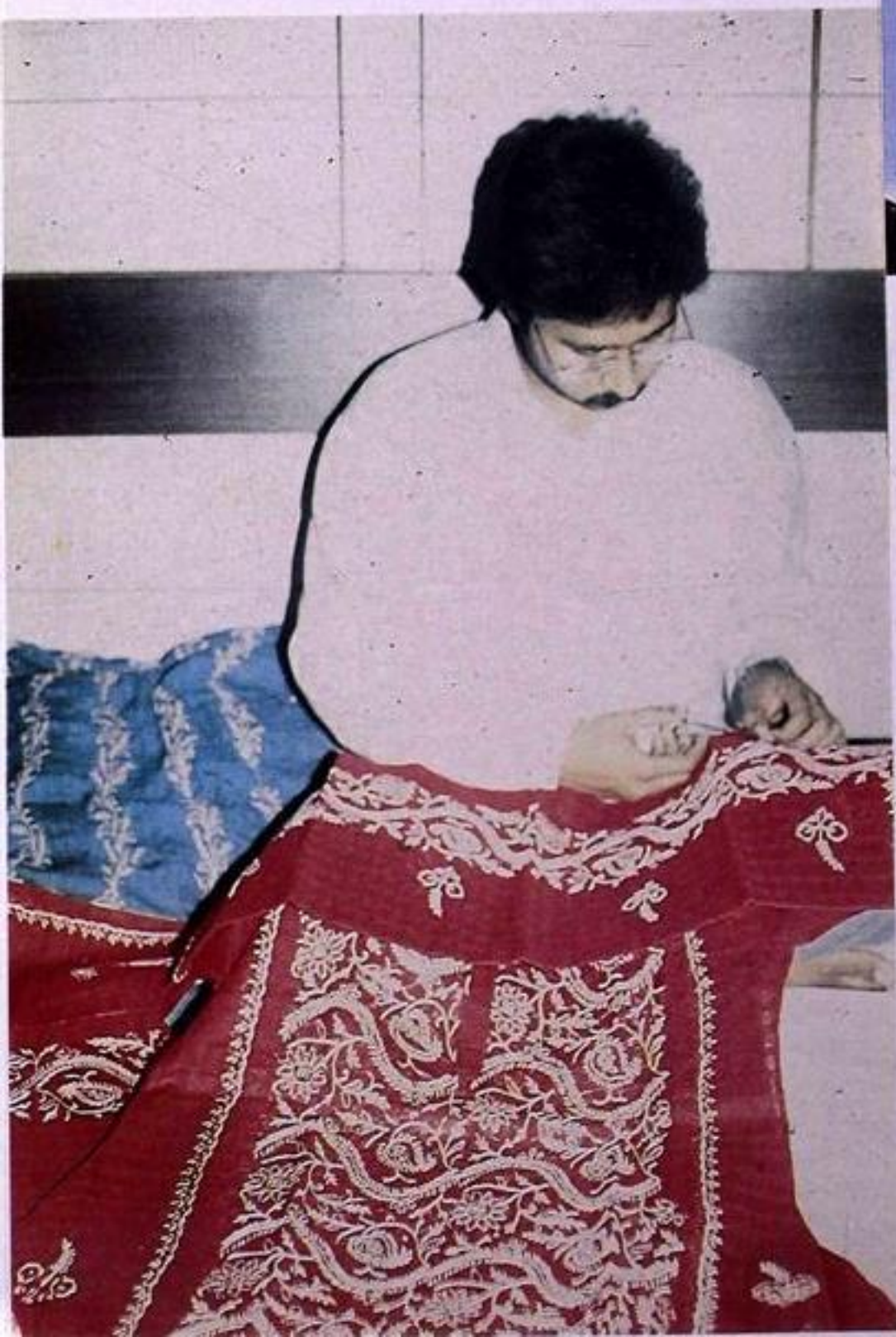
لکھنؤ کی دستکاری
اور دستکار
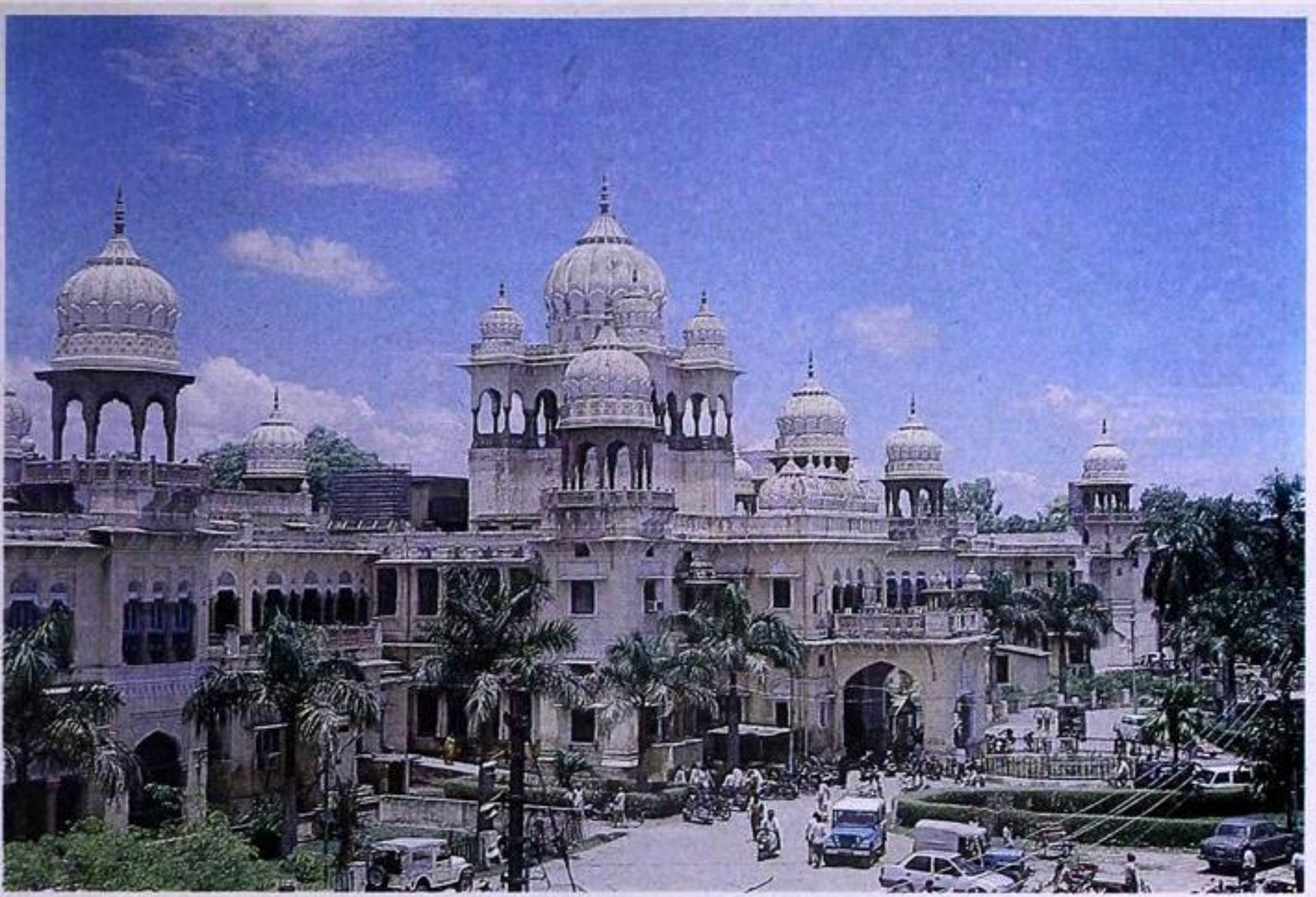
کنگ جارج میڈیکل کالج لکھنؤ

امامباڑہ آصفی (بڑا امامباڑہ) اور مسجد کا ایک منظر رومی گیٹ کے اوپر سے
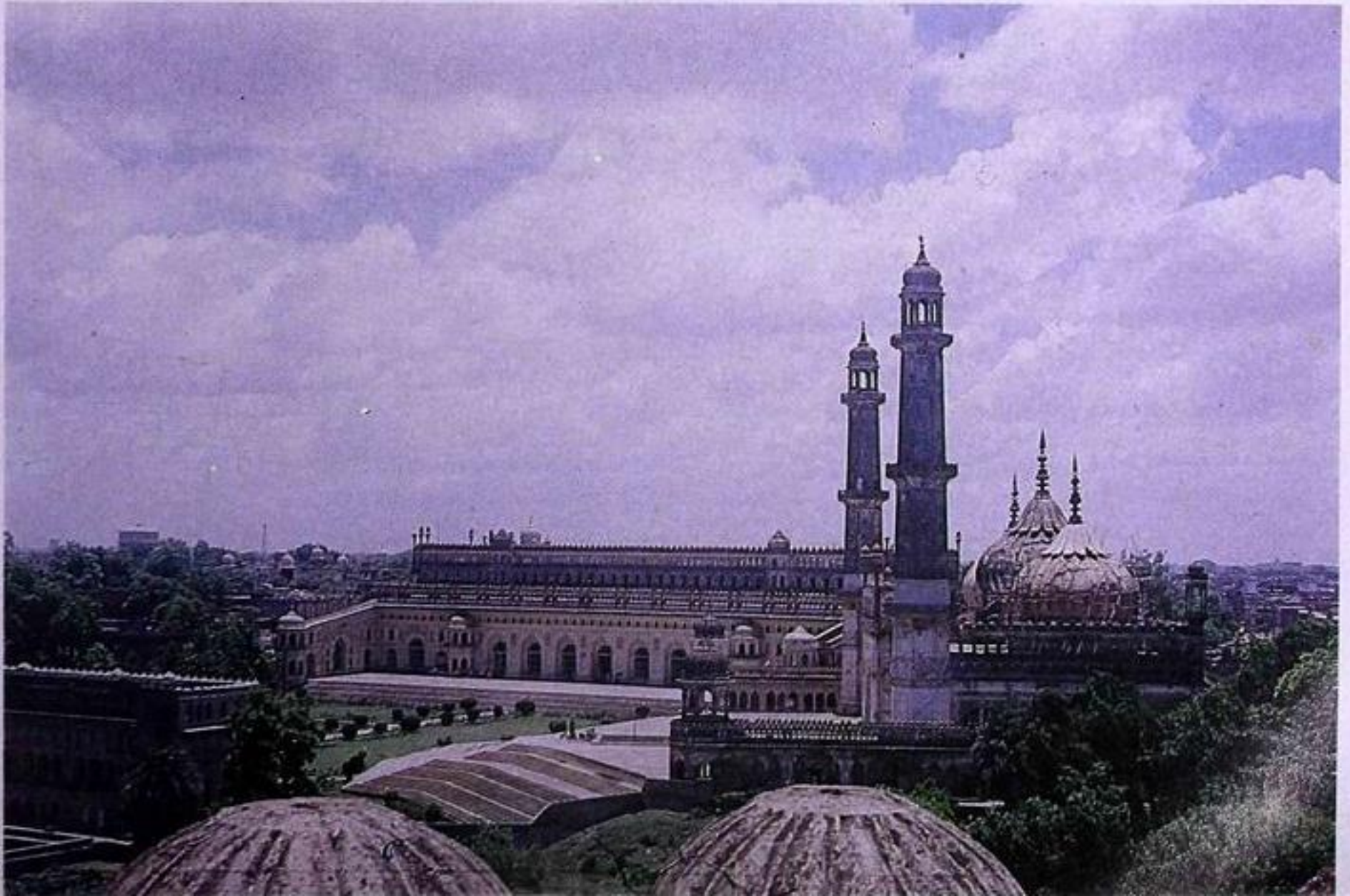
اسلم محمود
اے ۸۸۵۔ اندرانگر۔ لکھنؤ

اودھ اور اطراف کی
چند انوکھی اردو مطبوعات

اسلم محمود صاحب ادبی تحقیق میں ایک خاص اہمیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے جتنی کتابوں کا ذکر کیا ہے وہ سب ان کے پاس موجود ہیں۔ تاہم ان میں سے کچھ کتابیں خاص اہمیت کی حامل نہیں ہیں لیکن زندگی بڑی متنوع ہوتی ہے۔ اسی طرح ادب میں بھی بے شمار گوشے ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض گوشوں سے متعلق کتابیں ان کے ذخیرۂ کتب میں موجود ہیں۔ خصوصاً نثر میں صناعی پر یہ کتابیں بہت اہم ہیں اور ان کو اسلم محمود صاحب کے پاس دیکھا بھی جا سکتا ہے۔

ایڈیٹر

اردو کی پرانی مطبوعات کی ابھی تک کوئی اہم وضاحتی فہرست نہیں چھپی ہے۔ اشاعت گھروں کی فہرستیں بیشتر بے ترتیب چھاپی گئی ہیں کتاب یا مصنف کے نام سے اکثر موضوع کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تاریخ ادب میں جن کتابوں کو جگہ پانا چاہیے ان کا ذکر بالکل غائب رہتا ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ شعری ادب، تذکرۂ ادبا، اور علمی نثر کے علاوہ اور کسی موضوع پر کتابوں کو ادب کی تاریخ میں شامل نہیں کیا جاتا۔

بہت سی علمی و ادبی کتابیں ایسی ہیں جو اردو ادب کی کڑی ہیں لیکن سرسری طور سے ان کے بارے میں لکھ کر بات آگے بڑھائی جاتی ہے۔ وجہ یہ ہوتی ہے کہ مصنف نے کتاب کو دیکھا ہی نہیں اور صرف ناواقف قاری کو مرعوب کرنے یا ببلیوگرافی کو بھاری بنانے کے لیے اس کا نام لیا جاتا ہے اس طرح مصنف اندھیرے میں تیر چلاتا ہے اور متن کے بارے میں اپنی بے بنیاد رائے دے دیتا ہے جو بعد میں دوسرے مصنفین اپنی کتاب میں نقل کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک کتاب "نوابی دربار" تھی جس کو نثر کی کتاب سمجھ کر کئی لوگوں نے حوالہ دیا۔ جب یہ کتاب چند سال پیشتر دوبارہ چھپی تو معلوم ہوا کہ نثری قصہ نہیں ڈراما ہے۔

نول کشور پریس لکھنؤ، حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی اور صدیق بک ڈپو لکھنؤ نے کتابوں کی طویل فہرستیں چھاپی تھیں جن میں کتابوں کو موضوع وار تقسیم کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ حالی پبلشنگ ہاؤس کی فہرست میں ادیبوں کی تصویریں بھی شامل تھیں۔ یہ اردو میں غالباً اپنی قسم کی پہلی کوشش تھی اور اس کے بعد شاید اردو میں کوئی ایسی فہرست نہیں چھپی، جس میں تصویریں اتنی تعداد میں دی ہوں۔ اب یہ فہرستیں بھی بالکل نایاب ہیں۔

انگریزی اور دوسرے مغربی اشاعت خانوں کا عام رواج ہے کہ آنے والی کتابوں کی وضاحتی فہرست سال میں دوبار یعنی بہار (مارچ، اپریل) اور خزاں (ستمبر، اکتوبر) میں شائع کرتے ہیں۔ زیادہ تر کتابوں کا سرورق یا مصنفوں کی تصویریں موضوع وار درج رہتی ہیں۔ کوشش یہ بھی رہتی ہے کہ متن کی خصوصیت اور مختصر سا کسی تبصرے سے اقتباس نمائندہ چھپنے والی کتابوں پر شامل ہو۔ یہ فہرستیں عمدہ کاغذ پر دیدہ زیب طریقے سے اور بہت سلیقے سے شائع ہوتی ہیں۔

اردو میں اچھی فہرستوں کی کوتاہی نجی طور پر کتابوں کو چھاپنے کی روش اور قاری کی عدم دلچسپی سے بہت سی اہم کتابیں

گمنامی میں پڑی ہیں اور اچھا حصّہ تو اُن کا ناپید ہوگیا ہے۔ کمیاب و نایاب کتابوں کے کتب فروش بھی عنقا ہوتے جارہے ہیں۔ جس بے احتیاطی سے اُردو والوں کے گھروں میں کتابیں رہتی ہیں اس کو دیکھتے ہوئے یہ حیرت کی بات ہے کہ اب بھی کبھی کبھی بازار میں انیسویں صدی کی چھپی ہوئی کچھ کتابیں نظر آجاتی ہیں کیوں کہ انفرادی طور پر اُردو کتابیں جمع کرنے والے بہت کم ہیں اس لیے زیادہ خرید لائبریریوں میں ہی ہوتی ہے۔ لائبریریوں کے لئے خریدنے والے عام طور سے یا تو واقفیت زیادہ نہیں رکھتے اور یا پھر دلچسپی نہیں لیتے۔ شعری مجموعوں، ناول، افسانے اور عام ادبی و علمی کتابوں کے علاوہ ایسے اہم موضوعات جیسے صنعت و حرفت، لطائف، خطاطی و موسیقی وغیرہ پر کتابیں مشکل ہی سے خریدی جاتی ہیں۔ خدا بھلا کرے ان ناواقف کاروں کا، کہ ہم جیسوں کو بھی اس دریا میں ہاتھ ڈالنے کا موقع مل جاتا ہے اور چند ڈگر سے ہٹی کتابیں ہم کو بھی مل جاتی ہیں۔

ان ہی میں سے پندرہ بھولی بسری کتابوں کا مختصر جائزہ آگے لیا جائے گا۔ یہ کتابیں کسی نہ کسی اعتبار سے اہم ہیں لیکن بہرحال گمنامی میں پڑی ہیں۔ زیادہ تر ان میں نایاب ہیں اور ان کا کسی بھی قیمت پر ملنا اگر ناممکن نہیں تو آسان بھی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس انتخاب میں بعض ایسی کتابیں بھی ہیں جن کو اپنی خصوصیت کی بنا پر اہمیت دینے کی ضرورت ہے۔

(۱) آتشِ خانہ یا خمارِ کیفیات

مصنف: خام۔ مطبع کا نام اور مقام اشاعت درج نہیں

۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء صفحات ۹۶ ، ۷ رنگین تصاویر

"آتش خانہ" ایک سو پچاس اشعار کی نظم ہے جو عورتوں کے پستان کی تعریف میں ۱۹۳۸ء میں کہی گئی تھی۔

اسی انداز کی ایک غزل شیخ امداد علی بحر لکھنوی کے دیوان میں بھی ملتی ہے مگر خام کی یہ نظم اسی طور پر ڈیڑھ سو اشعار پورے کرتی ہے۔

اس نظم کی تقریظ جگر مرادآبادی نے لکھی ہے جو فرماتے ہیں کہ وہ مصنّف کے تعارف سے زیادہ نظم کو ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ نظم کتابی شکل میں جیبی سائز پر چھپی تھی۔ اتنی چھوٹی کہ قمیص کی جیب میں آسانی سے آجائے۔ کتاب میں سات رنگین تصویریں عورتوں کی ہیں، لیکن معمولی آرٹ کا نمونہ ہیں۔ کتاب غالباً بازار میں نہیں آئی اور مصنف نے صرف اپنے حلقۂ احباب میں تقسیم کی تھی۔

سوال یہ ہے کہ اس عجیب نظم کا خالق کون تھا۔ ؟ فرضی نام "خام" کتاب پر پڑا ہے۔ اس نام کے حروف تہجی 'خ'، 'الف' اور 'م' ہیں یعنی الٹا پڑھنے سے 'م'، 'الف' اور 'خ' ہوتے ہیں، اسی سے نظم کے شاعر کا نام نکلتا ہے یعنی محمد اصطفےٰ خاں جو عطریات کے مشہور کارخانے اصغر علی محمد علی کے مالک تھے۔ شاعری میں محمد اصطفےٰ خاں اصطفےٰ لکھنوی سید عبدالحکیم سیف شاہجہاں پوری کے شاگرد تھے۔ اصطفےٰ لکھنوی کا ایک مجموعۂ کلام "آئینہ" کے نام سے بھی چھپا ہے۔

"آتش خانہ" ایک ایسی کتاب ہے جس کے بارے میں شاید اب بہت کم لوگ جانتے ہوں گے۔ یہ کتاب بالکل نایاب ہے یہانتک کہ اصطفےٰ خاں کے پوتے جو حیات ہیں ان کے پاس بھی نہیں ہے اور نہ ہی انھیں اس کا علم تھا۔ جہاں تک میرے محدود مطالعے کا تعلق ہے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ کسی اور زبان میں اس نوعیت کی کتاب نہیں چھپی ہے۔

(۲) انتخابِ نقص

مصنف: ابو محمد عبدالغفور خاں نسّاخ مطبع نظامی کان پور

ماہ محرّم ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء۔ صفحات ۳۲

یہ رسالہ اعتراضاتِ کلام مرزا سلامت علی دبیر و میر ببر علی انیس پر مبنی ہے۔ جب ان مشہور شاعروں کا کلام طبع ہوا تو اس میں مصنف نے

"عجب طرح کا بے ربط پایا، چپانی معنی اور اسلوب ترکیب اور مراعات الفاظ ایک طرف، بعض اشعار کے وزن و قافیہ و ردیف میں بھی فتور نظر آیا۔ معلوم ہوا کہ ماہرین فن جو اُن کے کلام میں سلامتی سقم سے خاموش تھے، بے جا نہ تھا اور کاہ گاہ راقم کو جو شبہات سننے میں واقع ہوئے تھے، اصل سے خالی نہ تھے۔"

مرزا دبیر کے کلام کو نسّاخ نے پہلے نشانہ بنایا ہے۔ مثال کے طور پر یہ مصرعے لیجئے:

وہ تیغیں ذوالفقار کے فقروں میں آگئیں

جوہر کی تنگ چشمی سے آنکھیں چُرا گئیں
یکسر شکستِ فاش سرِ دست کھا گئیں
تھیں آپ کم حیا کہ عرق میں نہا گئیں

ناسخ نے یہاں اعتراض یوں کیا ہے:۔

"کم حیا ہو کر عرق میں نہانا کیا معنی؟ کیوں کہ عرق لازمۂ خجالت ہے اور خجالت اس کو ہوتی ہے جس کو حیا ہو۔ لہٰذا اگر باحیا لکھتے تو معنی درست ہوتے لیکن یہ بھی استادی کے خلاف تھا۔"

دبیر کے اِن مصرعوں میں بھی دلچسپ نقص نکالا ہے:

آنکھوں کی تری روغنِ بادام سے بہتر
عارض کا پسینہ ہے گلابِ گلِ احمر

ناسخ لکھتے ہیں:

گلابِ گل کسی کو نہ کہتے سُنا نہ لکھتے دیکھا۔ اس کی سند چاہیئے۔ البتہ بعضے عوام بے سواد شبِ برات و شب قدر کی رات اور آبِ زمزم کا پانی بولتے ہیں۔ گلابِ گل بھی اسی قسم میں داخل ہے۔"

اغلاطِ مرثیہ میر انیس ص۳۲ کے آخر سے شروع ہوتے ہیں۔ انیس کے اِن مصرعوں پر بھی ناسخ کو اعتراض ہے:

یہ سُن کے ضعیفہ کا لگا کانپنے اندام
بولی یہ بھلا آنے کا ہے کون سا ہنگام

ناسخ سمجھاتے ہیں کہ:

"خوف اور ہراس کی جگہ اندام کانپنے لگے بصیغۂ جمع بولا جاتا ہے اور جہاں اندام کا بافراد مذکور ہوتا ہے اس سے اور ہی اندام مُراد ہوتا ہے۔"

جب "انتخابِ نقص" چھپی تو لکھنؤ میں ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ کسی کو یہ گوارا نہ تھا کہ ناسخ جیسا بنگال کا رہنے والا لکھنؤ کے شعراء پر انگلیاں اُٹھائے نتیجہ یہ ہوا کہ جوابی کتابیں چھپیں اور ایک ادبی معرکے کی صورت اختیار کر لی۔ لکھنوی جوابوں پر یہ کتابیں سامنے آئیں:

- تطہیر الاوساخ، لنسخ النّاسخ۔ مرزا محمد رضا معجز (شاگرد شیخ ناسخ)
مطبع شعلۂ طور کان پور۔ ۲ رمضان ۱۲۹۶ھ صفحات ۱۵۱
- گستاخی معاف۔ سید مرتضیٰ گستاخ امروہوی
مطبع شعلۂ طور کان پور ۲۵ رمضان ۱۲۹۶ھ صفحات ۸۰
- تفضیح۔ آغا علی
اودھ پریس لکھنؤ۔ ۱۲۹۹ھ صفحات ۲۳۸
- مسکتِ شائستہ۔ مظفر علی ہنر (یہ کتاب چھپی مگر ضائع ہو گئی صرف اس کی تقریظ باقی رہی جو الگ سے چھپی)۔
- تقریظ مُسکتِ شائستہ۔ سید محمد تقی فیض لکھنوی
مطبع قادریہ عمر محمد ناخدا۔ کلکتہ ۱۳۰۱ھ۔ صفحات ۲۸
- سنانِ دل خراش۔ سید محمد اسماعیل حسین منیر شکوہ آبادی۔
یہ کتاب قلمی ہے لیکن معجز نے اپنی کتاب میں اس سے کام لیا ہے۔

ناسخ کے ایک شاگرد عصمت اللہ انسخ نے بھی اپنے استاد کی طرفداری میں ایک کتاب "طومار اغلاط" آگرہ سے ۱۲۹۰ھ میں شائع کی۔

"انتخابِ نقص" اُردو کے ادبی معرکوں کی ایک اہم کڑی ہے لیکن یہ تقریباً یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ کم از کم اس صدی میں شاید ہی کسی اُردو ادیب نے اس کتاب کی زیارت کی ہو۔ بہت سے ادیبوں نے صرف حوالہ دیا ہے اور وہ بھی اس معرکے کی دوسری کتابوں سے جن میں "انتخابِ نقص" کی عبارتیں نقل کی گئی ہیں اس لئے کہ یہ کتاب قطعی نایاب ہے گو کہ تاریخِ اردو ادب میں اس کتاب کو جگہ دی گئی ہے۔

(۳) بادشاہ نامہ

مصنف: نواب صدر محل صدر۔ مطبع سلطانی کلکتہ
ذیقعدہ ۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۲ء صفحات ۲۰۲

یہ نواب صدر محل صدر جو بادشاہ اودھ واجد علی شاہ کی منکوحہ بیگم تھیں، کا دیوان ہے۔ اس میں کل ۱۱۰ غزلیں ہیں۔ اس دیوان کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر غزل کے ہر شعر میں واجد علی شاہ اختر کی تعریف ہے اور کسی نہ کسی طور سے ان کا نام یا خطاب آتا ہے۔ اپنے رنگ کا عجیب دیوان ہے۔

چند اشعار حاضر ہیں ؎

بڑھا رتبہ شہِ واجد علی کا   بجے ڈنکا شہِ واجد علی کا

حسین سبزہ رو غنچہ دہن محفل میں حاضر ہیں
پھلا پھولا ہوا سارا چمن ہے جانِ عالم کا

زندگی بھر یہ حلاوت یہ مزا باقی رہا   جان ہاتھ آئی کہ پایا الفِ آخر میں خط

دیکھو یہ سامنے کا نشانہ نہ چوکنا
دل پر ہمارے تیر لگا گوشہ اودھ

"آتشِ خانہ" کی طرح یہ کتاب بھی اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے جس میں ہر شعر میں معشوق اپنے محبوب کا نام لیتا ہے۔ دوسری زبانوں میں شاید اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔

(۴) تحریرِ عاشق

مصنفہ: نواب بیگم عرف چھوٹی بیگم حجاب۔ مطبع حسینی اثنا عشری لکھنؤ۔ جمادی الثانی ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء صفحات ۸۰۔

یہ حیرت کی بات ہے کہ اگر ہم انیسویں صدی میں چھپے اُردو دواوین شاعرات کا جائزہ لیں تو ایک درجن سے زیادہ ہرگز موجود نہیں۔ بد قسمتی سے شاعرات کا کلام سنجیدگی سے نہیں دیکھا جاتا تھا اور یہ غلط فہمی آج تک رائج ہے کہ خواتین اپنا کلام دوسروں سے کہلواتی ہیں۔ کچھ شاعرات پر یہ الزام شاید صحیح ہو مگر یہ تو بہت سے شاعروں پر بھی عائد ہو سکتا ہے۔ شاعرات کے خلاف اس تعصب ہی کی وجہ سے اُردو ادب میں کوئی بہت بڑی شاعرہ نہ ہوئی تھی۔

حجاب کا دیوان "تحریرِ عاشق" شاعراتِ اُردو کے اولین مطبوعہ دواوین میں سے ہے۔ ہر غزل کی ابتدا میں بحر اور وزن درج ہیں۔ حجاب کے والد کا نام داروغہ اعظم علی خاں دیا ہے اور شاعرہ کا لکھنؤ سے تعلق تھا۔

نمونے کے چند اشعار یہ ہیں ؎

جب ہم نے تجھی سے تری الفت کو چھپایا
پھر اور کے آگے ہمیں اظہار سے مطلب

ڈیوڑھی پہ حجاب اس کے ہیں درباں کی طرح ہم
دربار سے ہے کام نہ سرکار سے مطلب

آگے سے بھی ہے زیادہ بے قراری اِن دنوں
شکل پہچانی نہیں جاتی ہماری اِن دنوں

عزت تو کیسی؟ دیتے ہیں ذلت مجھے حضور
یہ آپ آپ، آپ کی تو تو سے کم نہیں

اشکِ غم حدتِ دوزخ کو بھلا دیتا ہے
گرچہ پانی ہے مگر آگ لگا دیتا ہے

(۵) تعلیم النستعلیق

مصنف: شیخ عابد علی الہ آبادی۔ مطبع آصفی کان پور ۱۸۶۲ء صفحات ۸

نستعلیق طرزِ خطاطی پر یہ مختصر ترین رسالہ اُردو میں پہلی مطبوعہ کوشش ہے۔ مصنف نے لکھا ہے کہ حروف نستعلیق میں بکثرت چھپی وصلیوں سے اگر کوئی اہلِ شوق طرزِ تحریرِ حروف کی تعلیم حاصل کرنا چاہے تو خوش خط تو لکھ لے گا مگر استادوں کے قواعد و ضوابط سے بے بہرہ رہے گا۔ شیخ عابد علی خلف شیخ ذاکر علی انصاری الہ آبادی نے یہ رسالہ بابو مادھو پرشاد، تحصیل دار کھاگا، ضلع فتحپور کی فرمائش پر لکھا تھا۔

اس رسالے میں فنِ نستعلیق نویسی کے اصول و ضوابط بتائے گئے ہیں۔ اس میں تاریخ خط نستعلیق، اس کے موجد اور ان کے شاگردوں کا بھی تذکرہ ہے۔ اس خط کی دو قسموں یعنی بیضادی اور آفتابی کی تفصیل اور قواعد بیان کیے گئے ہیں۔ قلم کی ساخت سے لے کر حروف "الف" سے "ے" تک کے خوش خط لکھنے کے طریقے کو بھی سلیقے سے پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں مختصر انداز میں خطوطِ طلسمات و عملیات کو بھی داخل کیا گیا ہے۔

۱۸۶۲ء سے قبل کی کوئی اور چھپی کتاب اس فن پر اُردو میں نہیں ملتی۔ اس کتابچے کا کہیں ذکر نہیں ملتا اور نہ ہی اسلامی خطاطی کی تاریخ میں کوئی حوالہ۔ کتب خانوں میں بھی یہ بالکل غائب ہے۔

(۶) خزینۃ الامثال

مصنف: سید حسین شاہ حقیقت مطبع مصطفائی کان پور محرم ۱۲۷۰ھ صفحات ۲۲۴

یہ عربی فارسی و اُردو ضرب الامثال کا مجموعہ ہے جس کو سید حسین شاہ

حقیقت کے انتقال کے بعد ان کے فرزند سید محسن علی (صاحب تذکرہ سراپا سخن) نے چھپوایا۔ حقیقت کی وفات ۱۲۴۹ھ مطابق ۳۴-۱۸۳۳ عیسوی میں ہوئی، اور یہ کتاب محرم ۱۲۷۰ھ مطابق اکتوبر ۱۸۵۳ء میں شائع ہوئی۔ یہ اُردو ضرب الامثال پر ایک ہندستانی کی مرتب کی ہوئی تیسری مطبوعہ کتاب تھی۔ اس صنف کی پہلی مطبوعہ کتاب "شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان" تھی جس کو مرزا محمد اسمٰعیل عرف مرزا جان طپش دہلوی نے مرتب کیا اور مطبع آفتاب عالم تاب مرشد آباد سے ۱۲۶۵ھ مطابق ۴۹-۱۸۴۸ء میں پہلی بار چھپی۔ طپش دہلوی کی وفات شعبان ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء کے کچھ عرصے بعد ہوئی۔ اس سلسلے کی دوسری مطبوعہ کتاب حقیقت ہی کی "صنم کدہ چین" تھی جس کا ذکر آگے آئے گا۔

اسی کتاب میں فارسی کی مشہور مثل یوں درج ہے:

کبوتر با کبوتر قاز با قاز   کند ہم جنس با ہم جنس پرواز

کیوں کہ قاز غول میں اڑتے ہیں اور باز غول میں نہیں اڑتے اس لیے مثل کی یہ شکل زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

اُردو مثلوں کے چند نمونے درج کیے جاتے ہیں:

- دشمنوں میں یوں رہیے جیسے بتیس دانتوں میں زبان
- رات تھوڑی سانگ بہت۔ خلق کا حلق کس نے بند کیا ہے۔
- سیکنے گئے ہلکتے آئے۔ بالے پن کی عاشقی گلے پڑے زنجیر۔

تقریباً ڈیڑھ سو سال پُرانا یہ ضرب الامثال کا ذخیرہ نہایت اہم ہے دوسری بار یہ مطبع نول کشور لکھنؤ سے ۱۸۷۲ء میں چھپا۔ پھر یہ بالکل نایاب ہوگیا۔ خوش قسمتی سے تیسری بار ۱۹۸۶ء میں مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد (پاکستان) سے شائع ہوا۔ بعد کے مرتب مثلوں کے مجموعوں پر حقیقت کے انتخاب کو فوقیت حاصل ہے۔

(۷) درختِ خرد

مصنف: قمر علی۔ مطبع فیضی بریلی

سنہ اشاعت درج نہیں   صفحات ۴۸

یہ کتاب صنعتِ مقلوب میں اُردو میں پہلی اور ابھی تک آخری کتاب ہے۔ صنعتِ مقلوب کو انگریزی میں PALINDROME کہتے ہیں یعنی وہ لفظ یا جملہ جو اُلٹا پڑھنے سے بھی وہی رہتا ہے جو سیدھا پڑھنے میں جیسا کہ اس کتاب کے نام "درختِ خرد" سے ظاہر ہے بمصنف قمر علی مرحوم بریلی میں ایڈوکیٹ تھے۔

اس کتاب میں ایک فرضی بزرگ کا قصہ ہے جن کا نام تلق ہے یہ صاحب بات چیت میں صرف صنعت مقلوب[1] میں جملے استعمال کرتے ہیں۔ کچھ دل چسپ نمونے یہ ہیں:

- نام رب کا اکبر مان — تیری خیریت
- ہائے وہ توفوت ہوئے آہ۔ اے اہلِ حرم مرحلہ آیا
- یہ بلاغت غالب ہے — یہ یک بات کتاب کی ہے
- لے بابا ابابیل — رکن بن کر
- اے اہلِ فاقہ قافلہ آیا — شاباش
- یہ نان ہے یہ کیک ہے — یہ شکل دل کش ہے
- یہ ولایتی اُلّو ہے — لاموا روما ل

کتاب پر چھپا ہے کہ ایک ہزار کاپیاں اس کتاب کی چھپیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لگ بھگ پچاس برس قبل شائع ہوئی تھی لیکن اب کہیں بھی دستیاب نہیں۔

(۸) دستورُ الملاقات

مصنف: جواہر سنگھ جوہر لکھنوی۔ مطبع خاص علوی محمد علی بخش خاں (مقامِ اشاعت درج نہیں) سنہ اشاعت درج نہیں۔ صفحات ۴۴

"دستورالملاقات" تقریباً سو فرضی ملاقاتوں پر مشتمل ہے ہر گفتگو دو شخصوں کے درمیان ہے۔ سماج کے مختلف افراد ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہیں جیسے ہندو مسلمان سے، شیعہ سُنّی سے، استاد شاگرد سے، عالم جاہل سے، سخی جورس سے، ملحد خدا پرست سے، باپ بیٹے سے، مرشد پیر سے، حکیم مریض سے، مومن مجتہد العصر سے، کاشتکار تحصیل دار سے اور ایک نواب وثیقہ دار مہاجن سے قرض لینے کے لئے۔ غرض یہ کتاب ایسی ہی ملاقاتوں سے بھری پڑی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جو مکالمے اور طریقۂ گفتگو اختیار کیا گیا ہے وہ

---

[1] شاعری میں یہ صنعت مرزا دبیر اور میر انیس کے یہاں خصوصاً ملتی ہے (ایڈیٹر)

ان ہی افراد کے حسب مراتب ہے۔ ان ملاقاتوں سے اس زمانے کے آداب وتہذیب ملاقات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ شاعر وادیب کے مکالموں میں اردو زبان کے قواعد کے دریا بہا کر زبان پر دسترس کا ثبوت دیا گیا ہے اور زبان کے رموز ونکات کی تعلیم دی گئی ہے۔ "دستور الملاقات" معلوماتِ ادب وغیرہ کا ایک انمول خزانہ ہے جو ملاقاتوں کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ جواہر سنگھ جوہر یقیناً ایک غیر معمولی آدمی تھے۔

جواہر سنگھ جوہر لکھنوی ناطق مکرانی کے شاگرد تھے۔ یہ کتاب حسب ارشاد مہاراجہ ڈگ بجے سنگھ والی بلرام پور وتلسی پور وچردہ تحریر کی گئی تھی۔ اس میں ایڈورڈ ہفتم کا اس وقت کا ذکر ہے جب وہ پرنس آف ویلز تھے اور عہد وکٹوریہ میں ہندستان آئے تھے۔ ایک مجلس کا بھی ذکر ہے جس میں آغا حسن امانت لکھنوی نے مرثیہ پڑھا تھا۔ گو کہ کتاب پر سنہ طباعت درج نہیں ہے لیکن اس کی اشاعت ۱۸۷۵ء کے آس پاس کی لگتی ہے۔

ملاقات کے آداب پر خاص طور سے نسوانی تعلیم کے سلسلے میں اُردو میں کئی کتابیں ہیں لیکن گفتگو کے نمونوں پر اپنے انداز کی یہ پہلی ضخیم کتاب "دستور الملاقات" ہے جو پڑھنے میں دل چسپ اور مفید ہے۔

(۹) دیوانِ چرکین

مصنف: شیخ باقر علی چرکینؔ
مطبع کا نام اور مقام اشاعت درج نہیں۔

۱۲۷۳ھ صفحات ۴۲

یہ چرکینؔ کے دیوان کا پہلا ایڈیشن ہے۔ دیوان حوض وحاشیے میں چھپا ہے۔ سرورق اور ترقیمہ میں مطبع کا نام درج نہیں کیا گیا ہے البتہ کاتب کا نام چیت رام ہے جس کا قطعۂ تاریخ طباعتِ دیوان کتاب کے آخری صفحے پر شامل ہے۔ ایک قطعۂ تاریخ میر یار علی جان صاحب ریختی گو کا بھی ہے جس کے ذیل کے مصرعِ تاریخ سے سال ۱۲۷۳ھ نکلتا ہے:

"سُنا بی جان باجی کل چھپا چرکینؔ کا نسخہ"

یہ دیوان ۱۲۷۳ھ مطابق ۵۷-۱۸۵۶ء کا چھپا ہوا ہے اور قیاس ہے کہ لکھنؤ میں "غدر" سے کچھ قبل چھپا ہوگا۔ اس میں یہ بھی ذکر ہے کہ:

"عرصہ پچیس برس کا ہوا کہ مصنف لکھنؤ سے زیارتِ کربلائے معلیٰ کے لئے روانہ ہوئے تھے اور دورانِ سفر جہاز اختلاف آب وہوا سے بیمار ہوئے، کسی جزیرے پر جہاز روکا گیا اور وہاں کے 'ایک انگوری باغ' میں چرکینؔ کی موت ہوئی۔ صاحبِ باغ نے رحم کھا کر دفن فرمایا۔"

چرکینؔ غالباً دنیا کا واحد شاعر ہے جس نے بول وبراز کے متعلق شاعری کو اپنی فکر کا موضوع بنایا اور اس میدان میں جولانیٔ طبع دکھائی۔ اس رنگ میں اٹھارھویں صدی کے انگریزی ادیب جون ایتھن سوئفٹ (JONATHAN SWIFT) نے بھی تھوڑی بہت شاعری کی تھی۔ لیکن چرکینؔ کے صاحبِ کمال ہونے میں شک نہیں۔ کلام کے نمونے آزادی کے ساتھ نہیں دیئے جا سکتے۔

اس "دیوان چرکینؔ" کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بیشتر کلام ایسا ہے جو بعد کے عام بازاری ایڈیشنوں میں نہیں ہے یا حذف کر دیا گیا ہے ہاں کچھ قلمی نسخوں میں اس دیوان سے زیادہ بھی کلام ملتا ہے۔ یہ المیہ ہے کہ چرکینؔ ایسے عجیب وغریب شاعر کو مکمل طور سے نظر انداز کر دیا گیا ہے اور اُردو میں شاید سنجیدگی سے کوئی مضمون بھی اس پر نہیں چھپا۔

(۱۰) رسالہ آئینِ بدر سازی

مصنف: محمد علی بدر ساز مطبع مشرق الانوار لکھنؤ
سنہ اشاعت درج نہیں۔ صفحات ۸ اور ۳۱ تصاویر

بدری ظروف دکن میں بیدر اور اس کے اطراف میں بنائے جاتے ہیں۔ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ (م ۱۷۹۸ء) کے عہد میں بھی اس کام کی ترقی ہوئی مگر کاریگر باہر سے آئے تھے۔ بدری ظروف سیہ فام ہوتے ہیں اور ان پر چاندی کا کام پیوست ہوتا ہے۔ بنیادی دھات جستہ، سیسہ وتانبہ وغیرہ ملا کر بنتی ہے اور برتنوں کو مٹی کے سانچوں میں ڈھالا جاتا ہے، ڈھلے برتن پر تین قسم کے آہنی قلموں سے کھود کر چاندی کی پتی یا تار کو بٹھاتے ہیں تا کہ پھول یا ڈیزائن وغیرہ بن جائیں۔ کئی چیزوں سے برتن کو رگڑا جاتا ہے جس سے جستہ کالا ہوتا ہے اور چاندی صاف

ہوتی ہے۔ نوسادر، پُرانی دیوار کی لونی مٹی اور قلمی شورے کو پانی میں اُبال کر پُچارے سے برتن پر خوب پھیرتے ہیں اور بعد میں صاف پانی سے دھو ڈالتے ہیں۔

یہ رسالہ بڑے سائز پر چھپا ہے اور طباعت انیسویں صدی کی معلوم ہوتی ہے۔ بدری ظروف بنانے پر شروع میں دو صفحات ہیں پھر اکانوے ظروف وزر بلند جیسے: صُراحی، تھالی، کاغذ تراش، آب خورا، حقہ، پیچوان، گڑگڑی، اگالدان، خاصدان، گملا، مُہنال، رکابی اور پیالی وغیرہ کی فہرست۔ انچ میں ناپ، کیفیت اور قیمت درج ہیں۔ کتاب میں بڑے پیمانے پر پورے صفحے اور بعض دوہرے صفحات (جو موڑ دیئے گئے ہیں) پر ۲۹ خوبصورت برتنوں کی تصویریں بھی شامل ہیں۔ یہ بھی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف محمد علی بدرساز کو ۱۸۸۱ء اور ۱۸۸۴ء کے درمیان لکھنؤ، کلکتہ اور جے پور کی صنعتی نمائشوں میں تمغے بھی ملے تھے جو ان کے کامل استاد ہونے کا ثبوت ہے۔

اُردو میں یہ کتاب صنعتی آرٹ پر گنی چُنی کتابوں میں سے ہے اور خصوصاً بدرسازی کے بارے میں شاید واحد کتاب ہے۔ اب یہ کتاب گمشدہ اور ناپید ہے۔

(۱۱) رسالہ بٹیر بازی

مصنف: مرزا محمد وزیر بیگ رعایت لکھنوی

مطبع اعجاز محمدی لکھنؤ۔ ۱۸۸۸ء صفحات ۱۲

اس رسالے میں مصنف نے خود لکھا ہے کہ فنِ بٹیر بازی عقلمندوں کے نزدیک بہت خراب ہے اور سوائے دل لگی اور واہ واہ کے کوئی نتیجہ اس سے نہیں نکلتا ہے۔ بہرحال اودھ کے مشاغل میں بٹیر بازی کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے اور یہ کتابچہ اس شغلے سے متعلق معلومات کا ذریعہ ہے۔

اس رسالے کے مطابق بٹیر قدآور، بڑی چونچ، چوڑا سینہ اور باریک پَر والا اچھا مانا گیا ہے۔ بٹیروں کو پہچاننے کے طریقے دیئے ہیں۔ بٹیر کی بیماریوں کے علاج کے نسخے بھی فراہم کیے ہیں۔ بیماریوں میں بلغم، لاغری، کھانسی اور ہچکی وغیرہ بھی شامل ہیں۔ بہت کم لوگ اب فنِ بٹیر بازی سے واقف ہیں اور یہ نایاب رسالہ ایک خاص تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔

(۱۲) سُداما (مثنوی)

مصنف: لچھمن پرشاد صدر لکھنوی   مطبع بہار اودھ لکھنؤ

۱۹۲۹ء صفحات ۱۶

یہ مختصر مثنوی غیر منقوطہ لکھی گئی ہے۔ خوبی یہ ہے کہ حرف "ی" یا "ے" بھی کہیں استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ ۱۹۹۱ء میں "مرقعِ علم" کے نام سے سید وقار الحسنین حلم بنگلوری کا غیر منقوط دیوان چھپا ہے مگر شاعر صاحب 'ی' اور 'ے' کے استعمال سے بچ نہ سکے۔

مثنوی کرشن جی کے بچپن کے مفلس دوست سُداما پر ہے جو اپنی بیوی کے کہنے پر اپنے ہم مکتب کرشن جی کے پاس اپنی حالت پیش کرنے کے تحفے میں کچھ چاول لے کر جاتے ہیں۔ کرشن جی کہتے ہیں کہ اپنی زوجہ کی دی ہوئی سوغات جو تمھارے پاس موجود ہے ہم کو دو۔ ایک بار چاول کھا کر کرشن جی نے ایک عالم کی دولت بخش دی اور دوبارہ کھانے پر دوسرے عالم کی دولت عطا کی۔ تیسری بار چاول کھانے جا رہے تھے کہ کرشن جی کی بیوی رکمنی جی نے ان کی کلائی تھام لی۔ سداما کرشن جی سے کچھ نہیں مانگتے اور اپنے گھر واپس لوٹتے ہیں جہاں ان کا جھونپڑا غائب ہے اور اس کی جگہ ایک بلند محل ان کے لیے تیار کھڑا ہے۔

صدر لکھنوی وہی ہیں جن کی اُردو میں منظوم گیتا مشہور ہے۔ مثنوی "سُداما" کی زبان ثقیل اور غیر مانوس ہے۔ یہ کوشش ایک ادبی ریاضت ہے کیوں کہ اُردو حروفِ تہجی کے تقریباً بیش منقوطہ حروف کو ترک کرنا پڑا ہے۔ اگرچہ بعض مرثیے اور غزلیں اس صنف میں کہی گئی ہیں لیکن کسی ایک صنفِ سخن میں یہ غالباً واحد مسلسل اور مستقل کتاب ہے۔

(۱۳) صنمکدۂ چین

مصنف: سید حسین شاہ حقیقت۔   مطبع مصطفائی، کانپور

رجب ۱۲۶۹ھ / ۱۸۵۳ء صفحات ۴۳

حقیقت کی یہ کتاب ان کی دوسری تصنیف "خزینۃ الامثال" سے
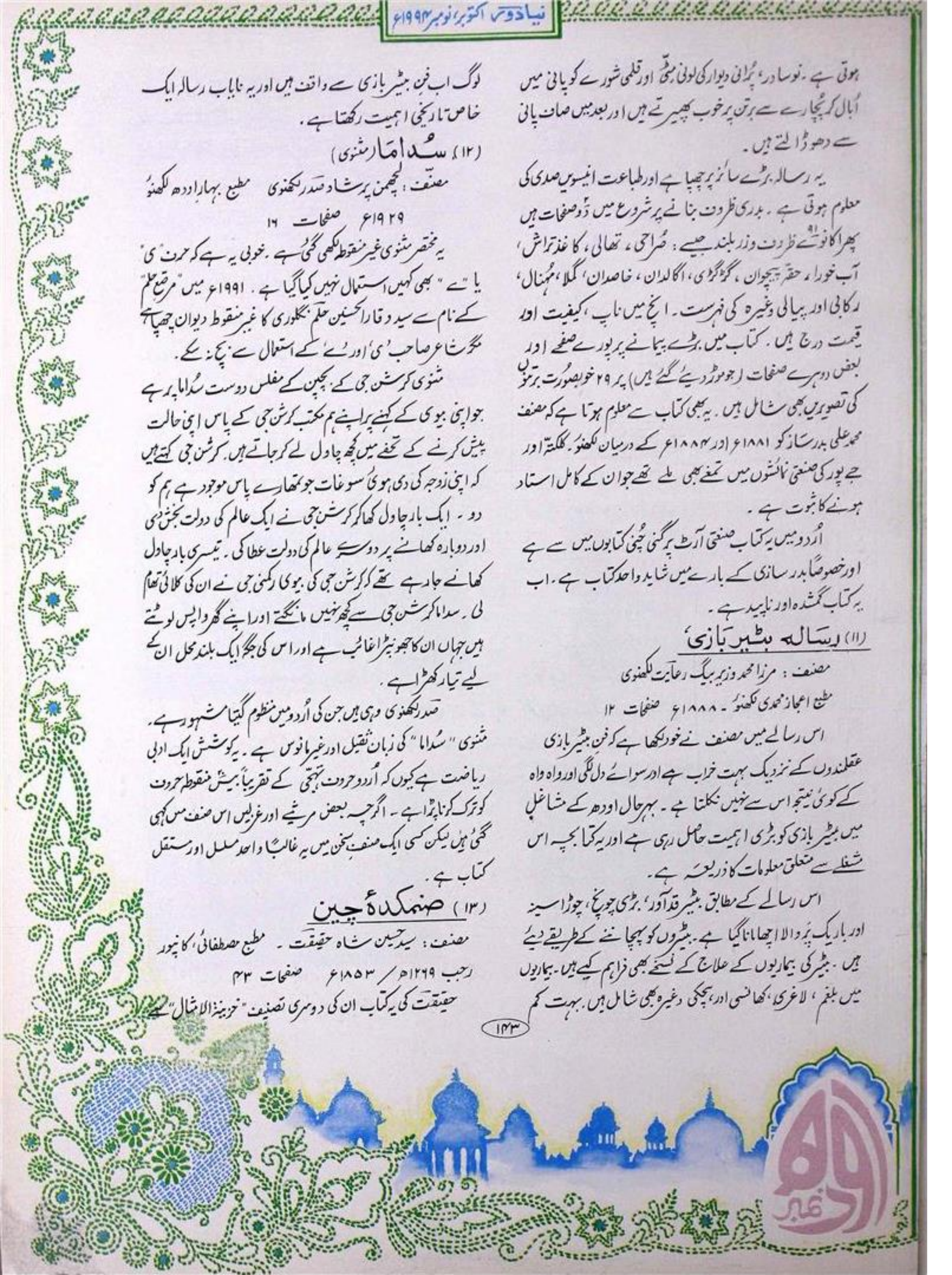
سے اگ بھگ چھ ماہ پہلے چھپی تھی۔ اس میں اُردو بھاشا، فارسی اور عربی ضرب الامثال کے علاوہ کبت۔ دوہے۔ پہیلیاں اور اشعار بھی ہیں اشعار خود حقیقت، مرزا جعفر علی حسرت، شیخ قلندر بخش جرأت، سید حسن شاہ ضبط (مصنف کے بڑے بھائی) اور مرزا قتیل وغیرہ کے ہیں۔

کچھ کہاوتیں بہت دل چسپ ہیں: ——

—— چار دن کی چاندنی پھر اندھیرا پاکھ

—— جس کے ہاتھ ڈوئی اس کا سب کوئی

—— وہ دن گئے کہ خلیل خاں فاختہ مارتے

دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا مواد بھی بہت پہلے تیار ہو گیا تھا۔ تپش دہلوی کی اس صنف کی کتاب کے بعد یہ اُردو میں ایک ہندستانی کی لکھی ہوئی دوسری مطبوعہ کتاب ہے۔ اس کے دوبارہ چھپنے کی، جہاں تک مجھے علم ہے، نوبت نہیں آئی۔ اُردو امثال اور پہیلیوں کی ڈیڑھ سو سال پرانی صورت اس کتاب میں محفوظ ہے۔ کتاب کو اچھے طریقے سے ایڈٹ کر کے چھاپنے کی ضرورت ہے۔

(۱۴) کشف اللّماس فی صبغ اللّباس

مصنف: خواجہ محمد اشرف علی لکھنوی مطبع نامی لکھنؤ

باردوم ۱۸۸۸ء صفحات ۱۶

یہ کتابچہ رنگریزی کے فن پر ہے جس میں رنگوں کی قسمیں، ان کے بنانے کی ترکیبیں اور ان کے شرعی استعمال کو بیان کیا گیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ زیادہ تر رنگ قدرتی یعنی غیر کیمیاوی اجزا سے بنائے گئے ہیں۔ اس کتاب میں کپڑا رنگنے کے تقریباً چالیس رنگوں کو تیار کرنے کے طریقے لکھے ہیں۔ رنگوں کو بنانے میں، جو چیزیں ملائی جاتی ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں:

—— گلِ انار کا رنگ، شہاب (جو زعفران سے نکالا جاتا ہے) اور ہلدی کو ملا کر پانی میں جوش دیتے ہیں۔

—— نارنجی رنگ: ہارسنگھار کے پھولوں کو پانی میں اُبالتے ہیں

—— زرد رنگ: ہلدی کو آم کی چھال وغیرہ کے ساتھ ملاتے ہیں۔

—— سیاہ رنگ: تخم پنوار سوکھا بھون کر نیل میں ملا کر تیار کرتے ہیں۔

—— طوسی (بھورا) رنگ: ببول کی چھال اور مازو کا پھل ملا کر بناتے ہیں۔

—— کاہی (گھاس والا سبز) رنگ: نیل، ہلدی اور انار کا پوست مختلف طریقوں سے استعمال کرتے ہیں

بعض رنگوں کے نام بھی عام واقفیت کے نہیں ہیں جیسے شربتی (ہلکا پیلا)، کرنجوہ (ہلکا بھورا)، کاکریزی (تیز بیگنی) اور کوکی (سلیٹی) ان کے علاوہ صابری، جیلانی، عاقل خانی اور عباسی رنگوں کا بھی ذکر ہے۔

رنگ سازی اور رنگ ریزی اودھ کے خاص فن تھے اور اس غیر معروف اور نایاب کتاب سے اس صنعت کے رموز کھلتے ہیں۔

(۱۵) معیار الاملا

مصنف: دیبی پرشاد سحر بدایونی۔ پہلی بار: مطبع نظامی کانپور

۱۲۸۴ھ / ۶۸-۱۸۶۷ء صفحات ۱۶

(۱۶) رسالہ معیار الاملا (بعد تصحیح و نظر ثانی)

مصنف: دیبی پرشاد سحر بدایونی دوسری بار: مطبع نول کشور لکھنؤ

۱۸۷۶ء صفحات: ۵۴

کتاب کی ابتدا میں لکھا ہے: "چوں کہ علم رسم الخط و املا کا سیکھنا ہر طالب علم کو اکثر علوم کی تحصیل پر مقدم ہے مگر اس زمانے میں اکثر شخص اس کے قواعد و ضوابط سے محض ناواقف ہیں لہٰذا راقم آثم نے اس کے قوانینِ ضروری کو کتب معتبرہ مثل رسالہ مولوی انور علی صاحب و دیگر کتبِ لغات مثل غیاث اللغات و برہان قاطع وغیرہ سے جس قدر طلبا رفارسی و اُردو کو مفید ہو انتخاب اور ترجمہ کر کر معیار الاملا نام کیا۔"

املا کے اصول سمجھانے کے بعد الفاظ کی طویل فہرست دی ہے چند نمونے دیکھیے:

لفظ غلط العام	صحیح
آنو	آنوں
بغیچہ	باغیچہ
تابعدار	تابع

قطعہ	بفتح	بکسر اوّل و سکون ثانی
مشاط	ضم اوّل	فتح اوّل و ثانی مشدد

حاطہ	احاطہ
کلچہ	کلیچہ (چھوٹی روٹی)

لفظ	اعراب غلط	اعراب صحیح
آتش	فتح ثانی	کسر ثانی
برادر	بکسر اوّل	بفتح اوّل
رکاب	بفتح "	بکسر "
سوال	فتح اوّل	ضم اوّل
عربی	بسکون ثانی	بفتح ثانی
عصمت	فتح اوّل	کسر اوّل
عیادت	"	"
عنقا	ضم اوّل	فتح اوّل

سحر بدایونی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ خطاط بھی تھے۔ انھوں نے اسلامی خطاطی پر "ارژنگ چین" (مطبع نظامی کان پور ۱۲۹۲ھ) اور نظم پروین (تیج کمار پریس لکھنؤ۔ ستائیسویں بار ۱۹۶۴ء) کتابیں لکھیں۔ "لطائف ہندی" ان ہی کی کتاب ہے۔

اُردو املا پر سحر بدایونی کی کتاب اُردو میں اس سلسلے کی اولین تنظیم میں سے ہے جس کے دو ایڈیشن اور پرنوٹ کیے گئے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آج املا و تلفظ کی جو غلطیاں عام ہیں ان میں سے متعدد پرانے زمانے میں بھی عام تھیں۔ اس اہم کتاب کو لوگ بھول چکے ہیں اور شاید ہی کہیں اس کا ذکر ملتا ہو۔ □□

یہ نایاب تصاویر اسلم محمود صاحب نے اپنے گرانقدر مضمون کے ساتھ ارسال کی ہیں جنھیں ہم ان کے شکریہ کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔
ایڈیٹر

محل کا ایک منظر

لکھی گیٹ قیصر باغ لکھنؤ

ریزیڈنسی کا گیٹ

لکھنؤ کا ایک مقبرہ

یوگیش پروین
۸۹۔ غوث نگر، لکھنؤ
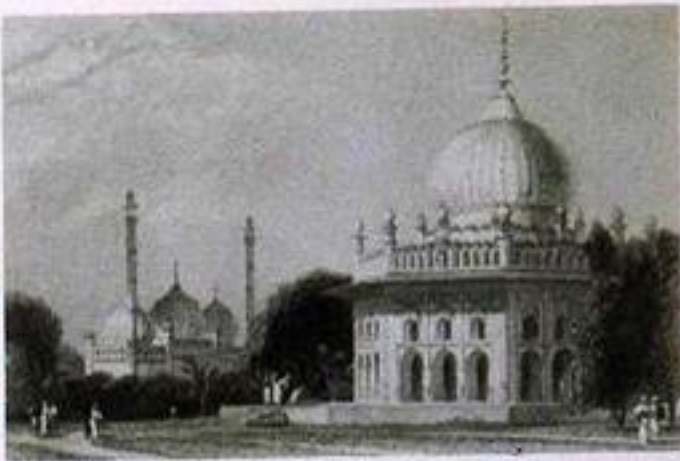
سلطنتِ اودھ کے غیر مسلم منصب دار

قدیم بھارت اور عہد وسطیٰ کے ہندستان میں کائستھ اعلا عہدوں پر فائز رہے اور درباروں میں اپنی فراست، ذہانت، شعری ملکہ، تحریر و تفکر میں دستگاہ اور اپنی خوش اخلاقی کی وجہ سے ہمیشہ معقولات، ادب فلسفہ، آرٹ، سائنس اور سیاست سبھی شعبوں میں معزز و محترم رہے اور اپنے گہرے نقوش چھوڑے۔

سنسکرت کے مشہور مچھ کٹیٹ کم 'मच्छकतिटकम' کتاب کی تخلیق سے لیکر اودھ کے درباروں تک کائستھوں کا بول بالا رہا۔ وہ بڑی بڑی ریاستوں اور جاگیروں کے مالک بھی رہے ہیں۔ نوابین اودھ کے جدِ امجد نواب سعادت خاں برہان الملک کے وقت سے لیکر ریاست کے نظم و نسق کے لئے ہندو نائب مقرر کئے جانے لگے۔ اس روایت میں اکثر یہ پایا گیا کہ نوابوں کے بکرس، بنئے، خزانچی، کھتری اور نائب کائستھ رہے ہیں۔ اپنی خوش اخلاق کے باعث عہد وسطیٰ میں اقتدار میں رہنے کے باوجود کائستھوں کا اسلام قبول کرنا نہ کے برابر رہا ہے۔

اودھ کے نوابوں اور بادشاہوں کے ساتھ کچھ کائستھوں نے بھرپور تعاون کیا ہے۔ اودھ کے پہلے نواب برہان الملک کے دور میں راجہ ہر نرائن کے بیٹے راجہ لکشمی نرائن ان کے سب سے زیادہ معتمد نائب تھے۔ نواب کے انتقال کے بعد راجہ لکشمی نرائن نے نادر شاہ کو سمجھایا اور اسی کی بنا پر نواب کے داماد کو ابو المنصور خاں کا خطاب ملا اور اودھ کے صوبہ دار ہوئے بعد میں صفدر جنگ کے نام سے شہرت پائی۔

نواب سعادت خاں برہان الملک کے دیوان آتما رام تھے۔ ان ہی کے بڑے بیٹے رام نرائن نے فیض آباد میں دلی دروازہ بنوایا۔ ان کے چھوٹے بیٹے مہا نرائن نے لکھنؤ کو سنوارا جہاں ان کی رہائش گاہ باغ مہا نرائن کے نام سے معروف ہے۔ برہان الملک کے وقت میں حرم کے داروغہ رائے کیشو رام جی تھے۔ نواب صفدر جنگ کے ہی نائب راجہ نول رائے کائستھ تھے جو کوڈرا خورد تحصیل ملیح آباد لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ نواب صفدر جنگ چونکہ عام طور سے دہلی ہی میں رہا کرتے تھے اس لئے اودھ کا انصرام و انتظام راجہ نول رائے ہی سے متعلق رہا۔

ان کے خاندان کی تاریخ اس طرح ہے کہ شری مہتاب رائے کوڈرا خورد تحصیل ملیح آباد کے باشندے تھے اور ان کا خاندان قانون گویان کے نام سے مشہور تھا۔ ان کے لڑکے نول رائے تھے۔ آج بھی کوڈا میں لوگ رائے خاندان کو عزت کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ ——— نول رائے کی دربار میں رسائی الماس میاں کی مہربانی سے ہوئی تھی۔ شری نول رائے کے بیٹے گلاب رائے اپنے ننہال بانگرمئو ضلع اناؤ چلے گئے اور وہاں شروع سے ہی چکلے دار اور پھر ناظم ہوئے۔

نواب آصف الدولہ کے زمانے میں راجہ ٹکیت رائے کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ امیٹھی سے لگان وصول کریں۔ امیٹھی فیض آباد کے راجہ مان سنگھ کے علاقے میں تھی۔ جب راجہ ٹکیت رائے پہنچے تو راجہ مان سنگھ نے آکر ان کے راکھی باندھ دی۔ کیونکہ وہ برہمن تھے راکھی کے نیگ میں انھوں نے لگان کی معافی مانگ لی۔ اس کے بعد راجہ گلاب رائے کو امیٹھی بھیجا گیا۔ انھوں نے امیٹھی کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور لگان وصول کر لیا اس کے ساتھ ہی ایک فرمان بھی لکھا لیا کہ اب لگان نہیں لیں گے۔ اس بات سے راجہ دووا کے ناناراجہ مان سنگھ کے دشمن ہو گئے۔ اور پھر انگریزی حکومت میں راجہ مان سنگھ انگریزوں کے حامی ہوئے تو انھوں نے گلاب رائے کے گھرانے سے بدلہ لے کر زبردست نقصان پہنچایا۔ راجہ نول رائے نے لکھنؤ اور سوہان کے

پنچا نول گنج آباد کیا۔ ان کے بنوائے ہوئے شوالے ملیح آباد اور نول گنج میں موجود ہیں۔ راجہ صاحب نے لکھنؤ میں گومتی پر پہلا پتھر کا پل بنوانا شروع کیا تھا لیکن پل ان کی زندگی میں مکمل نہ ہو سکا کیونکہ وہ اپنی بہادری کے باعث فرخ آباد کے نواب احمد خاں بنگش کے مقابلہ کے لئے بھیجے گئے تھے جہاں وہ شہید ہو گئے۔ نواب صفدر جنگ کے دور حکومت میں راجہ بھگوان داس کو میر منشی بنا کر دلی سے بھیجا گیا تھا۔ انھیں کاکوری پرگنے کے کئی گاؤں اور مہونا جمال پور ملا تھا۔ پھر ان کے چھوٹے بھائی راجہ کشن سنگھ منشی بنے نواب سعادت علی خاں کے دور میں جن کے بیٹے دولت رائے نے آخر تک یہ عہدہ سنبھالا۔ نواب شجاع الدولہ کی فوج میں راجہ شتاب رائے کو اعزازی عہدہ حاصل تھا اسی طرح انگریزوں کے ساتھ لڑائی میں راجہ بینی بہادر نائب صوبہ دار نے نواب کا ساتھ دیا تھا۔

نواب شجاع الدولہ کے ہی دور میں راجہ پورن چند کو ایک رپورٹر کی حیثیت سے رکھا گیا۔ ان کے بیٹے رائے بال کرشن اور داماد جسونت رائے بعد میں نواب آصف الدولہ کے دیوانِ وزارت میں تھے۔ نواب آصف الدولہ کے ہی دور میں شرقی علاقہ کے منتظم رائے جینی لال کو بنایا گیا تھا۔ یہ رائے پورن چند اور رائے رگھوناتھ پرشاد کے بیٹے تھے۔

راجہ ٹکیت رائے نواب آصف الدولہ کے وزیر مال تھے۔ وہ پٹنہ کے پران ناتھ شری واستو قانون گو خاندان کے تھے جن کا خاندان پہلے ہی گنگا کے کنارے ڈلمؤ میں آباد ہو چکا تھا۔ ابتدا میں وہ بیس واڑہ کے ناظم رہے تھے۔ نواب آصف الدولہ نے انھیں اپنے دربار میں اعزاز دینے کی غرض سے بائیس پارچے کا خلعت دیا تھا۔ راجہ صاحب نواب کے دیوان ہونے کے ساتھ ساتھ اودھ دربار کے وزیر مال بھی تھے اودھ سند کا وزارت کرنے والوں میں راجہ ٹکیت رائے کا نام سر فہرست لیا جاتا ہے۔

راجہ ٹکیت رائے کے بنوائے مندر، شوالے، ٹھاکر دوارے، مسجد، تالاب، دھرم شالہ گھاٹ اور ان کے نام سے آباد محلے، قصبے بڑی تعداد میں ملتے ہیں۔ انھیں اس زمانے میں ہندو دھرم کا سرپرست محافظ کہا جاتا تھا۔ راجہ صاحب نے پریاگ میں دھرم شالہ اور بٹھور میں شوالہ بنوایا تھا جو قابل دید ہیں۔

راجہ صاحب کی مذہبی وسیع النظری کا ایک جیتا جاگتا نمونہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے بیتوا ندی کے پاس جہاں مندر بنوائے وہاں ایک مسجد بھی تعمیر کروائی۔ اسی طرح لکھنؤ کے حیدر گنج محلہ میں راجہ ٹکیت رائے کی تعمیر کردہ مسجد قابل دید ہے۔ مسجد میں اوپر سنگ مرمر کی پٹی پر اُن کی اس تعمیر کی کہانی لکھی ہے۔ اس کے پاس ہی ان کا بنوایا ہوا امام باڑہ بھی تھا۔

آصف الدولہ کے دور میں کچھ مخالفین کی کارستانی کے نتیجہ میں نواب سے ان کی اَن بَن ہو گئی تھی اور کچھ دنوں کے لئے اپنے عہدہ سے ہٹ گئے تھے حالانکہ بعد میں پھر اسی عہدہ پر فائز ہوئے لیکن وہ بات نہ آ سکی۔ نواب آصف الدولہ کو مرتے مرتے اس بات کا غم رہا۔

راجہ جھاؤ لال نواب آصف الدولہ کے دوسرے نائب تھے۔ جھاؤ لال نواب شجاع الدولہ کے وقت سے دوابہ میں کام کرتے تھے اودھ کی پرانی راجدھانی میں ہی انھیں خواص و عوام دونوں ہی شفقت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ نواب بیگم اور بہو بیگم انھیں پیار سے للوجی کہہ کر پکارتی تھیں جو کہ ان کے گھر کا نام تھا۔ سکسینہ خاندان کے چراغ مہاراجہ جھاؤ لال نے فیض آباد کے خزانہ کی پوری حفاظت کی تھی جبکہ وارن ہیسٹنگ نے اُسے لوٹنے کی کوشش کی تھی۔ (مہاراجہ جھاؤ لال نے اجودھیا کے بیے مذہبی اداروں کا بھی تحفظ کیا۔ وہ اپنی دریا دلی اور مذہبی وقار کی وجہ سے اجودھیا کے لوگوں میں راجہ نہیں راج کہے جاتے تھے)

لکھنؤ بلا کر نواب آصف الدولہ نے پہلے انھیں توپخانے کا داروغہ بنوایا اور میر بخشی کی حیثیت سے ان کے ہاتھوں میں اپنی جاگیروں کا انتظام حوالے کر دیا۔ راجہ صاحب کو دربار سے شاندار خلعت ملا تھا۔ ان کے سفر کے واسطے ہاتھی اور آٹھ کہاروں کی جھالر وال پالکی ملی تھی۔ لکھنؤ میں راجہ کی حویلی مہاراجہ جھاؤ لال کا بنوایا ہوا پل اور ان کے نام کا بازار کسی نہ کسی شکل میں ملتا ہے۔ راجہ صاحب نے بھی قومی یک جہتی کا خیال کرتے ہوئے مندروں کے ساتھ ساتھ امام باڑے و مسجدیں بنوائیں جو ٹھاکر گنج میں موجود ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ نواب کی محنت کا سبب جھاؤ لال کی ان سے علاحدگی تھی۔ یہ علاحدگی شک اور غلط فہمی کی وجہ سے ہوئی تھی۔

رائے کھیم نرائن رند نواب آصف الدولہ کے پاس ۵۰۰ روپیہ

ماہانہ پر ملازم ہوئے تھے۔ انھوں نے ۲۰ ہزار اشعار کہے ہیں۔ ہیر را نجھا نل دمینتی (فارسی) اور چہار درویش ان کی مشہور کتابیں ہیں۔

نواب آصف الدولہ کے دور حکومت میں ان کے دوسکے دارو غہ زور آور سنگھ بھی کاستھ تھے اور بینی نرائن ان کے کاتب ہوئے جنھوں نے نواب کے لئے تمام اشعار جمع کئے۔ الماس علی خاں کے دیوان لالہ روشن لال مشہور ہیں جنھوں نے دریا آباد میں کٹرا روشن لال آباد کیا۔ لکھنؤ میں روشن لال کی بارہ دری بھی ہے۔

نواب آصف الدولہ کی دیوانی کچہری میں شری شیولال جی ملازم تھے جن کے انتقال کے بعد ان کے ہی بیٹے بھگوان داس جی کو وہ جگہ دی گئی پھر بریلی کا اہلکار بنا دیا گیا جہاں ان کا قتل ہو گیا۔ ان کے بعد ان کے بیٹے رائے بالک رائے کو نواب آصف الدولہ نے راجہ جھاؤلال کی سربراہی میں ملازمت دے دی۔ نواب سعادت علی خاں کے دربار میں دیوانی کے عہدہ پر تھے۔

راجہ دیا کرشن بال کرشن رائے اور تلسی رام منشی بھولا ناتھ دار الانشار کے صدر تھے جو بہت خوبصورت لکھتے تھے۔ اس لئے کہ نواب بہترین سواد خط کے دلدادہ تھے۔

نواب سعادت علی خاں کے دور حکومت میں راجہ امرت لال دربار میں ملازم تھے جو بعد میں بادشاہ غازی الدین حیدر کے وقت میں داروغہ دیوان خانہ کے عہدہ پر پہنچ گئے اور انھیں راجہ کا خطاب نصیر الدین حیدر کے وقت میں ملا۔

اس کے بعد بادشاہ کچھ جلنے والوں کے بہکاوے میں آکر ان سے ناراض ہو گئے اور پھر امرت لال نے خود کٹار بھونک کر اپنی جان دیدی تھی۔

ان کے بیٹے رائے مکھن لال انگریزی حکومت کے ذریعہ ڈپٹی کلیکٹر بنائے گئے۔

گرد بخش ادیب کہار تھا لیکن نواب سعادت علی خاں کا منہ لگا تھا۔ اور شعر پڑھ کر سناتا تھا۔

اودھ کے مشہور بادشاہ غازی الدین حیدر کے وزیر اعلا راجہ دیا کرشن ہوئے اور پھر نصیر الدین حیدر کے مشہور دوست اور ریاست کے انتظام کار لالہ رام پرشاد میوہ رام ہوئے جنھیں افتخار الدولہ کے اعزاز سے نوازا گیا تھا۔ راجہ الفت رائے الفت کے بیٹے راجہ تر لوک چندر عرف لال جی بخشی بادشاہ کے دیوان تھے جن کے ذریعہ بخشی کا تالاب بنوایا گیا۔

بادشاہ نصیر الدین حیدر کے وقت میں مہاراج نول کرشن کے لئے راجہ رام نائب دیوانی کے عہدہ پر تھے۔ لائق و فائق بھی تھے۔ تعزیہ داری میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کے بعد راجہ بال کرشن کو یہ عہدہ دیا گیا۔

محمد علی شاہ کے دور حکومت میں بھی راجہ جیا لال ان کے نائب ہوئے جو شاعر تھے گلشن تخلص تھا۔ محمد علی شاہ کی بیگم ملکہ جہاں کی جاگیر کے منتظم لکھپت رائے جی تھے۔

اس وقت امجد علی شاہ حکمراں تھے۔ محمد علی شاہ حسین آباد کی عمارتیں ادھوری چھوڑ کر انتقال کر گئے تھے اور ان کی بیوہ بیگم ملکہ جہاں ان کے ادھورے کام پورے کر رہی تھیں۔ ملکہ جہاں صاحبہ کی دیکھ بھال حاجی بشیر نام کا حبشی نسل کا خواجہ سرا کیا کرتا تھا۔ بیگم کے خزانے کی چابیاں بھی اسی کے پاس رہا کرتی تھیں حاجی بشیر نے لکھپت رائے جی کی فراست اور حسن انتظام کی تعریف جب ملکہ جہاں سے کی تو انھوں نے لکھپت رائے جی کو اپنا نائب دیوان بنا لیا۔ اس وقت ملکہ جہاں تحسین گنج میں جامع مسجد کی تعمیر کروا رہی تھیں جو اودھ اسکول کے فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ لالہ لکھپت رائے جی بعد میں بیگم صاحبہ کے دیوان بن گئے۔

۱۸۴۷ء میں حکومت اودھ میں جس وقت واجد علی شاہ کا جلوس ہوا دیوان لکھپت رائے جی گنیش گنج میں اپنا مکان بنوا رہے تھے۔ ان کی ڈیوڑھی کا کچھ حصہ آج بھی باقی ہے جس میں اس وقت کے فن تعمیر کے روشن نقوش مل جاتے ہیں۔

ملکہ جہاں ۱۸۶۰ء میں زیارت کے لئے گئیں اور وہیں سپرد خاک ہوئیں لکھپت رائے جی اسی زمانے میں اپنے بزرگوں کا ”شرادھ“ کرنے گیا تشریف لے گئے۔

لکھنؤ میں تبھی کیٹرا مہاراجہ بال کرشن کے بیٹے مہاراج تیج کرشن نے بسایا تھا۔ راجہ تیج کرشن کی حویلی بھدیوان کے قریب تھی اور تب وہاں بجے نگر کی بستی بھی تھی۔

۱۸۵۷ء میں جان عالم کی طرف سے راجہ بال کرشن انگریزوں سے لڑائی میں شہید ہوئے اس لئے انگریزوں نے اس حویلی کو برباد کر دیا تھا مہاراجہ بال کرشن عیش باغ رام لیلا کے سرپرست تھے ان کے نام سے موہان

روڈ پر مہاراج گنج قصبہ آباد ہے۔ مہاراجہ بال کرشن کی یادگار بال کرشن کا چھتہ سرائے معالی خان کے قریب تھا جو اب ایک محلہ ہے۔ منشی جوالا پرشاد، راجہ پیوارام، منشی صاحب رائے خاموش اور خیالی رام خیالی واجد علی شاہ کے درباری دانشوروں میں تھے۔

کرشن چند سکسینہ کا خاندان دلی سے آکر نوبستہ لکھنؤ میں آباد ہوا تھا وہ اردو فارسی میں دونوں زبانوں کے شاعر تھے اور مرزا آغا تخر بیکش کے شاگرد تھے۔ ان کے آبا و اجداد سب اودھ دربار سے متعلق تھے۔ اسی طرح رائے دولت رام دولت کے والد کا نام گردیال تھا۔ یہ راجہ پڈ چند کے پوتے تھے۔ دولت اودھ دربار کے خاص شاعر تھے اور فارسی کے ممتاز عالم بھگوان داس ہندی کے شاگرد تھے۔

بیگم حضرت محل کے دور حکومت میں مہاراج بال کرشن نے ہی نول گنج کے ساتھ مہاراج گنج کو آباد کیا۔ ان کی بنوائی ہوئی عالیشان عمارتیں ہیں۔ انھوں نے ہی ایک شوالہ کو تعمیر کرایا تھا جس کی خوبصورتی قابل دید ہے۔ ۱۸۵۷ء کی آزادی کی لڑائی میں مہاراجہ شہید ہو گئے۔ ان کی قربانی بے مثال اور یادگار ہے۔ مہاراجہ بال کرشن کا ایک مکان خاص بازار میں تھا اور دوسرا بھوانی گنج میں تھا۔ ان کے بیٹے راجہ برج کرشن اور راجہ بہاری لال کو بھی دربار کی جانب سے ۲۲ پارچے کا خلعت ملا تھا۔

واجد علی شاہ کے زمانے میں تو قومی ایکتا کا ستارہ اور بھی بلند ہوا۔ راجہ بال کرشن ان کے وزیر تھے اور راجہ بہاری لال ان کے اچھے دوست۔ ٹھاکر پرشاد جی واجد علی شاہ کے استاد تھے اور انھیں کتھک سکھاتے تھے جب ان کے وزیر علی نقی نے ایک ہندو بیوہ کی زمین ٹھاکر گنج میں ضبط کر لی تو انھوں نے اس کی زمین واپس دلا کر اس غریب کو ایک مندر بنانے کے لئے روپے دیئے۔ واجد علی شاہ قیصر باغ میں جوگیانہ میلہ، اندر سبھا اور رام لیلا بھی رچاتے تھے۔ جن کی بنیاد معتقدات و رسوم پر تھی۔ ان کی لکھی ہوئی ہولیاں، بابُل اور ٹھمریاں ہندی کے رنگ میں ہیں۔ وہ اگر محرم بڑی دھوم سے مناتے تھے تو بڑے منگل پر بھی دل کھول کر روپے خرچ کرتے تھے۔ جس میں ان کی طرف سے ایک "برہم بھوج" بھی ہوتا تھا۔ اسی زمانے میں لکھنؤ میں بہت سے مندروں کی بنیادیں پڑیں اور درستگی و تزئین ہوئی۔

بیگم حضرت محل کی سلطنت میں راجہ جے لال سنگھ نے اس کی آن اور وطن کی شان کے لئے اپنی جان قربان کر دی تھی۔ بسنتر پور کے راجہ بینی مادھو اور کالا کانکر کے راجہ ہنومنت سنگھ اور تلسی پور کے راجہ جنگ آزادی میں اپنی جان پر کھیل گئے۔ بیگم کے ساتھ راجہ دیوی بخش سنگھ، راجہ امر سنگھ وغیرہ سرحد نیپال تک گئے تھے۔ نوابوں میں اگر ہندو لوگ تعزیہ داری اور پیر فقیروں کے مرید تھے تو مسلمان چیچک نکلنے پر شیتلا مندر سے نیر اور پھول مانگتے تھے۔ لکھنؤ میں بنی ہوئی رانی پڑائن کی مسجد اور دھنیا مہری کی مسجد سے اپنے آپ میں قومی میل جول کی داستانیں سنا رہی ہیں۔ یہاں اگر ہندو راجہ امام بخش ہیں تو ٹھاکر نواب علی بھی ہوئے ہیں۔ یہاں کی شاہی عمارتوں پر مچھلی، کمل، ناگ پھن اور جل پریوں کے نقوش ملتے ہیں۔ وہ اس تہذیب کے مقدس نشان ہیں جس کی برابر کی آزاد فضا میں سب برابر کے حقدار تھے۔

اور تو اور اس زمانے میں لکھنؤ کے محلے آباد کئے گئے تو اس بات کا پورا پورا دھیان رکھا گیا کہ ہندو اور مسلمان ساتھ ساتھ ایک ہی ماحول میں رہنا سیکھیں غرض یہ کہ حسین آباد کے ساتھ رام گنج بسایا گیا۔ منصور نگر کے پہلو میں کشمیری محلہ آباد ہوا۔ اسی طرح راجہ بازار کے ساتھ کٹرہ ابوترا بخاں گنیش گنج کے ساتھ تھائی باڑہ، پھول باغ کے ساتھ حسین گنج اور ٹھاکر گنج کے ساتھ نواب گنج اور ٹکیت گنج کے ساتھ مہدی گنج کی بستیاں آباد ہوئیں۔

دراصل نوابی کا وہ زمانہ آپسی میل جول کا، مذہبی رواداری اور باہمی محبت کا زمانہ تھا۔ اور تاریخ گواہ ہے کہ یہاں کبھی ہندو مسلم جھگڑے نہیں ہوئے۔

ترجمہ : کوثر سلطانہ

جہانگیر سمنانیؒ ... ... صفحہ ۱۳۵ کا بقیہ

حاصل ہوا۔ (۳۲) رسالہ تحقیقاتِ عشق (۳۳) رسالہ تصوف و اخلاق (کراچی یونیورسٹی شعبۂ اردو کے سربراہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی تحقیق کے مطابق حضرت مخدوم سید اشرف کا اردو نثر میں رسالہ تصوف و اخلاق اردو نثر نگاری کی پہلی تصنیف قرار دی گئی ہے۔ اس سے قبل حضرت محمد گیسو دراز کو اردو نثر کا پہلا مصنف مانا جاتا ہے۔ لیکن ان کی خود کتاب کے دیباچہ میں درج ہے کہ اس سے قبل شمالی ہند کے بزرگ حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی نے ایک رسالہ اردو میں تحریر کیا تھا۔ پروفیسر احتشام حسین کی تحقیق سے بھی یہی اشارہ ملتا ہے۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی
خالق منزل، ۳،۴۶۔ چوڑی والان
دہلی

مُرقّع اودھ

اودھ کے حکمرانوں کی تاریخ کا ایک نادر تصویر نامہ

والیانِ اودھ کی تاریخ نواب سعادت خاں بُرہان الملک کے شخصی اوج و عروج سے شروع ہوتی ہے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایران کے ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور مہم جوئی و مُقدّر آزمائی کی غرض سے ہندستان آئے۔ انھیں اقتدار عہد محمد شاہی میں نصیب ہوا اور نادر شاہ کے حملہ ۳۸، ۱۷ء کے زمانے میں انھوں نے بطور خاص شائستہ خدمات انجام دیں۔

جب ایرانی حملے اور اسکے پیدا کردہ خونی ہنگامے کی شدّت فرو ہوئی تو انھیں لکھنؤ کی صوبیداری پر فائز کیا گیا۔ اودھ کے حکمرانوں کا یہ مرکز ریاست اس وقت شیخ زادوں کے تسلّط میں تھا جنھوں نے اپنی تاب و تواں کے زعم میں اس علاقے اور اس شہر میں ایک "مُفسدہ" برپا کر رکھا تھا۔

نواب سعادت خاں نے اپنے حیلہ و تدبّر سے مخالفین کو شکست دی اور اس تمام علاقے کو اپنے قبضہ و تصرّف میں وہ کچھ اس طرح لائے کہ آئندہ ایک صدی تک، یہ ان کے خاندان کے لیئے "قلمرو سعادت" اور برہان الملک کے ورثے کی صورت اختیار کر گیا۔

بنگال اور دکن بھی اسی زمانے میں اپنے قیام و استحکام کے تاریخی مدارج طے کرتے نظر آتے ہیں لیکن بنگال میں علی وردی کے خاندان کی حکومت ایک ربع صدی کے اندر ختم ہوگئی اودھ نے تقریبًا ایک صدی پوری کی اور شمالی ہند کی تہذیب و تاریخ پر اپنے گہرے نقش ثبت کیے اور نظام دکن آصف جاہ اوّل کی قائم کردہ حکومت تقریبًا دو صدیاں پوری گزار کر اپنے تاریخی انجام کو پہونچی۔

اودھ کے حکمرانوں نے پہلے اپنا مسکنِ دولت و مرکزِ ریاست شہر فیض آباد کو بنایا۔ یہ ان کی حکمرانی کا پُر آشوب و پُر تحرک دور تھا۔ سعادت خاں، برہان الملک کے بعد پہلے دو حکمرانوں کی تاریخ اسی گلاب باڑی کے شہر سے وابستہ ہے۔

آصف الدولہ نے لکھنؤ کو اس طرح آباد اور شہری خوبیوں سے آراستہ کیا کہ پھر اودھ کی حکمرانی و جہاں بانی اسی شہر تہذیب کا حصّہ بن کر رہ گئی۔

اودھ کے فرماں رواؤں کا زمانہ ایک صدی سے زیادہ نہیں اور اس حاکمانہ تصرف میں بھی آگے چل کر انگریز شریک غالب کی حیثیت سے شامل ہو گئے باایں ہمہ اودھ کی تہذیبی فتوحات میں تارِ حریر دو رنگ جیسی ادا نمایاں اور جلوہ فرمائیاں ملتی ہیں جو اپنی جگہ پر بہت عجیب ہیں جنھوں نے غزالانِ لکھنؤ کے اس مرغزار کو "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" بنا دیا۔

زبان و ادب، تہذیب و شائستگی، شعر و سخن، فن رقص و سرود، مہارتِ تحریر و تقریر اور کمالاتِ نقش گری و تعمیر میں اس شاہی شہر اور مشرق کے تہذیبی مرکز نے جو "رسائیاں" حاصل کیں وہ اپنی نظیر آپ ہیں۔ آصف الدولہ "لکھ لُٹ" کہلاتے تھے اور یہ مثل مشہور تھی "جسے نہ دے مولا اسے دے آصف الدولہ"۔ ان کا بنایا ہوا اما مباڑہ آسمان کی طرح دور تک پھیلی ہوئی اس کی "بے ستون سقف" اس کے ایک گوشے میں بنی ہوئی حسین و جمیل مسجد، رومی دروازہ، اس کی طرف گام زمانے کے وقت قدم بہ قدم بڑھتی ہوئی اس کی وسعت، محمد علی شاہ کے مقبرے کا قاش در قاش "ہوادار" گنبد، آخری دور میں فن خطاطی کے بہترین نمونے فن داستان گوئی جو طلسم ہوش رُبا تک پہونچ گئی، مرثیہ و غزل کی طُرفہ کاریاں، عطر و پان کی پیش کش کے رسوم و آداب کی نزاکتیں، شامِ اودھ کی جلوہ باریوں کو مشرقی تہذیب و تاریخ کے اوراقِ حضور میں

بدل دیتی ہیں ؎

دیکھو تو دلفریبئ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

اودھ کے حکمرانوں کو، انگریزوں کے ایما پر، عارضی بادشاہت تو بہر حال حاصل ہوگئی مگر عظیم مغلوں جیسا جاہ و جلال، لاؤ لشکر اور زر و دولت کی فراوانی ان کا مقسوم نہ بنی ان کا دربار داخلی و خارجی ریشہ دوانیوں کا ٹوٹتا جڑتا سلسلہ بنا رہا۔ ان کی تشیع پسندی اور عقائد پرستی کا تذکرہ بھی ہماری ادبی تاریخ و صحافت میں آتا ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان کا صد سالہ دورِ حکمرانی ہماری علاقائی تہذیب کی بہترین فتوحات Achievement. میں ہے۔

یہ تصویری مرقع، جس کے ساتھ اس کے والیانِ دولت کے مختصر سوانح نامے بھی شامل ہیں، اودھ کی پرشکوہ تاریخ کے "اوراقِ گل" کی سی حیثیت رکھتا ہے شاید اسی لئے اس کے مرتب منشی بلاقی داس نے اس کا نام "گلدستۂ اودھ" رکھا ہے۔

یہ گلدستہ لکھنؤ کی شہری تہذیب کی وہ خوبصورت اور منھ بولتی تصویر ہے جس کو شامِ اودھ کا ایک دیدہ زیب و نظر فریب مرقع سے تعبیر کیا جاسکتا ہے جس کا تماشا اوراقِ مصور کی سیر سے کم نہیں۔

غالب نے لکھنؤ کے حسنِ خط کی تعریف کی ہے اس کی خوبصورت چھپی ہوئی کتابوں کے سرورق، ان کی گل کاری و نقاشی، موم سازی و طغرے نویسی کے حسنِ پیش کش کا اندازہ ایک نظر میں کیا جاسکتا ہے اور اکثر اس نظر داری کا تاثر بہت خوش آیند ہوتا ہے۔

لکھنؤ کی مسندِ شاہی کو زینت بخشنے والوں کی قلمی تصاویر کا دلپذیر عکس ان کے سوانحی کوائف کے ساتھ ایک پرکشش مرقع کی صورت میں بگمانِ غالب موجودہ صدی کے آغاز میں دہلی سے شائع ہوا تھا۔ یہ صرف چالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ سعادت خاں برہان الملک سے لے کر آخری فرماں روائے لکھنؤ، واجد علی شاہ تک سب ہی سریرِ سلطنت کو آراستہ کرنے والوں کی تصویریں اس میں دی گئی ہیں۔

لیتھو پر چھپی ہوئی، اتنی حسین و جمیل اور پرکشش تصویریں بہت کم کتابوں میں ملیں گی۔ ان کے ساتھ ہی شاہی شخصیتوں کے تعارف نامے بھی بہت خوش خط نستعلیق میں رقم کیے گئے ہیں۔

تصویروں کا انداز یا شبیہ نگاری کا اسلوب کچھ ایسا ہے جسے "ایرانی موقلم" کا حسین عکس کہا جاسکتا ہے۔ یہ تصویریں یا شبیہیں اپنے اپنے خطوط جلال و جمال میں اس عہد اور زمانہ بہ زمانہ اس کی بدلتی ہوئی تصویر کا ایک ثبات آفریں عکس پیش کرتی ہیں۔

موجودہ صورت میں اس کی تقطیع ۴½×۱۰½ انچ ہے۔ نگارشِ متن کی جدول سہ خطی ہے۔ بعدہٗ ایک انچ کے قریب جگہ چھوڑ کر پھر یک خطی جدول زیبِ قرطاس و اوراق کی گئی ہے۔ اس کے بعد بھی کچھ سادہ حاشیہ چھوڑا گیا ہے۔

بیاض کی پیشانی بھی سادہ ہے اور بغیر کسی لوح سازی کے بسم اللہ الرحمن الرحیم جلی قلم سے لکھا گیا ہے۔ تحریرِ متن کے لئے بھی نسبتاً جلی قلم استعمال کیا گیا ہے۔ کاغذ کا رنگ ہلکا بادامی ہے جو اب اپنی تاب و تواں سے محروم ہوتا جارہا ہے۔

دیباچہ کے طور پر اس تصویری مرقع اور اس کے تاریخی ماخذ کے ضمن میں لکھا گیا ہے:

"شائقینِ تاریخ دوست پر مخفی نہ رہے کہ اس نالائق ردِ خلائق عقیدت اساس، بندہٗ بلاقی داس، پسر منشی جگن لال صاحب کائستھ سری باستو کے پاس ایک نادر و نایاب مرقع تصویرات قلمی شاہانِ اودھ، ابتدائے عہد سعادت خاں (برہان الملک) لغایت واجد علی شاہ خاص کتب خانۂ شاہی کا موجود تھا ......"

مصنفِ کتاب کا بیان ہے کہ وہ اس نسخہ پر نظر ڈالتا تھا اودھ کے حکمرانوں کے شاہانہ تزک و احترام کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا اور جو شخص اسے دیکھتا تھا وہ حیرت میں پڑ جاتا تھا۔

منشی بلاقی داس نے اس تعارفی نگارش نامہ کے ساتھ ان مغل امراء اور بعد کے شاہانِ اودھ کے جو مختصر تاریخی کوائف سپردِ قلم کیے ہیں، ان میں ایک گونہ تاریخی توازن اور اس تہذیبی تناظر کو باقی رکھا ہے جو ایسی شاہی شخصیات پر گفتگو کے ضمن میں ضروری ہوتا ہے۔

دہلی کا مغل خاندان جس کی حکمرانی و جہاں بانی کا تصور شدہ

قلعۂ مبارک کی سنگین چار دیواری تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ اودھ کے ان مسند نشینوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے کہ انھوں نے انگریزوں کے ایماء پر شہر شاہجہاں آباد کے صاحبانِ تاج و سریر کے مقابلہ میں ان کے آباو اجداد کی طرف سے تفویض کردہ صوبیداری اور عہدۂ وزارت کو خود مختاری اور بادشاہت میں بدل دیا تھا۔

شہر لکھنؤ کے اہلِ زبان اور اربابِ ادب نے اپنی زبان حسنِ بیان روزمرّہ اور شہری محاورہ کو ایک نئی دبستانی حیثیت بخش دی تھی جس کے ردِ عمل کو ہم دہلی کے اساتذۂ سخن اور اس شہر کے انجمن نشینوں کے لب و لہجہ اور طرزِ کلام میں بھی ابھرتا ہوا دیکھتے ہیں۔ منشی گیلاقی داس کی نگاہ میں یہ پہلو اور اس کے لسانی تقاضے رہے ہوں گے لیکن ان کی زبانِ قلم ان تہذیبی تحفظات (Cultural Reservation) سے محفوظ رہی اور یہ اپنے طور پر ایک لائقِ توجہ اور منشی صاحب کے تئیں قابلِ تحسین بات ہے۔

دہلی اور لکھنؤ کے مابین دبستانی کشمکش بھی تھی اور وہ تعلقِ خاطر بھی جس کو حریفانہ کہا جا سکتا ہے مگر مرتب کا رویہ غیر جانبدارانہ رہا۔ اس نے اس کا خیال رکھا ہے کہ تاریخی تعارف ناموں میں شخصی تفاخر اور نجی تعصب کا اظہار نہ ہونا چاہیے۔ یہاں اس کے بعض تعارف ناموں سے مختصر اقتباس پیش کیے جاتے ہیں جس سے اس کے سوانحی اسلوب نگارش اور شخصی طرزِ گزارش کا کچھ حال معلوم ہو سکے

نواب ابُوالمنصُور صفدر جنگ

"کہتے ہیں کہ یہ نواب بڑا دلیر اور صاحب تدبیر تھا جبکہ احمد شاہ ابدالی نے مغل بادشاہ کے ہندوستان میں شورش برپا کی اس نے خوب دادِ شجاعت دی۔

اس نے اودھ میں راجہ نول رائے کو اپنا نائب مقرر کیا اور خود شاہ جہاں آباد میں بحضور بادشاہ موجود رہا بعد چند روز کے پٹھانوں نے 'مفسدہ' برپا کیا۔ نول رائے اسی ہنگامے میں مارا گیا۔ نواب نے باعانت سورج مل جاٹ وغیرہ کے پٹھانوں کا مقابلہ کیا۔"

اس سے اس زمانے میں ہندوؤں، مسلمانوں اور دوسری ہندستانی قوموں کے مابین عسکری اور سیاسی مہمات میں نامذہبی رشتوں کا کچھ حال معلوم ہوتا ہے۔ غازی الدین حیدر کی طرف سے بادشاہت کے اعلان پر مرتب نے کسی خاص ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا بلکہ اس کے تذکرے سے بھی صرفِ نظر کیا ہاں ایک دوسرے موقع پر ضرور Passing Reference کے طور پر اس کی طرف اشارہ کر دیا۔

نواب آصف الدولہ کے دور میں لکھنؤ کی آبادی و رونق کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اس نواب کے عہد میں بسبب قلتِ آمد و کثرت خرچ کے منجملہ چھ آنے جو محاصل صوبہ فی روپیہ خزانۂ سرکار انگریزی میں داخل ہوتے تھے دو آنے معاف ہوئے اور سوداگرانِ انگریزی سے محصول لینے کی اجازت بھی ملی، اور یہ انتظام بھی اسی زمانے میں ہوا کہ کوئی بدون وساطت ریزیڈنٹ کے نواب سے ملاقات نہ کرنے پاوے۔

۲۳ برس کئی مہینے حکمرانی کر کے ۲۸ ربیع الاول ۱۲۱۲ھ کو اکیاون سال کی عمر میں عالم فانی سے ملکِ جاودانی کو چلا گیا۔"

نواب مرزا وزیر علی خاں بہادر

اس نواب کے بارے میں منشی صاحب کے بیانات کا خلاصہ بایں طور پیش کیا جاتا ہے:۔

"مزاج میں نخوت بدرجۂ کمال تھی، ارکینِ دولت اس کی حکومت سے نہایت بیزار اور کمال ناخوش (تھے) صاحبان صدر نے نواب سعادت علی خاں کو متوقع اس حکومت کا کیا تھا۔ آخر عمائدِ ریاست نے ایک محضر بدیں مضمون بہ ثبت مواہر بہو بیگم و دیگر ارکین و افسرانِ فوج وغیرہ تیار کیا کہ یہ نواب، آصف الدولہ کا فرزندِ صلبی نہیں ہے۔

مسٹر جان شور نے اس نواب کو نظر بند کر کے روانہ بنارس کیا اور تین لاکھ روپے اس کے مصارف کے لیے اس ریاست سے مقرر کر دیے۔ وہاں مطلق العنان رہا کیا

اور علی بہادر خاں رئیس بندیل کھنڈ، گوشائیں ہمت بہادر اور سندھیا سے خط و کتابت جاری کی اس سبب سے وہاں سے بھی اس کا اخراج عمل میں آیا۔ بعد میں اس رئیس زادے نے ایک بڑے انگریز افسر مسٹر چیری کو قتل کر ڈالا جس کی پاداش میں وہ قید کر دیا گیا اور اسی قید فرنگ کی حالت میں اس نے جان دی۔"

وزیر علی خاں کے کردار کو اس سے متعلق بعض واقعات کے پس منظر میں شاید نئے سرے سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

منّا جان اور ان کی والدہ کا غیر مطمئن بلکہ باغیانہ کردار بھی اتنا کم مایہ نہیں جتنا انگریز بالادستی کے تناظر میں اسے دیکھا اور سمجھا گیا ہے فریدوں بخت عرف منّا جان کے تعارف میں لکھا ہے:

"بعد وفات نصیر الدین حیدر کے کرنیل جان لو صاحب ریزیڈنٹ نے مسند نشینی کے واسطے نصیر الدولہ کو تجویز کر کے ایک کاغذ اس مضمون کا اس کے پاس بھیجا کہ جو کچھ نواب، گورنر جنرل بہادر عہد نامہ جدید، تجویز فرمائیں گے ہم اس عہد نامہ پر بلا تامل دستخط کر دیں گے۔"

ادھر تو یہ ہو رہا تھا ادھر صاحب مرقع کے بیان کے مطابق صورتِ حال یوں بن گئی:

"ہنوز یہ گفتگو کرسی نشین مطلب نہیں ہوئی تھی کہ بادشاہ بیگم باوجود ممانعت کے مع منّا جان اپنے فرزند کے با فوجِ کثیر آئی۔ کرنیل جان لو صاحب کہ سامان جلوس مسند نشینی نصیر الدولہ میں مصروف تھے، بہت گھبرائے۔ بادشاہ بیگم بزور فیل دروازہ توڑ کر مع فوج مکان سلطانی میں در آئی اور کرنیل جان لو صاحب کو قید کر لیا اور دیگر اُمرایان کو بھی مع نصیر الدولہ کے نظر بند کر لیا اور منّا جان اپنے فرزند کو تخت پر بٹھایا۔ توپیں سلامی کی سر ہونے لگیں۔"

اس سے اودھ کے سیاسی منظر نامے کا ایک دوسرا رُخ بھی سامنے آتا ہے۔

ان تصویروں میں جن کی اصل قلمی تھی، اعلانِ بادشاہت کے بعد سب نوابوں کے سر پر مغربی انداز پر بنے ہوئے تاج رکھے ہیں، جنھوں نے مغلوں کے سرپیچ اور مالائے مروارید کی جگہ لے لی ہے۔ شاہی لبادہ بھی بہت کچھ برٹش تاجداروں کے لبادے سے مشابہ ہو گیا ہے اب اس نئے لبادہ نے شاہی عبا و قبا کی جگہ لے لی ہے۔

لانبی مونچھیں آصف الدولہ کے علاوہ ایک دو اور تصویروں میں بھی ملتی ہیں اور یہ ایک گونہ ایرانی اثرات کی نشان دہی کرنے والا Factor ہے واجد علی شاہ کے سر پر تاج نہیں۔ یوں بھی ان کے دس سالہ دورِ حکومت کے بعد اودھ کی تاج داری کا زمانہ ختم ہو گیا۔

□□

سکندر باغ لکھنؤ

وقار ناصری
شیش محل حسین آباد لکھنؤ ۳

لکھنؤ کے تفریحی مشاغل

حکومت اودھ کے عروج وزوال کی تاریخ جیسی بھی رہی ہو لیکن اس حکومت نے جس تہذیب کو پروان چڑھایا اس کی مثال ہندوستان میں اور کہیں نہیں ملتی۔ یہ تہذیب یہاں اس طرح پھولی پھلی کہ دور دور تک اس کے حسن و دل کشی نے دلوں کو مسخر کیا۔ زندگی گزارنے کا یہ فن ہر پہلو سے اتنا روشن تھا کہ لوگ آج تک اسے فراموش نہیں کر سکے۔ لکھنؤ اس تہذیب کا وہ مرکز تھا جس نے اپنی نفاست اور وضع داری سے زبان، رہن سہن، لباس، بول چال حتیٰ کہ تفریحی مشاغل کو بھی ایک ایسے معیاری رنگ میں ڈھال دیا جس کے نقوش یادگار بن گئے۔

یہ تفریحی مشاغل عوام سے خواص تک کی زندگی میں اس طرح رچ بس گئے تھے کہ ان کے بغیر لکھنؤ کی شناخت ممکن نہیں۔ ہر چند کہ ان مشاغل میں کافی دولت صرف ہوتی رہی ہے لیکن اس کے پس پشت ایک مثبت مقصد بھی رہا ہے۔ اگر یہ مشاغل نہ ہوتے تو وہ لوگ ہاتھوں پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے جن کو اس وسیلے سے روزگار فراہم ہوتے رہے۔ اس کے علاوہ یہ تفریحی مشاغل ذہن و دل اور جسمانی سکون کا سبب بھی تھے اس لیے لوگوں کو جو فرحت ان مشاغل سے میسر تھی وہ کسی اور طریقے سے نہیں حاصل ہو سکتی تھی۔ ان تفریحات کو معیار کمال بنانا بھی ایک مقصد تھا جو اسی صورت میں ممکن تھا کہ لوگ اس میں طرح طرح کی اختراع اور ایجاد کر کے اس منزل پر پہنچا دیں جو لکھنؤ اور اہل لکھنؤ کو دوسروں کے بمقابل ممتاز کر سکے۔

لکھنؤ اور اہل لکھنؤ کے لیے یہ تفریحی مشاغل برائے تفریح نہ تھے بلکہ یہ اس تہذیب کا ایک حصہ تھے جس کی رنگارنگی میں بھی ایک سلیقہ تھا اور یہی وہ سلیقہ تھا جس نے ان تفریحات کو وہ معیار دیا جو سوائے لکھنؤ کے اور کہیں نہیں مل سکتا

داستان گوئی

لکھنؤ میں داستان گوئی کا عام رواج تھا۔ عورتیں اور مرد بالخصوص امرا اور بیگمات کو داستانیں سننے کا بہت شوق تھا۔ مسز میر علی حسن کا بیان ہے کہ "اونچے مردوں کی اور عورتوں کی یہ عادت ہے کہ جب وہ بستر استراحت پر دراز ہو جاتے ہیں تو انھیں نیند کے لیے قصے سنائے جاتے ہیں۔"

عموماً یہ داستانیں بہادرانہ قصوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ عشقیہ داستانوں کا بھی رواج تھا۔ فسانۂ عجائب کی تحریر کی وجہ بیان کرتے ہوئے رجب علی بیگ سرور نے لکھا ہے: "حسب اتفاق ایک روز مع چند دوست صادق و محبان صفا کیش و موافق بیٹھا تھا مگر نیرنگی زمانۂ ناہنجار و کجروی فلک سفلہ پرور دوں نواز جفا شعار سے سب با دل حزیں و زار اور ہجوم اندوہ و یاس سے اور کثرت حرمان و افکار سے کہ ہر دم پہ یاس تھے دل گرفتہ سینہ ریش اور اداس تھے انھوں نے کہا۔۔۔۔۔۔ اس وقت کوئی قصہ یا کہانی بہ شیریں زبانی ایسا بیان کر کہ رفع کدورت و جمعیت پریشانی ہو۔"

لکھنؤ میں داستان گوئی کے بارے میں رتن ناتھ سرشار رقم طراز ہیں: "لکھنؤ سے بڑھ کر داستان گوئی کا چرچا اور کہیں کم ہوگا۔ بیس پچیس یاران صادق اور داستان موافق شب کے وقت کہ پردہ دار عاشقاں ہیں ایک مقام پر جمع ہوئے۔ کوئی گنا چھیل رہا ہے، کوئی پونڈے پر ہاتھ تیز کر رہا ہے جا بجا پیالیوں میں افیون گھل

رہی ہے حقیقت تو یہ ہے کہ افیون کا گھولنا اور گنّے چھیلنا بھی لکھنؤ والوں ہی کا حصہ ہے۔ کہیں چائے تیار ہو رہی ہے اور داستان گو صاحب بہ لحن داؤدی فرما رہے ہیں "اور خوں خوار ظلماتی......" ایک ایک فقرے پر سبحان اللہ اور واہ واہ کی تعریف ہوتی جاتی ہے اور داستان گو صاحب کا دماغ عرش بریں سے گزر کر لامکاں کی خبر لاتا ہے۔"

سید احسان حسن بن میر حسن نے داستان گوئی میں بڑا نام پیدا کیا۔ لکھنؤ کے دو باکمال داستان گو میر احمد علی اور میر قاسم علی تھے۔ حکیم سید اصغر علی خاں بھی مشہور داستان گو رہے ہیں جو بعد میں دربار رامپور سے متوسل ہو گئے۔ ان کے بیٹے سید ضامن علی جلالؔ لکھنوی بھی کمال کے داستان گو تھے۔ منشی انبا پرشاد رسا شاگرد میر احمد علی، حیدر مرزا تصور شاگرد حکیم سید اصغر علی نے داستانوں سے بڑی شہرت حاصل کی۔

مولانا سید آغا مہدی نے "تاریخ اودھ" میں لکھا ہے: مرزا علی نقی خاں داستان گو بنجاری ٹولہ میں رہتے تھے اور شہر کے آخری داستان گو تھے۔ ان کے بعد زبانی قصہ کہنے والا کوئی نہ رہا۔"

اگر یہ داستان گو نہ ہوتے تو اردو ادب کو فسانۂ عجائب اور طلسم ہوشربا جیسی داستانیں نصیب نہ ہوتیں۔ داستان امیر حمزہ اور طلسم ہفت پیکر کا وجود نہ ہوتا اور نہ ہی گل وصنوبر کی کہانی پڑھنے یا سننے کو ملتی۔

ہاں کس طرح وہ قصہ صنوبر بہ گل چہ کرد
اے قصہ خواں ادھوری نہ یہ داستان چھوڑ (انشاؔ)

شطرنج

لکھنؤ میں شطرنج کھیلنے کا بھی عام رواج تھا۔ اس فن کے ایک سے ایک باکمال لکھنؤ میں موجود تھے۔ تاریخ اودھ میں مولانا سید آغا مہدی نے لکھا ہے: "پرنس دارا قدر تیموری شہزادہ سکندر کے چھوٹے بھائی تھے شطرنج میں اس قدر مہارت تھی کہ یورپین انگریز ان کے کمال کے معترف ہوئے اور شکست کھائی۔ یہ عہد واجدی کے پیدا شدہ صاحب فن تھے۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار نے فسانۂ آزاد میں شطرنج کے کھیل کا مفصل ذکر کیا ہے۔ مصحفی نے پوری ایک غزل شطرنج کی ردیف میں لکھی ہے۔

چوپڑ

لکھنؤ کے تفریحی مشاغل میں چوپڑ کو بھی کافی اہمیت تھی۔ عوام اس سے اچھی طرح آشنا تھے۔ انشار اور دیگر شعرار کے کلام میں چوپڑ کھیلنے کے بارے میں کثرت سے اشعار موجود ہیں۔

یوں لگی کوسنے چوپڑ میں جو ہاری وہ پری
ستی ہو جائے دمن مر ترا راجہ نل جائے (انشاؔ)

اسی طرح تاش کھیلنے اور بجیبی کھیلنے کا عام رواج تھا۔

پتنگ بازی

لکھنؤ کے عوام وخواص کے ہر طبقے میں پتنگ بازی کا شوق پایا جاتا تھا اور پتنگ بازی کو ایک فن بنا دیا تھا۔ ڈور، مانجھا اور پتنگ بنانے میں لکھنؤ والوں نے جو کمال دکھائے اس کی مثال شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ یہیں کے لوگوں نے پتنگ میں تبدیلیاں کر کے کنکوا بنایا جس کی وجہ سے یہاں کے لوگ پتنگ بازی کو کنکوا بازی کہنے لگے۔ شرر کے بقول "کنکوے کی موجودہ صورت ابو تراب خاں کی ایجاد ہے۔ سب سے پہلے کنکوا انھوں نے بڑھایا۔"

آصف الدولہ گول دروازے کی چھت پر تکل اڑاتے تھے۔

عموماً کنکوے کھلی ہوئی چھتوں یا وسیع میدانوں میں اڑائے جاتے تھے۔ کنکوے باز ڈور کی چرخیاں اور کنکوے لے کر آجاتے۔ مسلسل نو پیچ کاٹنے والے کو نوشیرواں کہتے تھے۔ اکثر لوگ شرط بد کر کنکوے بازی کرتے تھے۔ حکمار کے نزدیک کنکوا اڑانے سے نگاہ تیز ہو جاتی ہے اور اسے ایک مقام پر قیام کرنا آجاتا ہے۔ کنکوا بازی ایک طرح کی کسرت ہے جس میں جسم کے سارے اعضا حرکت میں رہتے ہیں۔ ہاتھ اور چنگلی کہ جس سے ڈور کو پکڑا جاتا ہے اس کی حرکت سے دورانِ خون میں تیزی اور رگ وپٹھے میں توانائی آتی ہے۔

مسز میر حسن علی نے لکھا ہے: "پتنگ لڑانے کا یہ طریقہ تھا کہ لوگ مانجھا والی ڈور سے اپنے پڑوسی کے پتنگ سے اپنا پتنگ لڑاتے تھے۔ جب ہوا میں پتنگ ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں تو دونوں پتنگ باز اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اس کی ڈور اوپر آجائے۔ اوپر والی ڈور نیچے والی ڈور کو کاٹ دیتی ہے۔ پتنگ کٹنے کے موقع پر ان میں سے فاتح اور تماشہ بینوں کو بڑی خوشی ہوتی ہے۔ بچے شور و غل کرتے ہوئے کٹی پتنگ کو لوٹنے کے لیے دوڑتے ہیں لیکن کسی ایک شخص کے ہاتھ وہ پتنگ نہیں آتا بلکہ اس کے پرزے پرزے ہو جاتے ہیں۔ اپنی پتنگ کی ڈور کو اوپر کرنے کے لیے بڑی جد و جہد کی جاتی ہے تاکہ وہ طرف ثانی کی پتنگ کاٹنے میں کامیابی حاصل کر سکے۔"

ممکن ہے پتنگ اس وقت اسی طرح لڑتی ہو جیسا مسز میر حسن علی نے لکھا ہے مگر اب کنکوے باز اوپر نیچے ہر رخ سے پیچ لڑاتے ہیں اور کنکوے کاٹ دیتے ہیں۔ یہ تو صرف ان کی مہارت اور ہوشیاری پر منحصر ہے کہ وہ کس رخ سے اچھا پیچ لڑا سکتے ہیں۔ کنکوے بازی کے لیے لکھنؤ میں بہت سی اصطلاحیں رائج ہیں جن کو صرف وہی سمجھ سکتے ہیں جن کو اس شغل سے شغف ہے۔

آج بھی لکھنؤ میں کنکوے بازی کے لیے باقاعدہ ایک جگہ مقرر ہے جسے "کائٹ پارک" کہا جاتا ہے۔ یہاں کنکوے بازی کے ٹورنامنٹ ہوتے رہتے ہیں۔ دوسرے شہروں سے بھی لوگ کنکوا لڑانے یہاں آتے ہیں۔ کچھ برس قبل تک عیش باغ کے میدان میں کنکوا لڑایا جاتا تھا۔ وہاں انگریزوں کا بنوایا ہوا ایک قلعہ تھا جو بعد میں منہدم کرا دیا گیا۔ ظریف نے عیش باغ کے قلعہ کے میدان کی کنکوے بازی کے لیے یہ شعر لکھا ہے۔

ڈور کے گولے چرخیاں لے کر   ہیں قلعہ میدان میں دن بھر

لکھنؤ کے مشہور پتنگ باز بخشو اور سالاری تھے۔ اس عہد کی پتنگ بازی کا اندازہ انشا کے اس شعر سے بخوبی ہو سکتا ہے:

ہوتا ہے پہلے خون سے مانجھے کا رنگ سرخ
واں سارے ڈور پہ نہیں اڑتا پتنگ سرخ

موجودہ لکھنؤ میں مشہور کنکوا لڑانے والے مرحوم سکندر نواب، مرحوم قمر نواب، منور نواب، منے نواب، صادق حسین عرف اغن، ریاست، ذکی مرحوم، حنیف محمد، لالہ رام داس اور سدھ ناتھ ملہوترا عرف سدھو ہیں۔ ان لوگوں کے بہت سے شاگرد کنکوے بازی میں نام پیدا کر رہے ہیں۔

لکھنؤ میں پتنگ بہت خوشنما اور مختلف سائز کے بنائے جاتے ہیں۔ بچوں اور کمسن لڑکوں کے لیے چھوٹی پتنگوں کا رواج ہے۔ لکھنؤ کے ڈور سونتنے والے اور پتنگ بنانے والے کاریگر ہندوستان کے دوسرے شہروں میں بھی اس فن کی بدولت قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ احمد آباد، دہلی، جے پور وغیرہ میں لکھنؤ کے بہت سے کاریگر موجود ہیں۔

مرغ بازی

لکھنؤ میں مرغ بازی بھی مرغوب ترین کھیل رہا ہے۔ عبدالحلیم شرر "گذشتہ لکھنؤ" میں لکھتے ہیں: "مرغوں کی لڑائی کا شوق یہاں نواب شجاع الدولہ کے عہد سے آخر تک برابر رہا۔ نواب آصف الدولہ کو بے انتہا شوق تھا۔ نواب سعادت علی خاں باوجود بیدار مغز کے مرغ بازی کے دلدادہ تھے۔ ان کے شوق نے سوسائٹی پر ایسا اثر ڈالا کہ لکھنؤ کے امرا و درباردر کنار اس زمانے میں جو اہل یورپ یہاں موجود تھے انھیں بھی یہی شوق ہو گیا تھا۔ چنانچہ جنرل مارٹن.... اول درجے کے مرغ باز تھے اور نواب سعادت علی خاں سے بازی بدکر مرغ لڑاتے تھے۔"

میر تقی میر نواب آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ آئے۔ میر کی پہلی ملاقات بھی نواب آصف الدولہ سے اس وقت ہوئی جب وہ ایک مقام پر مرغ بازی میں مصروف تھے۔ میر نے ایک مثنوی مرغ بازوں کے لیے لکھی ہے۔

دلی سے ہم جو لکھنؤ آئے   گرم پرخاش مرغ یہاں لائے

... ...

میران کا نہ ہووے گو قائل   مرغ معنی پہ وہ بھی ہے مائل

مصحفی نے "مثنوی مرغ نامہ مرزا تقی فیض آبادی" میں مرزا تقی کے مرغوں اور مرغ بازی کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ مرزا تقی کو اس فن کی اچھی مہارت تھی۔

انشاء اللہ خاں انشا کو مرغ بازی کا شوق تھا۔ انشا نے ایک مثنوی "مرغ نامہ" کے نام سے لکھی ہے جس میں انھوں نے اپنے اس شوق کا ذکر کیا ہے۔

اب مجھے بھی یہ شوق ہے اس کا — کہ سمجھتا ہوں مرغ کو عنقا

... ...

ہیں غرض خوب خوب عالی مرغ — ہے بجا کہیے اگر انھیں سیمرغ

بٹیر بازی

گذشتہ لکھنؤ میں شرر نے بٹیر بازی کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ شرر لکھتے ہیں: "بٹیر بازی کا شوق لکھنؤ میں پنجاب سے آیا۔ وہاں کے بعض کنچن لوگ جن کی عورتیں عصمت فروشی کیا کرتی تھیں۔ نواب سعادت علی خاں کے عہد میں لکھنؤ وارد ہوئے اور گھاگھس بٹیر اپنے ساتھ لائے تھے۔ ان کو وہ لڑاتے تھے۔ چونکہ بٹیر لڑانے کے لیے کسی میدان وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوتی تھی بلکہ کمرے کے اندر ہی صاف ستھرے فرش پر بیٹھ کر اس کی لڑائی کا تماشہ دیکھا جا سکتا تھا۔ اس لیے لکھنؤ کے معاشرے نے اس کو بہت پسند کیا۔"

لکھنؤ والوں نے بٹیر بازی میں بھی خاصہ اہتمام کیا۔ بٹیر بنانے اور لڑانے میں طرح طرح کی جدتیں کیں۔ بٹیر کا دانہ اور غذا کے نسخے بھی ایسے تیار کیے جو اس سے پہلے کہیں استعمال نہ ہوئے۔ بٹیر کی چونچ اور ناخن پر خاص توجہ کی اور ان کے لیے ایسی کابکیں بنائیں جن کی خوبصورتی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ یادش بخیر اب سے کچھ برس پہلے تک نخاس کے چائے خانوں میں لوگ بٹیریں لیے بیٹھے رہتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بابا ہزارہ باغ اور شیش محل میں بٹیر باز جمع ہوتے تھے اور بٹیریں لڑاتے تھے۔

مصحفی نے بٹیر بازوں کے لیے لکھا ہے:

یہاں نہ روبہ کی اور نہ شیر کی بحث
رات دن ہے یہی بٹیر کی بحث

کبوتر بازی

لکھنؤ میں کبوتر بازی کے شوق کا آغاز نوابین کے قیام کے ابتدائی زمانے سے ہی ہو گیا تھا۔ اچھی اچھی نسل کے کبوتر خریدے اور پالے جاتے تھے۔ بعض کبوتر کی نسلیں اڑانے کے لیے اور بعض لڑانے کے لیے ہوتی تھیں۔ عہدِ شجاع الدولہ میں یار علی نے جو بریلی کا باشندہ تھا کبوتر بازی کو بڑا عروج دیا۔ نواب شجاع الدولہ کے کبوتر خانے میں دو ہزار کبوتر تھے۔ نواب آصف الدولہ کے کبوتروں کی تعداد تین لاکھ کے قریب تھی۔

نواب واجد علی شاہ نے باقاعدہ ایک کوٹھی کبوتر خانے کے طور پر موتی محل کے نزدیک بنوائی تھی جس میں ایک سے ایک نادر کبوتر موجود تھا۔ چھوٹے خاں رئیس الدولہ کبوتر خانے کے داروغہ اور شیخ محمد ان کی پیش دستی میں کام کرتے تھے۔

عہد غازی الدین حیدر میں میر عباس کبوتر بازی میں استاد تھے۔ میر امان علی قلی علی بھی کامل فن کبوتر باز تھے۔ عہدِ واجدی میں مرزا قین مشہور کبوتر باز تھے۔ یہ زیادہ تر کبوتریاں پالا کرتے تھے۔ یہ لکھنؤ کے محلہ مفتی گنج کے رہنے والے تھے۔

محلہ نواز گنج کے مرزا علی عباس کبوتر بازی میں کامل فن تھے۔ عموماً لڑانے کے لیے گولا نسل کے کبوتر کام میں لائے جاتے ہیں لیکن اسی لکھنؤ میں ایک کبوتر باز نواب پایہ تھے جو گرہ باز کبوتروں کو گولوں کی طرح لڑاتے تھے۔

لکھنؤ میں صرف کبوتر لڑائے ہی نہیں جاتے تھے بلکہ بعض امراض میں علاج کا ذریعہ بھی تھے۔ اطباان کے ذریعہ فالج کا علاج بھی کرتے تھے۔ کبوتر کے پر کی ہوا کئی بیماریوں میں کارآمد ثابت ہوتی تھی۔ جراح اس کی بیٹ سے زخموں کے بھرنے میں مدد لیتے تھے۔ میدان جنگ میں پیغام رسانی کے لیے بھی کبوتر کام میں لائے جاتے تھے۔

اردو شاعری میں بھی کبوتر نے مضامین کے ڈھیر لگا دیے ہیں۔

احباب کی صحبت سے دل اپنا نہ اٹھے گا
ٹکڑی کا کبوتر ہے یہ تنہا نہ اٹھے گا

——— امان علی سحر

شریک رنج غیر اس طرح سے ہونا مناسب ہے،
مری آنکھوں میں سرخی رہ گئی خون کبوتر کی

——— بندہ کاظم جاوید لکھنوی

کبوتر کی قسمیں بہت ہیں جو مختلف قد و قامت اور مختلف رنگ کے ہوتے ہیں۔ کبوتروں کی پیوندکاری کر کے بھی کبوتر بنانے کا ہنر لکھنؤ میں رائج تھا۔

گرہ باز، گولا، لقہ، شیرازی، لوٹن، نسورے وغیرہ کبوتر کی مشہور قسمیں ہیں۔ گو کہ کبوتر بازی کو زوال ہو چکا ہے۔ لیکن اب بھی لکھنؤ میں کبوتر پالنے اور لڑانے کا رواج اس عہد کی یاد دلاتا ہے جب کبوتر بازی کے فن کو لکھنؤ میں

عروج حاصل تھا۔

دیگر پرندوں کی لڑائیاں

مرغ بازی اور بٹیر بازی کے علاوہ لکھنؤ میں تیتر بازی، لووں کا لڑانا، گلدم لڑانا، لال لڑانا اور طوطے بازی کا شغل بھی تفریح کا اہم ذریعہ تھا۔ طوطوں کو بولنا بھی سکھایا جاتا تھا۔ گھروں میں "مینا" چڑیا پالنے کا رواج تھا لوگ اسے بولنا بھی سکھاتے تھے۔ کچھ لوگ کوئل اور بلبل بھی لڑاتے تھے شکرے اور باز پالنے کا رواج تھا انھیں شکار کے لیے سدھایا جاتا تھا۔

عہدِ محمد علی شاہ میں میر محمد علی طوطوں کو کبوتر کی طرح اڑاتے تھے۔ دس بارہ طوطوں کی ٹکڑی ان کی سیٹی کی آواز پر کبوتر کی طرح اڑتی اور چھت پر اترتی تھی۔

موجودہ زمانے میں بھی تیتر بازی کا رواج اودھ کے اکثر اضلاع میں پایا جاتا ہے۔

شکار

لکھنؤ میں شکار بھی تفریحی مشاغل میں تھا لیکن یہ شوق امرا اور روسا اور نوابین کا شوق تھا کیونکہ اس شوق میں دولت بہت صرف ہوتی تھی لہٰذا عوام کو اس شوق سے وہ نسبت نہ تھی جو دوسرے مشاغل سے تھی۔

نواب شجاع الدولہ کو شکار کا بہت شوق تھا اور اس کے لیے باقاعدہ جنگل میں ہرن، بارہ سنگھے، چیتے اور چیتل وغیرہ چھوڑے گئے تھے جن کا نواب شکار کرتا تھا۔

نواب آصف الدولہ کو شکار سے بہت شغف تھا۔ سال میں دوبار وہ ضرور شکار کھیلنے کے لیے جاتے۔ دو مرتبہ میر تقی میرؔ بھی نواب کے ہمراہ گئے اور مفصل شکار نامے لکھے۔ نواب سعادت علی خاں شکار کا ذوق رکھتے تھے۔ انشاؔ نے نواب کے لیے شکار نامے لکھے ہیں۔ لکھنؤ کے مشہور رئیس آغا ابو صاحب مانے ہوئے شکاری تھے۔ یہ ہمیشہ گورنر یا وائسرائے کے ساتھ شکار کھیلنے جاتے تھے۔ ان کا نشانہ لاجواب تھا۔

درندوں اور چوپایوں کی لڑائی

تفریحی مشاغل میں یہ شوق عام طور پر خواص میں پایا جاتا تھا۔ عبدالحلیم شررؔ گذشتہ لکھنؤ میں لکھتے ہیں: "جب لوگوں کو ملک گیری و صف آرائی سے فرصت ملی اور میدان جنگ میں لڑنے کا حوصلہ نہ رہا تو جنگ جوئی کے جذبات نے جانوروں کو لڑا لڑا کر جانبازی و خوں ریزی کا تماشہ دیکھنے کا مشغلہ پیدا کیا۔ یہ شوق یوں تو تھوڑا بہت بہت جگہ ہے مگر اس میں جس قدر انہماک اہل لکھنؤ کو ہوا اور ان بے نتیجہ اور سنگ دلی کی دل چسپیوں کو ان لوگوں نے جس درجۂ کمال کو پہنچا دیا اور مقامات کے لوگوں کے خواب و خیال میں بھی نہ گزرا تھا۔"

لکھنؤ میں اس تماشے کے لیے شیر، چیتے، تیندوے، ہاتھی، اونٹ، گینڈے، بارہ سنگھے، مینڈھے اور سانڈ لڑائے جاتے تھے۔ نواب شجاع الدولہ کو جنگ فیلان دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ نواب آصف الدولہ کے فیل خانے میں دو ہزار ہاتھی تھے۔ وہ دو تین دن کے بعد ہمیشہ ہاتھیوں کی لڑائی دیکھتے تھے۔

دریا اس پار جہاں آج کل ندوۃ العلماء اور آرٹ کالج کی عمارتیں ہیں وہاں جانوروں کے لیے باقاعدہ رمنہ کی تعمیر ہوئی تھی۔ نصیر الدین حیدر کے وقت اس مقام پر ہاتھی، گینڈے اور بارہ سنگھے لڑائے جاتے تھے۔

اسی رمنہ میں واجد علی شاہ فوج کی قواعد اور فنون جنگ کی مشاقی دیکھتے تھے اور باکمال سپاہیوں کو انعام و اکرام سے سرفراز فرماتے تھے۔

محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں آصف الدولہ کا ایک واقعہ لکھا ہے۔ نواب آصف الدولہ نے بھیلوں کے بن میں شیر مارا سوداؔ کو خبر ہوئی تو برجستہ یہ شعر کہا ؎

یارو یہ ابنِ ملجم پیدا ہوا دوبارہ
شیرِ خدا کو جس نے بھیلوں کے بن میں مارا

فنونِ حرب

سپہ گری کے فنون کے علاوہ لکھنؤ میں کشتی، لکڑی، پٹہ، بانک، بنوٹ، برچھا، بانا، تیر اندازی، کٹار بازی اور جل بانک کا عام رواج تھا جن کے باکمال استاد اپنے شاگردوں کو یہ فنون سکھاتے تھے۔

کشتی گیری

کشتی اور پہلوانی کے لیے لکھنؤ میں بہت سے اکھاڑے تھے۔ یہاں

کشتی میں داؤ پیچ پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ لکھنؤ کے مشہور پہلوانوں اور شہزوروں میں احمد حسین شہ زور، میر لچو، میر تقی خاں، استاد سکندر، نواب پٹھان دریابادی، شیدی فولاد، شیدی فضل علی، شیدی عنبر، شیدی غلام علی، نواب صادق علی خاں عرف شہنشہ دولہ اور غالب علی نمایاں تھے۔ چھوٹے سید اور بڑے سید بھی نامی پہلوانوں میں تھے۔ ان کا اکھاڑا بہت مشہور تھا اور ان کے سینکڑوں شاگرد تھے۔ بڑے سید کے انتقال کے کچھ برس بعد چھوٹے سید بھی ۱۹۳۱ء میں فوت ہوئے۔ اخبارات نے نوٹ لکھے۔

ہیں اکھاڑے میں کرتے ہیں پیچ کشتی گیر
کہ ٹھوک ٹھوک کے خم لڑتے ہیں جواں سے جواں

مصحفی کہتے ہیں ۔

فن کشتی میں قیامت ہے وہ بت کا درکا
دھوم دیتا ہے پٹا آوے ہے جب دھوبی پاٹ

بانک

یہ فن بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ اس فن کی ابتدا اس مقصد سے ہوئی کہ چھڑیوں کی مدد سے حریف کا مقابلہ کیا جائے اور وہ پسپا ہو جائے اودھ میں اس فن کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ زیادہ تر شرفا اس فن کے قدرداں تھے اور وہی اس فن کو شوق سے سیکھتے تھے۔

نواب شجاع الدولہ کے عہد میں منصور علی خاں اس فن کے ماہرین میں سے تھے۔ نواب آصف الدولہ کے عہد میں شیخ نجم الدین کا شمار اس فن کے ماہرین میں ہوتا تھا۔ آغا مرزا بانک کے فن کے باکمال استاد تھے۔ عبدالحلیم شرر نے بانک جاننے والوں میں پرنس مرزا ہمایوں قدر کا بھی ذکر کیا ہے۔

بنوٹ

اس فن کے جاننے والے اپنے ہاتھ سے یا ایک رومال سے جس میں پیسہ بندھا ہوتا تھا اپنے حریف کو چاہے وہ کوئی حربہ لیے ہو ایسے کارگر طریقے سے زک پہنچاتے تھے کہ اس کا کام تمام ہو جاتا تھا۔ لکھنؤ میں اس فن کے بہت سے باکمال استاد تھے۔ محمد ابراہیم خاں رامپوری اور طالب شیر خاں اس فن کے ماہرین میں سے تھے۔ نواب معشوق محل کے داروغہ محمد مہدی اس فن کے باکمال استاد تھے۔ اس فن کے ماہرین کا ادنیٰ کرشمۂ کمال یہ ہے کہ جنگلی کبوتر چوکی کے نیچے چھوڑ دیا جاتا تھا اور وہ باہر نہیں آ پاتا تھا۔

آخری دور کے ایک استاد حسین بخش تھے جن کو اس فن میں بہت مہارت تھی۔ لکھنؤ میں استاد ابو صاحب اس فن کے آخری جاننے والے تھے۔

کٹار

اپنی جان کی حفاظت کے لیے عام طور پر لکھنؤ کے لوگ کٹار اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ کٹار چلانا بھی باقاعدہ ایک فن ہے۔ لکھنؤ میں اس فن کے بہت سے ماہرین تھے۔

اس زمانے میں یہ سپاہی نہیں بیگاری ہے
نہ تو تلوار سجی ہے نہ کٹاری تیار (آتش)

جل بانک

یہ شناوری کا فن تھا۔ اس فن کا مقصد گہرے پانی میں دشمن پر قابو حاصل کرنا تھا۔ نصیر الدین حیدر کے عہد میں میرک جان اس فن کے استاد تھے۔ لکھنؤ کے محلہ شریف منزل کے خلیفہ رضا حسین جل بانک کے ماہرین میں سے تھے۔ کیونکہ جل بانک کا تعلق پیراکی سے ہے لہٰذا اس فن کے ماہرین باکمال پیراک بھی ہوتے تھے۔ نصیر الدین حیدر کے استاد میر مچھلی باکمال پیراک تھے۔ عہد واجدی میں بدلو نائی پیراکی میں ماہر تھا۔ شیخ عابد علی پیراکی کے باکمال استاد تھے۔ خلیفہ رضا حسین کے والد میر صفدر علی پیراکی کے ماہر تھے جو شیر دہنج ملاحی اور جل بانک میں لاجواب تھے سینکڑوں شاگردوں کو انھوں نے پیراکی کے فن سے آگاہ کیا تھا۔ حکیم سید محمد نواب جل بانک اور لکڑی میں کافی مہارت رکھتے تھے۔

شہسواری

لکھنؤ میں شہسواری بھی تفریحی مشاغل میں شامل تھی۔ عموماً روسا اور امرا اس فن میں دلچسپی رکھتے تھے۔ عمدہ عمدہ نسل کے گھوڑے فراہم کیے جاتے تھے۔ سپاہیانہ زندگی کے علاوہ سفر اور شکار کے لیے بھی شہسواری ضروری ہے لہٰذا لکھنؤ میں اس فن کو بڑا عروج حاصل ہوا۔

نواب سعادت علی خاں شہسواری کی بڑی مہارت رکھتے تھے ان کے اصطبل میں ایک سے ایک عمدہ نسل کے گھوڑے موجود تھے۔ عہد واجدی

میں ممن خاں اور شیخ ببر علی شہسواری کے باکمال لوگ تھے۔ آغا ابو صاحب بھی اپنے زمانے کے مشہور شہسوار تھے۔

تلوار چلانا

کیونکہ اس دور میں تلوار کو جنگ میں اہمیت حاصل تھی اس لیے فوجیوں اور شہزادوں کو اس فن کی تعلیم دی جاتی تھی۔ علاوہ ازیں جو لوگ مگدر چلانے کے مشاق ہوتے تھے وہ تلوار چلانے میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ لکھنؤ کے بانکے تو آج تک تلوار چلانے کے لیے مشہور رہیں جو ذرا ذرا سی بات پر تلوار کھینچ لیتے تھے۔ مرزا احمد بیگ کٹیا کٹیا زبردست بانکے تھے، ایک تلوریے اور ان سے تلوار چلی۔ اپنے سینے پر احمد بیگ نے تلوار کے اس قدر وار روکے کہ زخموں کے نشان کی ہیکل بن گئی۔ اسی دن سے مرزا صاحب کٹیا کٹیا کے نام سے مشہور ہو گئے۔

بھانڈ، نقال، لطیفہ گو

لکھنؤ کے تفریحی مشاغل میں یہ لوگ بھی شامل تھے۔ عموماً شادی بیاہ اور دیگر تقریبوں میں دل بہلانے کے لیے یہ لوگ بلائے جاتے تھے۔ لکھنؤ کے بھانڈوں میں قائم علی مشہور بھانڈ گذرا ہے جس کی حکایتیں آج بھی تاریخ میں محفوظ ہیں۔ نخاس کے پاس کی گلی میں آج بھی بھانڈ طبقہ کے لوگ موجود ہیں۔ نقالوں کی نقل اور لطیفہ گویوں کے لطیفوں سے ہر طبقہ محظوظ ہوتا تھا لیکن دھیرے دھیرے یہ لوگ کم ہوتے گئے، یا دوسرے پیشوں میں چلے گئے اب ان کا نام ونشان بھی نہیں ملتا۔

رقص و سرود

دربار اودھ کی سرپرستی کی وجہ سے اس فن کو فروغ حاصل ہوا۔ نواب شجاع الدولہ بذات خود فن موسیقی میں دسترس رکھتا تھا۔ نواب آصف الدولہ نواب وزیر علی خاں اور دوسرے نوابین اودھ کو رقص وسرود سے بڑی دلچسپی تھی۔ فیض آباد اور لکھنؤ میں بالخصوص ہندوستانی موسیقی کو بڑی ترقی ہوئی۔

نواب آصف الدولہ کے عہد میں محمد رضا خاں نے اصول النغمات الآصفیہ جیسی معرکۃ الآرا کتاب لکھی۔ انشا نے سندیلہ کے ایک مولوی صاحب کے بارے میں لکھا ہے جو فارسی راگوں کے علاوہ ہندوستانی راگوں سے بھی بخوبی واقف تھے۔ لکھنؤ کے سازندوں اور گویوں کا ذکر کرتے ہوئے رجب علی بیگ سرور نے فسانۂ عجائب میں لکھا ہے: "کلاونت قوال بے مثال، چھجو خاں، غلام رسول سب کو موسیقی میں کمال۔ حصول شوری کی منھ زوری کی دھوم ہے پٹے کا موجد ہے۔ سب کو معلوم ہے بخشو اور سالاری نے طبلہ ایسا بجایا کہ پکھاوج کو بھی شرمایا۔"

اس عہد کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنند بخش، شجاعت خاں، محمد خاں، دیبی داس، جیون خاں، مصاحب خاں، ہستو خاں اور میر ضاحک مشہور و معروف موسیقی داں تھے۔ واجد علی شاہ نے اس فن کی بہت قدر دانی کی۔ رقص وسرود کی تعلیم کے لیے پری خانہ کی بنا ڈالی۔ کتھک کو فروغ دیا۔ طبلہ بجانے اور نے کاری میں واجد علی شاہ کا جواب نہ تھا۔ دھرپد، پٹہ اور خیال ایسا گاتے تھے کہ اچھے اچھے گانے والوں کے ہوش اڑ جاتے تھے۔ 'بنی'، ناجو اور دلھن میں واجد علی شاہ نے بہت کچھ موسیقی کے بارے میں تحریر کیا ہے۔ کتھک کے بھاؤ، طبلہ کی گتیں اور تال کے بارے میں یہ کتابیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

آصف الدولہ کے ماموں سالار جنگ، خواجہ حسن مودودی، علامہ تفضل حسین خاں موسیقی کے نامور ماہرین میں سے تھے۔ غازی الدین حیدر کے زمانے میں حیدر خاں خیال گانے میں بے مثال تھا۔ غازی الدین حیدر ہی کے زمانۂ حکومت میں سوز خوانی کا بھی رواج ہوا۔ میر علی نے اس میں بڑی شہرت پائی۔ عہدِ واجد میں پیار خاں، جعفر خاں، حیدر خاں، محمد علی خاں، نظام الدین احمد خاں، محمد احمد خاں، حیدر علی خاں، جھمو خاں موسیقی کے ماہرین میں شمار ہوتے تھے۔ ٹھمری گانے والا قدر نواب وزیر مرزا بے مثال تھے۔ ڈولے خاں دھرپد اور ہوری گانے میں استاد تھا۔ کتھک میں کالکا اور بندا دین جیسے فنکار تھے۔

مرد ماہرین کے علاوہ عورتوں کو بھی ناچ گانے میں کمال تھا۔ سعادت یار خاں رنگین نے عزیز طوائف اور مہتاب کے رقص وسرود کا بڑے پُرلطف انداز میں ذکر کیا ہے۔ میر حسن نے ایک مثنوی میں ماہ رتن، ننھی، پنا، مصری اور بہت سی طوائفوں کا ذکر کیا ہے۔ مرزا قتیل نے لکھنؤ کی طوائفوں میں جگیا، امیر بخش کے علاوہ اور کئی نام لکھے ہیں۔ چونے والی حیدر اپنی آواز کی وجہ سے بہت مشہور تھی۔ نصیر الدین حیدر کے عہد میں بی بنی کو ناچ گانے میں کمال

حاصل تھا۔ لکھنؤ کی کچھ اور مشہور ناچنے گانے والیاں حیدر جان، حسین باندی، پیارزو، امیر بخش تھیں جن کے نام تاریخ میں محفوظ ہیں۔ جدن، ہرمزی، تہوا، گوہر، چودھرائن اور اس کی لڑکیاں رشک منیر، بدر منیر بعد کی وہ گانے والیاں ہیں جن کی دھوم سارے ہندوستان میں تھی۔

کچھ برس قبل تک لکھنؤ میں استاد یوسف علی خاں، خلیفہ احمد حسین، چنوخاں، بڑے آغا خاں (میوزک کالج کے پرنسپل بھی رہ چکے ہیں) استاد عابد حسین، استاد مروت حسین خاں، سخاوت حسین خاں، لچھو مہاراج اور راجہ نواب علی جیسے فنکار موجود تھے۔ راجہ نواب علی کا ایک بڑا کارنامہ ان کی تصنیف "معروف النغمات" ہے جو فن موسیقی پر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہ تفریحی مشاغل صرف لکھنؤ کا طرۂ امتیاز نہ تھے بلکہ اودھ کے دیگر قصبات میں بھی ان کا چلن عام تھا۔ اگر ان قصبات کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو اس کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے کہ وہاں کے لوگ بھی لکھنؤ کی تہذیب سے متاثر تھے اور جو کچھ لکھنؤ میں ہوتا تھا وہ اس کو بڑے فخر کے ساتھ قبول کر لیتے تھے۔ چنانچہ اودھ کے راجگان اور تعلقدار کا طرز حیات لکھنؤ کے نوابین کی تقلید کرتے کرتے بالکل لکھنوی ہو گیا تھا۔

بعض مورخین نے ان تفریحی مشاغل میں دولت کے بیجا اسراف کا شکوہ کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی بات کسی حد تک درست ہو لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اس وقت اودھ کی رعایا خوشحال تھی اور لوگوں کے پاس اتنی دولت تھی کہ وہ صرف کر سکیں۔ اس کے علاوہ یہ مشاغل روزگار کی ایک بڑی صورت بھی تھے کیونکہ اس وقت نہ آج کی طرح بڑی بڑی صنعتیں تھیں اور نہ ہی دوسرے وسائل۔ لہٰذا اس صورت میں تو یہ ہی ہو سکتا

کاکوری قلعہ

ندرالحفیظ ندوی، ازہری
استاد عربی ادب ۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

ندوۃ العلماء کا تاریخی پس منظر

ندوۃ العلماء کی بنیاد جس زمانے میں رکھی گئی وہ انیسویں صدی کے نصف آخر کا زمانہ تھا۔ یہ وہ عہد ہے جس میں تازہ دم مغرب اور ضعیف و ناتواں مشرق کی باہمی کشمکش اپنے نقطۂ عروج تک پہنچ چکی تھی۔ اس عقلی و فکری کشمکش کے نتیجے میں قدرتی طور پر بہت سی شخصیتیں پیدا ہوئیں جو مسلمانوں کے مختلف مکاتب خیال کی نمائندہ تھیں۔ متعدد تعلیمی اور اصلاحی تحریکیں اٹھیں اور انھوں نے اپنے اپنے دائرہ میں اسلام اور مسلمانوں کی قابلِ قدر اور ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں۔

قدیم عربی مدارس

اس عہد پر نظر ڈالئے تو ایک طرف قدیم عربی مدارس اپنے تمام خصوصیات اور امتیازات کے ساتھ نظر آئیں گے۔ کتاب و سنت استقامت اور اسلاف کے طریقۂ فکر اور طریقۂ تعلیم پر اصرار ان کا شعار تھا اور نو وارد مغربی تہذیب اور ہندوستانی سماج کے تصادم سے پیدا ہونیوالے مسائل اور سوالات کی طرف ان کی توجہ بہت کم تھی۔ ان کے ذمہ دار اور ارباب حل و عقد جن کا اخلاص شبہ سے بالاتر ہے۔ شاید یہ سوچتے تھے کہ آگے بڑھ کر دشمن پر حملہ کرنے کے بجائے قلعہ بند ہو کر اپنی حفاظت زیادہ مفید ہے اور صرف اس طریقہ سے ایمان کی حفاظت ممکن ہے۔

اس طرز فکر کا اظہار نصاب تعلیم میں اس طرح ہوا کہ درس نظامی (جس کے نظام میں اس سے پہلے برابر تبدیلیاں ہوتی رہیں۔

اس زمانہ میں (قیام ندوۃ العلماء کے وقت) نصاب تعلیم بعض قدیم مرکزی مدارس میں رائج تھا اس پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ طلبہ کے قیمتی اوقات کا بڑا حصہ معقولات پر بلاضرورت صرف ہو رہا تھا، اور دینیات اور علم نافع کی طرف توجہ کتنی کم تھی۔ مثلاً شرح ملاجامی جو چار سو صفحہ کی کتاب ہے۔ اس کی مدت سات ماہ تھی، لیکن صحیح بخاری کیلئے جو ۱۱۴۸۷ صفحے کی کتاب ہے ۳س ۶ مہینے کی رکھی گئی۔ ؎

مولانا رشید احمد گنگوہی رح، فلسفہ کی کتابوں کا پڑھانا دین اور وقت دونوں کا ضیاع سمجھتے تھے ؎ لیکن ہندوستان کی عام تدریسی فضا کے اثر سے نیز دارالعلوم کے دوسرے اساتذہ کی خواہش اور دباؤ سے مولانا نانوتوی کی وفات کے بعد تدریجی طور پر فلسفہ و منطق کی ساری کتابیں داخل کر لی گئیں، اور اس کے ساتھ مدت تعلیم میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔

تاہم اس حقیقت سے کوئی ہوشمند اور منصف انسان انکار نہیں کر سکتا کہ دیوبند کے فضلاء نے ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل کر دین خالص کی جس طرح حفاظت کی ہے اس سے ہندوستان میں اسلامی زندگی کے قیام و بقا، و استحکام میں بیش قیمت مدد ملی ہے اور آج جو صحیح اسلامی عقائد دینی علوم اہل دین کی وقعت، اور صحیح روحانیت اس ملک میں نظر آتی ہے اس میں بلاشبہ اس کا نمایاں اور بنیادی حصہ ہے، اگرچہ زمانہ کی تغیر پذیری نئے نئے خطرات اور مسائل میں روز افزوں ترقی الحاد و بے دینی کی اشاعت نیز مغربیت و اشتراکیت کی ہر دلعزیزی و مقبولیت کی بنا پر مادیت کی طوفانی لہر عام مسلمانوں کے سروں سے گزر کر اب ان قلعوں کی دیواروں سے بھی ٹکرانے لگی ہے جنکو ابتک محفوظ اور اس نئے طوفان کی دسترس سے دور سمجھا جاتا رہا ہے۔

سرسید کی رائے یہ تھی کہ تہذیب و تمدن، معاشرت و اخلاق اور خیالات و افکار میں مغرب کی تقلید کرو، اور اس کے سانچے میں اپنے کو ڈھال دو لیکن کیا ان دو راستوں کے علاوہ کوئی تیسرا راستہ نہیں تھا؟

سید امیر علی اور مولوی چراغ علی

سید امیر علی (م ۱۹۲۸ء) اور مولوی چراغ علی (م ۱۸۹۵ء) نے سرسید سے کچھ آگے بڑھ کر اسلام کی مدافعت کی اور مغربی مفکرین و مصنفین کے اعتراضات کے جوابات دینے کی کوشش کی اور اس میں ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے، بالخصوص سید

امیر علی کی کتاب (SPRIT OF ISLAM) نے مغرب کے علمی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کیا، اور ہندوستان کے اعلیٰ تعلیم یافتہ حلقہ پر خاصا اثر ڈالا۔ لیکن افسوس ہے کہ ان دونوں کا طرز فکر اور اسلوب بیان معذرت خواہانہ APOLOGETIC اور مدافعانہ تھا وہ کہتے تھے کہ اسلام مغربی علوم کا کسی صورت میں مخالف نہیں ہے۔ ان کتابوں کے سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ آگے بڑھکر جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے کسی حد تک اسلام کی فضیلت اور برتری کا اچھا اثر دیا ہے۔ لیکن مغربی فلسفہ مغربی علم اجتماع اور مغربی علم تمدن نے لوگوں کے لئے ذہن و دماغ پر جو نقش قائم کر رکھا تھا، اس کو زائل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نیا تاثر اور نیا نقش دیر پا ثابت نہ ہو سکا۔ اور مغربی طرز فکر کی بنیادیں مضبوط اور مستحکم رہیں۔

روحانی مراکز اور خانقاہیں ۔ ان مکاتب خیال کے پہلو بہ پہلو ایک قوت اور بھی تھی جس کے اثر سے اسلامی ہند کا کوئی حصہ آزاد نہیں تھا۔ یہ روحانی خانقاہیں اور سلسلے تھے، جن کے احسان بارگراں سے ملت اسلامیہ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ یہ مراکز ایمان و یقین، اخلاق اور روحانی تربیت اور اصلاح باطن کا وہ سرچشمہ تھے جہاں بس اہل ایمان اور اہل طلب سیراب ہوتے تھے۔ اور اپنی روحانی تشنگی بجھاتے تھے جو چند نام اس سلسلے میں لئے جا سکتے ہیں ان میں خواجہ محمد سلیمان تونسوی (م ۱۸۴۱ء) اور مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی (م ۱۸۹۵ء) حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (م ۱۳۱۷ھ) مولانا رشید احمد گنگوہی (م ۱۳۲۳ھ) کے نام سر فہرست ہیں۔ ان بزرگوں کے حلقے ہندستان کے مضطرب تغیر پذیر ماحول میں رشد و ہدایت کے وہ جزیرے تھے جہاں آکر انسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے دل کا مرہم اور قلب کا سکون پایا۔

تحریک ندوۃ العلماء

تحریک ندوۃ العلماء دارالعلوم دیوبند اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے بعد وجود میں آئی گویا ندوۃ العلماء کی تاسیس اس وقت ہوئی جب قدیم و جدید مکتب خیال کی دونوں تحریکوں کی سرگرمیوں کے برسوں بیت چکے تھے، دیوبند کے قیام کو ۲۶ سال ہو چکے تھے، اور علی گڑھ کا ایم اے او کالج اپنی عمر کا اٹھارواں سال پورا کر رہا تھا۔ علی گڑھ اور دیوبند کی تعلیمی و اصلاحی تحریکوں کے عین عہد شباب میں ندوۃ العلماء کا قیام جن اغراض و مقاصد کے تحت عمل میں آیا وہ حسب ذیل تھے، اس تحریک کے پیش نظر ابتدا میں دو مقاصد تھے۔

۱۔ علوم اسلامیہ کے نصاب درس میں دور رس اور بنیادی اصلاحات اور نئے نصاب کی تیاری۔

(۲) رفع نزاع باہمی۔ یعنی اتحاد ملی اور اخوت اسلامی کے جذبات کو فروغ دینا۔ تحریک ندوۃ العلماء بانی ندوۃ العلماء مولانا سید محمد علی مونگیری اور ان کے عالی ہمت رفقاء کی قیادت میں جوں جوں آگے بڑھتی رہی اس نے اپنے دائرہ کار اور بنیادی مقاصد میں اضافہ کیا۔ اب گویا مندرجہ ذیل چار مقاصد تحریک ندوۃ العلماء کے بنیادی مقاصد قرار پائے۔

۱۔ علوم اسلامیہ کے نصاب درس میں بنیادی اصلاحات اور نئے نصاب کی تیاری۔

۲۔ ایسے علماء پیدا کرنا جو کتاب و سنت کے وسیع و عمیق علم کے ساتھ جدید خیالات سے بخوبی واقف اور زمانہ کے نبض شناس ہوں

۳۔ اتحاد ملی اور اخوت اسلامی کے جذبات کو فروغ دینا۔

۴۔ اسلامی تعلیمات کی اشاعت بالخصوص برادران وطن کو اس کی خوبیوں سے روشناس کرانا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنے والد ماجد سید عبدالحی حسنی جو تحریک ندوۃ العلماء کے سرگرم مخلص، داعی و ناظم بھی تھے کی سیرت حیات عبدالحی میں تحریک کی فکری اساس اور اس کی خصوصیات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

۱۔ اس تحریک کی اساس (علی گڑھ کی تعلیم جدید اور مغربی تہذیب کی دعوت اور ملک کی دوسری تحریکوں کے خلاف) خالص دینی تھی۔ یعنی اس میں مسلمانوں کے تنزلی کا اصل سبب دین سے انحراف اور صحیح دینی تعلیم سے محرومی کو قرار دیا گیا تھا اور اس کو ملت کے درد کا مداوا اور اصلاح و ترقی کا واحد راستہ تسلیم کیا گیا تھا۔

(۲) اس تحریک میں طبقہ علماء میں امور شریعت اسلامی کا حامل و امین۔ کتاب و سنت کا شارح و ترجمان اور اسلام کا اصل نبض شناس ہے۔ مرکزی مقام دیا گیا ہے اور اسی کو امت

کی تعمیر و تخریب یا ترقی و تنزلی، اصلاح و فساد کا اصل ذمہ دار قرار دیکر انہی دعوت اور جد و جہد کا محور بنایا گیا ہے۔ کہ اس میں اصلاح حال کی کوئی کوشش اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک علما اسکے داعی و علمبردار نہ بنیں اور ان میں امت کی رہنمائی کی قیادت کی صلاحیت پیدا نہ ہو اس کیلئے ایک طرف دینی علوم پر حاوی اور کتاب و سنت کا رمز شناس ہونے کی ضرورت ہے۔ دوسری طرف حالات زمانہ اور جدید ضرورتوں سے واقفیت کی۔

۳۔ اس تحریک کا مزاج (سیاسی وہنگامی کے بجائے) علمی وفکری تھا۔

۴۔ ندوۃ العلما، کی تحریک کا آغاز ہی اصلاح و ترقی کے کام سے ہوا تھا۔"

۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں مدرسہ فیض عام کانپور کے سالانہ جلسہ کے موقع پر ہندوستان کے چوٹی کے مشاہیر علماء جمع تھے جن میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

استاذ الاساتذہ مولانا لطف اللہ علی گڑھی، مولانا حافظ شاہ محمد حسین الہ آبادی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا خلیل احمد مدرس دوئم دیوبند مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا نذر محمد پنجابی، (صدر مدرس مدرسہ اسلامیہ فتحپور)، مولانا احمد حسن کانپوری، مولانا سید محمد علی مونگیری، شیخ الہند مولانا محمود حسن (مدرس اول دارالعلوم دیوبند) مولانا شاہ محمد سلیمان پھلواروی، مولانا حکیم سید محمد ظہور الاسلام فتحپوری، مولانا عبد الغنی خاں، مولانا حکیم فخر الحسن گنگوہی، مولانا سید شاہ تجمل حسین دسنوی ۔ اس منتخب جلسہ میں باہمی مشورے سے ندوۃ العلماء کے نام سے ایک مجلس کے قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور یہ بھی کہ آئندہ سال ندوۃ العلماء کے نام سے ایک جلسہ کیا جائے مولانا سید محمد علی مونگیری کو اس مجلس کا پہلا ناظم اور سکریٹری مقرر کیا گیا۔

مولانا سید محمد علی مونگیری نے ندوۃ العلماء کے اغراض و مقاصد سے تعارف کرانے کے لئے ملک کے کونے کونے میں اپنے آدمی بھیجے جنہوں نے علما، اور جدید حلقہ سے رابطہ قائم کر کے انہیں ندوۃ العلماء کے پہلے سالانہ اجلاس میں شرکت کی دعوت دی۔ ندوۃ العلماء کا پہلا سالانہ اجلاس ۱۵، ۱۶، ۱۷ شوال ۱۳۱۱ھ مطابق ۲۲، ۲۳، ۲۴ اپریل ۱۸۹۴ء میں مدرسہ فیض عام کانپور میں منعقد ہوا، پھر تو ملک کے مختلف مقامات پر اجلاس ہونے لگے مسلمانوں کے ہر طبقہ نے ندوۃ العلماء کے اغراض و مقاصد کی حوصلہ افزائی کی۔ اور اس کو وقت کا اہم تقاضہ قرار دیا۔

دارالعلوم کے قیام کا پہلا خاکہ

۱۲ محرم ۱۳۱۱ھ کو شہر بریلی کے جلسے میں مولانا سید محمد علی مونگیری نے سب سے پہلے دارالعلوم کے قیام کا خاکہ پیش کیا جسے استصواب رائے کیلئے ملک کے ممتاز علما اور دانشوروں کے پاس بھیجا گیا۔ دوسرے سال کے جلسہ میں عام بحث و مباحثہ کے بعد یہ مسودہ منظور کر لیا گیا۔

علما، حضرات نے نہ صرف اس مسودہ کی بھر پور تائید و حمایت کی بلکہ ندوۃ العلما، کے تحت ایک دارالعلوم کے قیام کو ہندوستان میں نیز پورے عالم اسلام کے لئے ایک انقلاب انگیز قدم قرار دیا۔

دارالعلوم کے لئے مطلوب درسگاہ کی عمارت کے علاوہ دارالاقاموں، کتب خانہ، شفاخانہ، اساتذہ کے لئے رہائشی عمارتیں، باورچی خانہ، طلبہ کی یونین اور مسجد کیلئے عمارتوں کی تفصیل دی ہے۔ دفعہ ۴ کے تحت اس دارالعلوم کے طلبہ کے لئے نظام تربیت کی تفصیل بارہ دفعات میں ہے پھر شرائط، اقدار واصول و ضوابط ہیں اس کے بعد نظام تعلیم و تدریس اور نصاب کا ذکر ہے اور یہ تجویز رکھی گئی ہے کہ وقتاً فوقتاً عالم اسلام کے تعلیمی مراکز سے نصاب کی تفصیلات منگوائی جائیں گی، اور اگر کوئی کتاب مطلوبہ معیار کے مطابق دستیاب نہ ہوئی تو اس کو ترتیب دیا جائے گا

دارالعلوم کے طلبہ کی انجمنوں کا خاصا تفصیل سے تذکرہ ہے جس میں دارالمطالعہ، دارالکتب تحریری و تقریری ملکہ پیدا کرنے کے لئے مختلف ثقافتی و فکری شعبوں کی تفصیل ہے۔

اس مسودہ دارالعلوم میں سالانہ و ششماہی امتحانات کا بھی تذکرہ ہے۔ اس مجوزہ دارالعلوم کے قیام کے لئے متفقہ طور پر لکھنؤ کا انتخاب ہوا۔ جو ہر طرح اس علمی، ادبی تہذیبی مرکز کے شایان شان تھا۔

کانپور سے علماء کا ایک وفد مولانا سید محمد علی مونگیری کی قیادت میں ۱۶ شوال ۱۳۱۰ھ مطابق بروز پنجشنبہ ۱۰ مارچ ۱۸۹۰ء لکھنؤ روانہ ہوا۔ اس وفد میں مولانا مسیح الزماں خاں صاحب مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی، مولانا حاجی محمد یونس خاں صاحب، مولانا خلیل الرحمن سہارنپوری، مولانا ظہور الاسلام فتحپوری، مولانا حفیظ اللہ وغیرہ تھے منشی احترام علی کاکوروی اور منشی احتشام علی کاکوروی نے کشادہ دلی سے دریائے گومتی کے کنارے اپنی ایک وسیع قطعۂ آراضی ندوۃ العلماء کے حوالہ کی۔ یہ جگہ اس وقت برودہ حسن باڑی کے نام سے مشہور تھی، ابتداء میں گولہ گنج کی ایک عمارت کو خرید کر عارضی طور پر دارالعلوم قائم کر دیا گیا، پھر رفتہ رفتہ دارالعلوم کی عمارتیں تعمیر ہونے لگیں۔ اب اس وقت مرکزی عمارت درسگاہ کے لئے۔ ایک عمارت تین منزل کتب خانہ کے لئے، ایک حسین وجمیل مسجد، ایک مہمان خانہ، ایک شفاخانہ ایک دارالقضا، ایک وسیع عمارت، معہد تحفیظ القرآن کے نام سے، ایک معہد ثانویہ مع دارالاقامہ، سلیمانیہ ہوسٹل، اطہر ہوسٹل، رحمانیہ ہوسٹل اور شبلی ہوسٹل نیز اساتذہ اور اسٹاف کے لئے رہائشی عمارتیں دارالعلوم کے کیمپس کے مختلف حصوں میں موجود ہیں۔ شعبۂ تعمیر وترقی، اور مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کی بھی عمارتیں اس کیمپس میں موجود ہیں۔ ۲ ستمبر ۱۸۹۸ء کو کانپور سے ندوہ کا دفتر منتقل ہو کر لکھنؤ گولہ گنج آ گیا۔ ۲۶ ستمبر کو دارالعلوم کا عملی افتتاح اس خاتون منزل میں ہو گیا جو دارالعلوم کے لئے خریدی گئی تھی۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء نے جس عزم وارادے سے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا وہ اس نے جاری رکھا ملک کے طول وعرض میں ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسے بڑے اہتمام سے منعقد کئے جاتے تھے کانپور، لکھنؤ، ناگ پور، امرتسر، بریلی، بلگام، کلکتہ، مدراس، میرٹھ، شاہجہاں پور، پٹنہ، بنارس، پونہ، انبالہ جیسے مقامات پر ندوۃ العلماء کے تقریباً بائیس سالانہ جلسے منعقد کئے گئے، دوسری طرف تعلیم وتربیت اور دعوت و تبلیغ، تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی ندوۃ العلماء نے اپنا سفر جاری رکھا، اور اس نے اپنے نصب العین سے کسی دور میں بھی انحراف نہیں کیا اللہ تعالیٰ نے اس ادارے کو ایسی مخلص اور باکمال شخصیتیں عطا فرمائیں جنہوں نے اس کے پیغام کو مشرق ومغرب کے گوشے گوشے میں پہنچا دیا۔

مولانا سید محمد علی مونگیری جیسے روشن ضمیر، عالم ربانی، مولانا سید عبدالحئی حسنی جیسے بلند پایہ محقق ومصنف دیدہ ور، مبصر ندوہ کے مقاصد اور پیغام کی نشرواشاعت کے لئے سراپا اخلاص، جدوجہد وقربانی ایثار کی تابندہ مثال تھے۔

مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی، علامہ شبلی جیسے ممتاز عالم وادیب اور سید سلیمان ندوی جیسے بلند پایہ علمی رہنما، غلام محمد شملوی، مولوی عبدالغفور جیسے مخلص اور خاموش وانتھک کارکن ندوۃ العلماء کو نصیب ہوئے، مولانا سید عبدالحئی حسنی کے علاوہ نواب علی حسن خاں، مولانا خلیل الرحمن صاحب، ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب جیسے حضرات نے نظامت کے فرائض انجام دئے۔ اور بڑے نازک اور سنگین حالات میں اس سفینہ کو طوفان سے بچا کر لانے میں کامیاب ہوئے، اللہ تعالیٰ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی عمر میں برکت عطا فرمائے کہ ندوۃ العلماء کے لئے ان کی نظامت کا دور سب سے درخشاں، تابناک، اور فعال دور ہے۔

ندوۃ العلماء کے کارناموں پر ایک اجمالی نظر

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے قیام کا پہلا شاندار نتیجہ یہ نکلا کہ ہندستانی مسلمانوں کے مختلف گروہوں اور جماعتوں میں جو چپقلش اور چشمک تھی، اس میں بہت کمی ہو گئی، قدیم وجدید گروہوں کے درمیان جو خلیج تھی وہ دور ہو گئی، علامہ عبدالحئی حسنی، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی، مولانا عبدالباری ندوی وغیرہ کی جدید وقدیم دونوں حلقوں میں خوب پذیرائی ہوئی اور ان حضرات پر ہر طبقہ نے اعتماد کیا بلکہ اب تو ندویوں کو اعتدال وتوازن اور جدید وقدیم کا جامع تصور کیا جاتا ہے۔ اور دونوں حلقوں کا اعتماد ان کو حاصل ہے۔ ندوی فرزندوں نے میر کارواں حضرت سید سلیمان ندوی کی رہنمائی میں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی، اور اس ادارے کے ذریعہ مسلمانوں کی فکری، علمی، رہنمائی، اور ان کی ذہنی و دینی تربیت کا کام کیا۔

سیرت نبویؐ سیرت عائشہؓ۔ امام مالک، عربوں کی جہازرانی

عمر خیام، نقوش سلیمانی، عرب و ہند کے تعلقات، خطبات مدراس، رحمت عالم، ارض القرآن، المامون، الغزالی، شعرالعجم، شعرالہند، حکمائے اسلام، سیرۃ النعمان، الفاروق، علم کلام، سیرۃ الصحابہ والصحابیات کے موضوع پر گیارہ جلدوں میں ان حضرات کے سیرت کے کارنامے تابعین وتبع تابعین واہل کتاب اور صحابہ کی سیرت کے علاوہ خلفاء راشدین، خلفاء بنو امیہ، خلفاء بنی عباس کی تاریخ چار جلدوں میں، دولت عثمانیہ کی تاریخ دو جلدوں میں، اور حکومت صقلیہ کی تاریخ دو حصوں میں مرتب کرکے دارالمصنفین نے اسلامی کتب خانے میں گراں قدر اضافے کئے۔

آخری نصف صدی کا یہ دور بلاشبہ اسلامی دعوت وعزیمت اور فکر کے میدان میں ندوہ کا تجدیدی دور ہے جیسا کہ اس کے فرزندوں کی تصنیفی اور دعوتی اور تربیتی سرگرمیوں سے اندازہ ہوتا ہے۔

تاریخ دعوت وعزیمت کے طلائی سلسلہ نے اسلامی کتب خانے میں ایک نئے موضوع کا نہ صرف اضافہ بلکہ مسلمانوں کا اعتماد اسلامی تاریخ پر از سر نو بحال کیا اور یہ ثابت کیا کہ اسلام ایک ایسا سدا بہار درخت ہے جو ہر زمانہ میں برگ وبار لاتا رہا ہے اور لاتا رہے گا۔

مسلم ممالک میں اسلامیات ومغربیت کی کش مکش، اور ارکان اربعہ، نبی رحمت، المرتضیٰ تذکرہ وسوانح کی کتابوں نے جدید تعلیم یافتہ طبقے کے اندر اسلام پر اعتماد بحال کرنے اور ہر زمانہ میں قائدانہ کردار ادا کرنے کی بھرپور صلاحیت پر یقین پیدا کرنے کا اہم کارنامہ انجام دیا۔

یہاں پر ۱۹۵۰ء کے بعد سے اب تک کی ندوی تصنیفات کا تعارف اور جائزہ مقصود نہیں صرف اس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کی مطبوعات پر ایک نظر ڈالنے سے ہمارے اس دعوے کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

تصنیف وتالیف کے میدان میں نئے اسلوب اور عصری زبان میں لکھنے کے علاوہ ندوۃ العلماء نے اردو عربی، صحافت کے میدان میں بھی انقلابی انداز میں قدم ایسے وقت ۱۹۵۵ء میں رکھا، اور طاقت ور اسلامی صحافت کی بنیاد رکھی، جبکہ عالم عربی میں زبردست خلا تھا۔ ماہنامہ "البعث الاسلامی"، مولانا سید محمد الحسنی نے ۱۹۵۵ء میں جاری کیا جس نے اپنے طاقتور اداریوں اور بے لاگ تبصروں کی بدولت عالم عربی کے سب سے بڑے فتنے عرب قومیت کو رسوا کر دیا۔ عربوں کے دماغ سے اس فتنے کے مسموم اثرات کو زائل کرنے اور اسلام پر ان کا از سر نو اعتماد بحال کرنے میں "البعث الاسلامی" کے ساتھ پندرہ روزہ الرائد نے بنیادی کردار ادا کیا پہلے دور میں، الندوہ، الضیا، اور اس دور میں تعمیر حیات نے یہ کام اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔

نومبر ۱۹۷۵ء میں ندوۃ العلماء نے جو شاندار تعلیمی جشن منعقد کیا وہ ہندوستان ہی نہیں پورے عالم اسلام کا ممتاز ومنفرد اور تاریخی جشن کہلانے کا مستحق ہے۔ اس جشن میں عالم عربی واسلامی کے تقریباً تمام ہی ملکوں سے وفود شریک ہوئے تھے یہ جشن ایک طرح سے عالم اسلام کی طرف سے ندوہ کی فکری قیادت پر اتحاد کا اظہار تھا۔

□□

حواشی:

۱۔ روئداد ندوۃ العلماء سال اول

۲۔ سوانح قاسمی ص ۳۹۲

لکھنؤ کے تفریحی مشاغل

صفحہ ۱۶۱ کا بقیہ

ہے کہ ضرورت مند افراد کو کسی نہ کسی طرح فیض پہنچایا جاسکے اور ان کو کسی حد تک ایسا روزگار کا ایک بہانہ تھے اور ہزاروں لوگ اسی بہانے اپنا پیٹ پالتے تھے۔

وقت کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ لکھنؤ کے یہ تفریحی مشاغل بھی تقریب قریب ناپید ہو چکے ہیں۔ لے دے کے پتنگ بازی اور کبوتر بازی اور کچھ دوسری تفریحات بچی کھچی سانسیں لے رہی ہیں اور یہ بھی کب نظروں سے اوجھل ہو جائیں اس کا کوئی ٹھیک نہیں ہے کیونکہ مشینی دور اب کمپیوٹر اور الیکٹرانک کے عہد میں قدم رکھ چکا ہے۔ اب کس کو فرصت ہے جو مڑ کر یہ دیکھے کہ لکھنؤ اور اس کی تہذیب وتفریحی مشاغل کہاں گم ہو چکے ہیں۔

□□

ماخذ: آب حیات۔ محمد حسین آزاد۔ اٹھارھویں صدی میں ہندوستانی معاشرت۔ ڈاکٹر محمد عمر۔ تاریخ لکھنؤ۔ مولانا سید آغا مہدی۔ گذشتہ لکھنؤ۔ عبدالحلیم شرر۔

غزل

عرفان صدیقی
حیدری مرزا روڈ۔ لکھنؤ

عشق میاں، اس آگ میں میرا ظاہر ہی چمکا دینا
میرے بدن کی مٹی کو ذرا کُندن رنگ بنا دینا

آؤ تمھاری نذر کریں ہم ایک چراغ حکایت کا
جب تک جاگو روشن رکھنا نیند آئے تو بُجھا دینا

سینے کے ویرانے میں یہ خوشبو ایک کرامت ہے
ورنہ اتنا سہل نہیں تھا راکھ میں پھول کِھلا دینا

بیس اکیس برس پیچھے ہمیں کب تک ملتے رہنا ہے
دیکھو اب کی بار ملو تو دل کی بات بتا دینا

مولا! پھر مری بستی سے بِن برسے بادل لوٹ گئے
خیر، شکایت کوئی نہیں ہے اگلے برس برسا دینا

دل کی زمیں تک روشنیاں تھیں، چہرے تھے، ہریالی تھی
اب تو جہاں بھی ساحل پانا، کشتی کو ٹھہرا دینا

خواجہ خضر سنو! ہم کب سے اس بستی میں بھٹکتے ہیں
تم کو اگر تکلیف نہ ہو تو جنگل تک پہونچا دینا

اظہر مسعود

'ادبستان'، دین دیال روڈ

لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

لکھنؤ کے پھیری والے

اَوَدھ کے آخری تاجدار سلطان عالم واجد علی شاہ اختر کی معزولی کے تقریباً چار برس بعد ۱۸۶۰ء میں غالب نے اپنے ایک خط میں میر مہدی مجروح کو لکھا تھا:

"لکھنؤ کی آبادی میں فرق نہیں آیا۔ ریاست تو جاتی رہی باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں۔" [۱]

مذکورہ بالا خط میں جس لکھنؤ کی تعریف کی گئی ہے اب اس کے آثار بھی تقریباً مٹ چکے ہیں۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک لکھنؤ ہندوستان کے تہذیبی اور ثقافتی نقشے پر نمایاں نظر آتا تھا۔ اس کے بعد انحطاط کی رفتار بہت تیز ہو گئی یہاں تک کہ پانچویں دہائی کے اختتام پذیر ہوتے ہی صحبت یافتہ بزرگوں کے حافظے میں محض اس کی دھندلی سی تصویر باقی رہ گئی اور اب وہ بزرگ بھی نظر نہیں آتے۔

لکھنوی تہذیب کے عناصر ترکیبی میں شاعری اور موسیقی کا بہت اہم مقام تھا حتیٰ کہ یہاں کے آداب معاشرت اور نشست و برخاست کے طور طریقوں میں بھی ایک طرح کی موزونیت اور لے داری کا احساس ہوتا تھا۔ یہ صفات محض مخصوصین سے وابستہ نہیں تھیں جاہل عوام تک اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ محمد باقر شمس لکھتے ہیں:

"آج بھی لکھنؤ کے جہلا جس شاعرانہ انداز میں بات کرتے ہیں دوسری جگہ علما نہیں کر سکتے جب برسات میں جامن بیچنے والا اپنی مترنم آواز میں کہتا ہے۔ 'کالی گھٹا کے کالے پھلیندے' تو ہزاروں شعر نثار کر دینے کو جی چاہتا ہے۔ اگر گرمیوں میں برف کی قلفی بیچنے والے کا یہ کہنا 'یہ کس کی محبت میں گھل رہی ہے' اپنے اندر جذب و اثر کا ایک عالم رکھتا ہے (تو) گنڈیریوں والے کی آواز 'برف کی ڈلیاں کون لے گا؟' بلاغت کی جان ہے؟ اور گولر بیچنے والے کی صدا 'گولر کیا ہیں شہد کی کپیّاں ہیں' بیر بیچنے والے کی آواز 'پیوندی بیر ٹکے سیر' پان بیچنے والے کا یہ مصرعہ 'کرتی ہے سرخ رو وہ گلوری ہے پان کی' دماغ کی ادبی شاعرانہ شاخ کا پتہ دیتی ہے۔" [۲]

مندرجہ بالا اقتباس میں لکھنؤ کے کئی پھیری والوں کا ذکر آ گیا ہے اور یہ پھیری والے ہی ہمارے اس مضمون کا موضوع ہیں۔

لکھنؤ کے پھیری والوں کی صدائیں کسی موزوں مصرعے، فقرے نظم یا تک بندی کی شکل میں اور مترنم ہوا کرتی تھیں۔ حمد، نعت، منقبت وغیرہ سنا کر پیسے مانگتے پھرنے والے بالعموم بہت خوش گلو ہوتے تھے شرر کا بیان ہے۔

"بازاری لوگ اور عموماً لڑکے جو سڑکوں اور گزرگاہوں میں گاتے پھرتے ہیں وہ بھی مختلف چیزوں کو ایسے سچے سُروں میں ادا کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے راگنی اور لے گلے میں اتری ہوئی ہے ...... لے داری یہاں کے بچے بچے کے رگ و پے میں سرایت کر گئی ہے۔" [۳]

پھیری والے گھروں پر عموماً صبح کے وقت یا سہ پہر کو مغرب سے قبل سے آتے تھے۔ دوپہر یا رات میں آنے سے گریز کیا جاتا تھا۔ اس طرح اوقات کی پابندی میں غالباً یہ مصلحت پوشیدہ تھی کہ صاحب خانہ کے آرام میں خلل نہ پڑے۔

کچھ پھیری والوں کے اوقات بھی مخصوص تھے۔ مثلاً دودھ، دہی، بالائی وغیرہ بیچنے والے ہمیشہ صبح کے وقت اور قلفی، چاٹ، مٹھائی، بسکٹ وغیرہ بیچنے والے سہ پہر کو آتے تھے۔ پھیری والوں کے ذیل میں حسبِ ضرورت ان کے اوقات بھی بنا دئے گئے تھے۔

نفسِ موضوع پر آنے سے پہلے اس بات کی وضاحت بھی کر دی جائے کہ ایسا نہیں ہے کہ اب پھیری والے نہیں رہے البتہ اگلے سے رکھ رکھاؤ، شائستگی، سلیقے اور نفاست کا فقدان ہے۔ اقتضائے حال نے سودا رکھنے کے ظروف بھی بدل دئے ہیں اور صدائیں بھی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اب شاذ و نادر ہی کوئی پھیری والا گھر کے دروازے پر آواز لگاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اگلے وقتوں میں شرفا گھر کے باہر وہ بھی سرِراہ کچھ کھانا تو درکنار گھر کے اندر بھی کھانے کے لیے مخصوص جگہ کے سوا کہیں اور کچھ نہیں کھاتے تھے۔ خواتین گھر میں ہی رہتیں۔ ایسی کوئی ضرورت درپیش ہوتی تو سات پردوں کے اندر گھر سے نکلتیں اور لوٹ کر سیدھی گھر آتیں۔ یہی سبب ہے کہ کنجڑنیں، گدنیں، سنہارنیں، کمہارنیں، رنگریزنیں، دھوبنیں وغیرہ گھر گھر جاتی تھیں اب نہ وہ تہذیب ہے نہ وہ تکلفات، نہ وہ نشست و برخاست کے انداز، نہ وہ خورد و نوش کے آداب، نہ وہ باکمال، نہ وہ قدردان کہ جن سے کمالِ فن کی داد حاصل کرنے بلادِ غیر سے بھی لوگ آتے تھے۔ اب تو زندگی مجسم بازار ہو کر رہ گئی ہے جہاں ہر طرح کا مال بکتا اور خریدا جاتا ہے۔

لکھنؤ میں بعض کھانے کی چیزوں کو ان کے نام کے بجائے محض ان کی صفت بیان کر کے بیچا جاتا تھا۔ مثلاً کڑوے و کرارے، کی آواز سنئے تو سمجھ لیجئے کہ سلو نے سیو والا ہے۔ مزے لو بادام کے سے مراد مونگ پھلی ہے۔ ایک خاص لحن میں آواز سنائی دے، آٹھ آنے سیر لیو جلیبہ، کے معنی ہیں شکرقند بیچی جا رہی ہے۔ کیا بڑھے ہیں کا مطلب ہے امرود۔ لیلیٰ کی انگلیاں ہیں مجنوں کی پسلیاں ہیں، یعنی پتلی پتلی لچھے دار ککڑیاں ہیں۔

سید حسن نام کا ایک پھیری والا تیل کے لڈو یوں بیچتا تھا: کل پھُس پھُسے تھے آج کرارے ہیں میاں!

لیلیٰ کی انگلیوں اور مجنوں کی پسلیوں پر ایک لطیفہ بھی سُن لیجئے۔

ایک دفعہ الہ آباد کے محلہ بہرہ منڈی میں ڈاکٹر مسیح الزماں مرحوم کے یہاں میرا قیام تھا۔ سہ پہر کے وقت نہایت بھونڈی آواز سنائی دی لیلیٰ کی انگلیاں ہیں مجنوں کی پسلیاں ہیں، لکھنؤ کی اس صدا کا دیہاتی کرن پہلی بار سنا تھا جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک پھیری والا موٹے موٹے لکڑے بیچ رہا ہے۔ میں نے سوچا کہ واقعی اگر لیلیٰ مجنوں اس تن و توش کے مالک تھے تو اردو کے ہزاروں اشعار کی صحت مشکوک قرار پائے گی۔

کچھ اشیائے خورد و نوش کسی دوسری چیز سے تشبیہہ دے کر بیچی جاتی تھیں۔ آج بھی یہ آواز برابر سنائی دیتی ہے۔ مزہ سیب کا ہو۔ امرود میں، یا بقول سرور "مزہ انگور کا ہے رنگتروں میں،،"[۴]

مقامات سے بھی نسبت دے کر پھیری والے آواز لگاتے تھے جیسے الہ آباد کے امرود ہیں، خربوزے شہد پور کے ہیں، کانپوری کیلے ہیں انگور چمن والے ہیں، سہارنپوری پونڈے ہیں، جونپوری تربوز ہیں۔ سیب کہیں کا بھی ہو۔ کشمیر کی نسبت سے بیچا جاتا تھا۔ پیٹھے کی مٹھائی اور موتی چور کے لڈو آج بھی سندیلے اور آگرے کی نسبت سے فروخت ہوتے ہیں۔ چارباغ ریلوے اسٹیشن پر سندیلے کے لڈو، لکھنؤ کی ریوڑی اور بنارس کے چوبی کھلونے کے لیے پھیری والے ٹرین کے ساتھ آواز لگاتے پھرا کرتے تھے۔

کھانے کا کچا اور پکا دونوں طرح کا سامان لے کر پھیری والے نکلتے تھے۔ مچھلی والے دروازے دروازے آواز لگاتے گھومتے، "تازہ رہو ہے پڑھن مچھلی، والد مرحوم مسعود حسن رضوی ادیب سے ایک مچھلی والے نے بتایا کہ اس نے پورے ملک کی مچھلی کھائی ہے مگر جو مزہ گومتی کی مچھلی میں ہے اور کہیں نہیں۔ صبح سویرے ہی مچھلی والے بہنگی لیکر پھیری پر نکلتے تھے۔ آج مچھلی بازار میں رہو، نور، موہ، پڑھن بہا شیر، گرئی، بام غرض جو سی مچھلی چاہیے مل جائے گی۔ کیونکہ نقل و حمل کے ذرائع اتنے ہو گئے ہیں کہ ملک کے کونے کونے سے قیصر باغ کی منڈی میں مچھلی آ جاتی ہے جب یہ ذرائع مفقود یا بے انتہا محدود تھے تو مچھیرے گومتی میں رات بھر جال ڈالتے اور جو مچھلیاں ہاتھ لگتیں انھیں لے کر منہ اندھیرے نکل کھڑے ہوتے۔

گوشت والے جھانکڑ کی بالکل مچھلی ڈلیا میں گوشت بیچنے اٹھتے

تھے۔ یہ لوگ عموماً بڑے جانور کی کلیجی، پھیپھڑا، دل، گردہ بھیجا وغیرہ بیچتے تھے۔

ترکاری والے ڈیوڑھی پر آتے اور ترکاری والیاں عموماً گھروں کے اندر جاکر سامان بیچتی تھیں اب ترکاری والیوں نے آنا بند کر دیا ہے۔ مگر ترکاری والے اب بھی چوپہیا ٹھیلے آراستہ کر کے سڑکوں اور گلیوں میں آواز لگاتے پھرتے ہیں۔

خشک مسالے اور میوے والے بھی گھر گھر جایا کرتے تھے۔ "کلّے پائے والا، ٹِکیں گرم، کباب کلیجی کے، پلاؤ گرم" ابھی کل کی صدائیں معلوم ہوتی ہیں۔ چاٹ والے بھی اپنا خوانچہ سر پر اٹھائے سہ پہر کے وقت آجایا کرتے تھے۔ چاٹ آج بھی ملتی ہے مگر خوانچوں والوں کا رواج اور گھر گھر جانے کا دستور ختم پر ہے۔ اگلے وقتوں میں چاٹ میں ایک چیز، لونگ چڑا بھی ہوتی تھی یہ املی کے پنے میں بھیگی ہوئی چھوٹی چھوٹی پتلی پتلی ٹکیاں ہوتی تھیں غالباً بیسن سے بنائی جاتی تھیں۔ اب اس کا نام جاننے والے بھی مشکل سے ملیں گے۔

سردیوں میں گرما گرم چائے سماور میں اور کاغذی سموسے بانس کی ٹوکری میں لے کر پھیری والے نکلا کرتے تھے۔ کشمیری چائے کی تین صفتیں خاص بیان کی جاتی ہیں۔ لب سوز، لب دوز اور لب ریز۔

دودھ دہی اور دیسی گھی والے بھی گھروں پر جاتے تھے۔ دیسی گھی عام طور پر گدنیں گھروں کے اندر لے کر آتی تھیں اگر گھی کے خالص پن میں شک ظاہر کیا جاتا تو فوراً قسمیں کھانا شروع کر دیتیں۔ آنکھن کسم (آنکھوں کی قسم)، بچن کسم (بچوں کی قسم)، بالکل نکھالس (بالکل خالص) ہے۔

دودھ، دہی، بالائی اور نمش والے ہی گرمیوں میں برف کی قلفیاں بھی لے کر آتے تھے۔ شورہ ملی، برف میں جمی، مخروطی وضع کی خوب کھپے ہوئے دودھ کی جمائی گئی قلفیاں بڑی ذائقہ دار اور فرحت بخش ہوتی تھیں کچھ لوگ لیموں اور فالسے کی قلفیاں بھی جماتے تھے۔ مٹی کے ظروف میں بھی قلفیاں جمائی جاتی تھیں یہ اسپشل کوالٹی کی ہوتی تھیں۔ ان میں مال بھی زیادہ ہوتا تھا۔ اور انھیں عرفِ عام میں قلفہ کہا جاتا تھا۔ قفلی والے ہمیشہ عصر اور مغرب کے بیچ میں آتے تھے۔ لکھنؤ کی قفلی کے بارے میں سرور کا بیان بھی دیکھیے۔

"دو پیسے کو برف جمی، دو کھائے، بدن تھرائے، زیادہ ہو کا کرے لقوے فالج میں مرے"۔[۵]

گنے کی گنڈیریاں بھی پھیری والے کبھی بہنگی میں اور کبھی جھابکڑ کی چھچھلی ڈلیا میں لے کر نکلتے تھے۔ نفاست سے چھلی ہوئی، برابر سے کٹی ہوئی اور سلیقے سے چنی ہوئی گنڈیریوں کو چاندی کے ورق اور گلاب کے پھولوں سے سجایا اور بسایا جاتا تھا۔

سالم گنا بھی بکتا تھا مگر اب پہلے جیسا خوش رنگ، موٹا، نرم اور رسیلا گنا بازار میں نہیں آتا جس کے بارے میں سرور لکھتے ہیں۔

"نبی کا پونڈا، نرم گندہ، قند و شہد کا سینچا۔ اگر پوپلا بھی مسوڑھوں سے چبائے شربت کا گھونٹ حلق سے اتر جائے"۔

سالم گنے کی بات چلی ہے تو ذرا شرر کا بیان بھی دیکھتے چلیے۔

"ایک کنجڑا چوک میں پونڈے بیچ رہا تھا۔ صدا یہ تھی کہ "ارے بھئی یہ کنکوے کون لوٹے گا؟" کیا اس سے بھی زیادہ بامذاق کوئی استعارہ ہو سکتا ہے ...... نہ پونڈے کا نام لیا نہ گنّے کا جس سے کنکوے لوٹے جاتے ہیں صرف اتنا کہہ کے کہ "کنکوے کون لوٹے گا" یہ بتا دیا کہ پونڈے لگّوں کے برابر ہیں"۔[۶]

مرزا جعفر حسین مرحوم لکھتے ہیں:

"اس ترانے میں اتنی کشش تھی کہ مولانائے محترم (شرر) اپنے کمرے سے ...... بے تابانہ ننگے پاؤں باہر آگئے اور کچھ قدم سڑک پر اسی گنے والے کے ہمراہ نکل گئے"۔[۷]

سید صاحب بسکٹ والے بڑے سے ٹین کے بکس میں بسکٹ لاتے تھے۔ ان کے بکس کے اندر ایک کشتی بھی لگی تھی جس میں پیسٹری، نان خطائی، کریم رول وغیرہ سلیقے سے چنے ہوتے اور کشتی کے نیچے بکس کے گہرے حصّہ میں گولا بتاسے رکھتے۔ تھے تو مسلمان مگر وضع قطع ہندوؤں جیسی تھی۔ دھوتی کرتے میں ملبوس رہتے۔ پھنسی پھنسی آواز میں خستہ بسکٹ کی صدا لگاتے گھروں پر جایا کرتے تھے۔ پڑھے لکھے تو غالباً بالکل نہیں تھے مگر گفتگو اچھی مگر جوش میں بھر کر کیا کرتے تھے خود زندگی بھر پھیری لگائی لیکن اولاد کو اعلا تعلیم دلائی۔ بگڑی سیکھے ہوئے تھے

فن سپہ گری کا کوئی قدر دان مل جاتا تو بسکٹوں کا بکس رکھ کر لاٹھی کے ہاتھ دکھانے لگتے۔ دو ایک پینترے مجھے بھی بتائے تھے۔

پاپڑ ہندو حضرات کے کھانے کا ایک خاص جزو ہے لیکن مسلمانوں میں اس کی طرف کوئی خاص رغبت نہیں پائی جاتی ہے شاید اسی وجہ سے پاپڑ بیچنے والوں میں مسلمان خال خال ہی نظر آتے تھے۔ ان میں ایک طاہر صاحب بھی ہوا کرتے تھے۔ نہایت سیدھے شریف اور نرم گفتار انسان تھے۔ علی گڑھ کاٹ کا پاجامہ اور کرتا پہنتے۔ کبھی برہنہ سر دکھائی نہیں دیتے۔ سر پر ٹوپی ہمیشہ ہوتی۔ لونگ اور ماش کے چھوٹے چھوٹے تلے ہوئے پاپڑ اور پاپڑ کے چٹ پٹے چورے کی پڑیاں بیچتے تھے۔ پڑیاں کندھے سے لٹکے ہوئے تھیلے میں ہوتیں اور پاپڑ ہتھے دار بانس کی ٹوکری میں۔ اردو میں خوشخط "طاہر پاپڑ والا" لکھا ہوا ایک موٹا کاغذ ٹوکری پر چسپاں رہتا۔ یہ گویا اس چلتی پھرتی دکان کا سائن بورڈ تھا۔ بڑی شائستگی کے ساتھ آواز بھی یہی لگاتے "طاہر پاپڑ والا"۔

شیشے کے صندوق نما شوکیش میں بنگالی مٹھائی بیچنے والے بھی دروازے دروازے جاتے تھے رس گلے اور چم چم ملائی ان کی خاص مٹھائیاں ہوتی تھیں۔ یہ لوگ مٹھائی کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے ایک خاص طرح کی چمٹی سے پکڑ کر نکالتے تھے اور ڈھاک کے تازہ پتے کے دونے میں دیتے تھے۔

بنگالی مٹھائی کی طرح شیشے کے شوکیس میں ہی فینسی قسم کے بسکٹ بیچنے کا رواج بھی تھا مگر ان کا شوکیس مستطیل کے بجائے ہشت پہل ہوتا تھا۔ یہ لوگ اپنا شوکیش زمین پر کبھی نہیں رکھتے تھے۔ سودا دینا ہوتا تو پہلے بغل میں دبے ہوئے ڈھائی تین فٹ اونچے بید کے اسٹینڈ کو زمین پر رکھتے پھر اس پر اپنا شوکیش ٹکاتے۔

چنا جور گرم والے مزے دار چٹپٹے چنوں کے علاوہ اپنے آواز لگانے کے مخصوص انداز کی بدولت بھی خاصے مقبول تھے۔ ایک آدمی بڑی تیز اور باریک آواز میں ایک ایک لفظ کو کھینچ کر صدا لگاتا۔ آئی چنے کی بہار، میرا چنا ذائقہ دار۔ ایک دوسرا پھیری والا مخصوص لحن میں اس طرح تک بندی کرتا:

میرا چنا بنا ہے اعلا — اس میں پڑا ہے گرم مسالہ
جس کو کھائیں نند کے لالہ — جس کو کھائے بوڑھا بالا
جس کو کھائے افسر اعلا — چنا جور گرم

یہ چنے والا حامد ڈاکو کی منظوم کتھا بھی سنایا کرتا تھا۔

ایک پھیری والا آلو کے بھنے بھٹے بھی لایا کرتا تھا۔ ان بھٹوں کا ذائقہ کوئلوں پر بھنے بھٹوں سے بالکل الگ ہوتا تھا۔ وہ بھٹوں کو گرم رکھنے کے لیے انھیں روئی کے گدے میں لپیٹے رہتا تھا۔

ایک شخص حلوا پراٹھا بیچتا تھا۔ پیتل کے تسلے میں تر تراتا ہوا روے کا حلوا اور رنگ بھگ تین فٹ قطر کا پرت دار پراٹھا۔ پورا پراٹھا کھانا کسی معتدل انسان کے بس کی بات نہیں تھی تول کر بکتا تھا۔ اور چار آنے میں سیری ہو جایا کرتی تھی۔

ایک پھیری والے تمام دنوں میں کھویا پٹی، سلونے سیو، تل کے لڈو، گزک، پھپے والی پٹری وغیرہ کا خوانچہ لگاتے اور عشرۂ محرم کے دوران مجلس کا تبرک مثلاً نکین، نکتیاں، نمک پارے، الائچی دانے شکر پارے، اندرسے کی گولیاں وغیرہ بیچتے۔ بارہ محرم کو امام کے تیجے کے دن پھولوں کے پیالے جن میں سوگ بڑھانے کی اشیا ہوتی تھیں اور چھوٹے بڑے الائچی دانے اور میٹھی کھیلیں لیکر آتے تھے۔ بڑی نرم اور دل آویز گفتگو کرتے تھے۔ انھوں نے بعد میں پھیری لگانا بند کر کے آری زردوزی کا کارخانہ کھول لیا تھا۔

کڑکڑاتے جاڑوں میں تاروں کی چھاؤں تلے دودھ کو متھ کر نمش بنائی جاتی ہو۔ ایک زمانے میں جھین کی شکل میں اس مٹھائی پر پستے، بادام کی ہوائیاں بھی نظر آتی تھیں۔ نمش والے صبح تڑکے پھیری پر نکلتے تھے۔ بڑے سے پیتل کے تھال میں نمش کا کونڈا کسی کپڑے یا سینی سے ڈھکا ہوا رکھا ہوتا اور تھال کے تین طرف پرانے روپے کے سکے سے لیکر ہتھیلی کے برابر تک کی کوری سکوریاں اور پیالے رکھے ہوتے نمش کو ایک زمانے میں نان تنکی سے کھایا جاتا تھا۹ھ صبح کے وقت اکثر نمش والوں کی پرکشش آواز ملائی مکھن ہے! سے آنکھ کھلتی تھی۔

بالائی والے بھی صبحدم آتے تھے مگر نمش والوں کے بعد ان کا پھیرا ہوتا۔ اس بالائی کی غربال نما اوپری پرت اتنی خشک ہوتی تھی کہ ہاتھ لگائیے تو بجز چکنائی کے ذرا سی بھی نمی ہاتھ میں نہیں چھوٹتی تھی جس بالائی

میں سے دودھ چھوٹتا ہوا سے اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ لکھنؤ کی بالائی کے لئے رجب علی بیگ سرور لکھتے ہیں:

" بے قند و شکر خدا کر چھری سے کاٹی اور کھائی "

اور شرر لکھتے ہیں کہ:

"بالائی کی تہوں کو نفاست اور خوش نمائی سے جمانا ایسا کام ہے جو لکھنؤ کے سوا شاذ و نادر ہی کسی شہر کے لوگوں کو آتا ہوگا۔"

ایک بالائی والے نے ناپ تول کا جھنجھٹ ہٹانے کے لیے مٹی کے کورے پیالوں میں چھٹانک چھٹانک بھر بالائی رکھ کر بیچنا شروع کی۔ اس کی بالائی اوپر سے بہت خشک، اندر سے خوب چکنی اور خوش ذائقہ ہوتی تھی۔ بالائی کے پیالے ہیں کی پاٹ دار آواز کے ساتھ ہی گھروں کے دروازے کھل جاتے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا خوانچہ خالی ہو جاتا۔

افغانستان کے لوگ خشک میوے، ہینگ، سلاجیت اور شیر کی چربی لے کر سردیوں کے موسم میں آتے تھے اور سال بھر کی روزی روٹی کا حساب کر کے واپس اپنے ملک چلے جاتے تھے۔ کچھ لوگ سود پر روپیہ بھی چلاتے تھے۔

کچھ پھیری والے جگہ جگہ رک کر پہلے اپنے چاروں طرف مجمع اکٹھا کرتے اس کے بعد اپنے مال کی تشہیر کرتے۔ ایسے ہی ایک دانت کا منجن بیچنے والے تھے جو اپنی چرب زبانی کے علاوہ اپنی ہیئت کذائی سے بھی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا کرتے تھے۔ کبھی دانتوں کے سرجن کا بھیس بدلے ہیں۔ کبھی یونان کے قدیم فوجی لباس میں سکندر اعظم کا بھروپ بنائے ہوئے ہیں۔ بڑے وجیہہ اور تندرست تھے۔ اس لیے ہر روپ ان کے اوپر کھپتا تھا۔ ان کے دانت بالکل برابر کے، سڈول اور موتیوں جیسے چمکدار تھے۔ بارہ تیرہ برس کا ایک لڑکا بھی ان کے اسسٹنٹ کے طور پر ساتھ رہتا تھا۔

ایک اور منجن والے تھے یہ اپنے دانتوں کی مضبوطی دکھانے کے لیے تانبے کے سکّے کو دانت سے پکڑ کر دوہرا کر دیا کرتے تھے۔ بغیر تکلیف اور اوزار کے دانت اکھاڑتے بھی انھیں دیکھا وہ انگوچھے کے کونے پر کچھ پڑھ کر دم کرتے پھر وہی کونا دانت سے مس کر کے الگ ہٹ جاتے دانت اپنی جڑیں خود بخود چھوڑ دیتا اور درد میں مبتلا شخص اپنی ہی چٹکی سے دانت کو گویا مسوڑھے پر سے اٹھا لیتا۔ اس میں حقیقت کہاں تک ہے واللہ اعلم۔ لیکن کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ایسا ہو سکتا ہے۔

ایک صاحب تھے جو لال مرہم بیچا کرتے تھے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ پہلے تو پولیس انسپکٹر تھے۔ وضع قطع اور چہرے مہرے سے لگتے بھی تھے۔ تیز سے تیز درد ہو مرہم کی ایک انگلی لگانے سے اڑنچھو ہو جایا کرتا تھا۔ خیال تھا کہ چارہ گری کرانے والے انھیں کے گرگے ہوتے تھے جو ان کا مرہم لگتے ہی ہشاش بشاش لگنے لگتے تھے مگر اب کو دیکھتے ہیں منٹوں میں درد کا رفع ہو جانا بڑی معمولی بات معلوم ہوتی ہے۔

بانو شاہ کا سُرمہ بیچنے والے بھی اسی طرح بھیڑ لگا کر کاروبار کیا کرتے تھے نخاس کی طرف اتوار کی بازار میں ضرور آتے تھے یہ دو ننگ دھڑنگ آدمی تھے جو، کوئی بھی موسم ہو لباس کے نام پر صرف ایک سیاہ رنگ کی لنگوٹی باندھے رہتے تھے۔ یہ لوگ بانس کے ڈنڈوں کے سہارے ایک پوسٹر ٹانگ دیتے جس پر سرمے کے خواص لکھے ہوتے اور بانو شاہ کی روغنی رنگ سے ایک تصویر بنی ہوتی، خود بانو شاہ بھی لمبی کاکلوں اور ریش دراز کے ساتھ ایک لنگوٹی کسے مگدر کاندھے پر رکھے نظر آتے تھے۔ یہ دونوں لنگوٹ بند سرمے والے پاٹ دار آواز میں مخصوص دھن سے ایک نظم پڑھتے جاتے اور راہ گیروں کو ہاتھ کے اشارے سے پاس بلا کر ایک ہی سلائی سے سب کے سرمہ لگاتے اور ہاتھ میں دبے ہوئے کثیف رومال سے آنسو خشک کرتے جاتے۔ ان کی نظم کی یہ تین لائنیں یاد رہ گئی ہیں۔

لگا لو پیاری آنکھوں میں یہ بانو شاہ کا سُرمہ
نہ لگتا ہے نہ جلتا ہے کرے آنکھوں کو یہ ٹھنڈا
عجب تاثیر لاتا ہے یہ بانو شاہ کا سُرمہ

ایک چوبے جی ہوا کرتے تھے۔ یہ قوت مردی کی دوا بیچتے تھے یہ اپنے ساتھ پٹاریوں اور تھیلیوں میں بند درجنوں قسم کے سانپ بھی رکھتے تھے اور ہر سانپ سے وابستہ کوئی نہ کوئی قصہ بھی بیان کرتے تھے۔ چٹکلے بھی سناتے جو ان کی دوا کی مناسبت سے ہی ہوتے اور

جنھیں مہذب محفل میں نقل نہیں کیا جا سکتا۔ مجمع بڑی دلچسپی اور انہماک سے ان کی باتیں سنتا۔ بیچ بیچ میں لوگوں کو خبردار بھی کرتے رہتے۔ بھائیو جیب پاکٹ سے ہوشیار۔ دنیا میں بڑا اٹھا کلاکار پڑا ہوا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ بٹوے کو ہلکا کر دے۔ ان کے پاس بچھو بھی تھے۔ پانچ پانچ چھ چھ انچ لمبے اور بالکل سیاہ۔ کہتے تھے کالے ناگ کا ڈسا جیسے اس کا کاٹا پانی نہ پیئے۔ کبھی کبھی چھیڑ خانی کے لیے سانپ کو زمین پر چھوڑ دیتے وہ مجمع کی طرف جانے لگتا تو ایک کھلبلی مچ جاتی۔ اس سے پہلے کہ لوگ بھاگ کھڑے ہوں یہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ہی پتلی سی چھڑی سے اسے اس طرح اٹھا لیتے جیسے سانپ نہ ہو کپڑے کا ازار بند ہو۔

بزاز اور بچکہ، گوٹا کناری والے لوگ بھی گھروں پر آتے اور آواز لگاتے۔ ان میں سے بعضوں کی تو خاصی بڑی دوکانیں چوک میں تھیں بزاز کپڑوں کے تھان کو مارکین کی چادر میں باندھ کر کندھے سے اس طرح لٹکاتے کہ سارا وزن کولہوں اور کمر پر آجاتا۔ یہ لوگ جھکے جھکے لوہے یا لکڑی کا گز زمین پر ٹیک ٹیک کر چلا کرتے تھے۔ کچھ بزاز کپڑے کا گٹھر اٹھانے کے لیے مزدور بھی کر لیا کرتے تھے۔

ایک زمانے میں سرحد پار سے چینی تاجر اپنے یہاں کی مصنوعات لے کر یہاں آتے اور پھیری پر نکلتے۔ صاحبانِ استعداد سے انھیں اپنے مال کی اچھی قیمت ملتی۔ چینی کارچوبی ریشمی کپڑا خصوصاً ساٹن اور کڑھائی کا کام بہت نفیس ہوتا تھا۔ یہ لوگ ہاتھ کی بنی تصویریں بھی لاتے تھے جو قلم کی باریکی اور رنگوں کے امتزاج و تناسب کے اعلا شعور کی گواہی دیتی تھیں۔ یہ لوگ ہندوستانی اور انگریزی کو مخلوط کر کے عجیب و غریب زبان بولتے تھے۔ مثال کے طور پر اگر یہ کہنا ہے کہ، ”یہ کپڑا دھوئے دھوئے دبیز ہوتا ہے“ تو کہتے ”یہ کپرا واشے واشے تھک اوتا اے“

دھات اور شیشے، چینی کے برتن بھی پھیری والے گھروں پر لاتے تھے۔ کچھ عورتیں صرف کامدار پرانے کپڑے کے بدلے میں برتن دیتی تھیں۔ آج کی طرح پہلے جھوٹا پھکا پٹھا تو ہوتا نہیں تھا۔ کامدانی زردوزی، سلمی، ستارہ، کرن، نقشی، جوا، مُرمرا، زربفت، جامہ وار جو چیز بھی تھی اس میں سونا یا چاندی ضرور ہوتی تھی۔

پھیری والوں میں ایک قسم لال سوداگروں کی ہوا کرتی تھی یہ لوگ ایسی چیزیں بیچا کرتے تھے جن میں کوئی باہمی ربط نظر نہ آتا ہو۔ ایک لال سوداگر کو میں نے بھی دیکھا ہے وہ شاید آخری لال سوداگر تھے۔ مرحوم نہایت کڑوے بڑے میاں تھے۔ آج سے کوئی تیس برس پہلے کمر خم کھا کر تقریباً دوہری ہو چکی تھی۔ وضع قطع ثقات جیسی۔ سن سفید پٹے روئی کا گالا جیسی داڑھی، نورانی چہرہ، صاف رنگت مگر تیور ہمیشہ کسیلے سڑک کے آوارہ گرد لڑکے انھیں چھیڑا کرتے۔ یہ بھی سمجھتے تھے کہ کیوں چھیڑ رہے ہیں۔ لہذا جواباً ان کی ماں بہنوں تک کو نواز کر رکھ دیتے۔

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب　　گالیاں کھاکے بے مزہ نہ ہوا

وہ تو کب کے اپنا اسباب لٹا کر راہِ عدم کے سفری ہوئے مگر ان کی آواز آج تک کانوں میں گونجتی ہوئی معلوم ہوتی ہے ”ہوادار پنکھے، فریدآباد کی مہندی، نوحے ماتم کی بیاضیں!“

حواشی:

۱۔ غالب کے خطوط (جلد دوم) مرتبہ خلیق انجم طبع ۱۹۸۵ ص ۵۲۳/۵۲۴

۲۔ لکھنؤ کی زبان۔ طبع ۱۹۶۹ ص ۴۶

۳۔ گزشتہ لکھنؤ۔ مرتبہ شمیم انہونوی طبع ۱۹۶۵ ص ۱۹۸

۴۔ فسانۂ عجائب۔ مرتبہ رشید حسن خاں۔ متن ص ۷

۵۔ ایضاً　　۶۔ فسانۂ عجائب متن ص ۹

۷۔ گزشتہ لکھنؤ　طبع قدیم ناقص الاول ص ۹۹

۸۔ بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب اپنے تہذیبی پس منظر میں طبع ۱۹۷۸ ص ۱

۹۔ قدیم ہنر و ہنرمندانِ اودھ۔ از سید اسرار حسین خاں ۱۹۳۶ ص ۱۴۸

۱۰۔ فسانۂ عجائب مرتبہ رشید حسن خاں متن ص ۹

۱۱۔ گزشتہ لکھنؤ مرتبہ شمیم انہونوی طبع ۱۹۶۵ ص ۲۵۱

دانش لکھنوی
۳۲۷/۱۲۴ انیس ہاؤس، چوک
لکھنؤ

خوشنویسانِ اودھ ▫ احوال و آثار

جو ہاتھ تھام کے لکھیے تو کتبہ ہو خورشید   شبیہہ برق کھینچے گر چلے شتاب قلم

مغلیہ دورِ حکومت سے عروجِ سلطنتِ اودھ تک مختلف بادشاہوں کے زمانے میں ماہرینِ فن جمع ہوتے رہے۔ ان میں فن خوش نویسی کے ممتاز افراد بھی تھے جو یہاں باعزت زندگی گزار رہے تھے۔ انھیں آصف الدولہ کے سے سخی، معتمد الدولہ آغا میر سے فیاض، جانِ عالم مرزا واجد علی شاہ اختر جیسے جوہر شناس اور حوصلہ مند بادشاہ نصیب ہوئے جنھوں نے بیک وقت مختلف فنوں کے ماہروں کو یکجا کر دیا تھا۔

واجد علی شاہ کے دور میں خوشنویسوں کو جواہر رقم خاں، یاقوت رقم خاں، گوہر رقم خاں، میر بندہ علی، مرتعش رقم، حامد علی مرصع رقم جیسے خطابات سے نوازا گیا۔ اس عہد میں بیضاوی لکھنے والے الگ، آفتابی لکھنے والے الگ تھے۔ مطبع سلطانی کی چھپی اور قلمی کتابوں میں ان کے قلم کی معجز نمائیاں آج بھی موجود ہیں۔ بادشاہ کے علاوہ امرا و روٗسا نے بھی اس فن کے جاننے والوں کی قدر دانیاں کیں۔ نواب آغا علی خاں المعروف بہ آغائی صاحب (ناظم سلطان پور) کی فیاضیاں اور سرپرستیاں فنکاروں کے شامل حال رہیں۔

ان تمام صاحبِ کمال افراد کے مورثِ اعلیٰ عہد شجاع الدولہ میں محمد خلیل تھے جن کے بارے میں اب تک تحقیق نہ ہو سکی کہ وہ اس فن میں کس کے شاگرد تھے۔ خلیل بیک وقت اٹھارہ خطوں پر عبور رکھتے تھے اور خدا نے انھیں وہ قدرت عطا کی تھی کہ جب وہ میر علی، میر عماد، حدّاد اور یاقوت رقم خاں کا خط دیکھتے تو اس کی نقل اس طرح فرماتے کہ بانظر ماہرینِ فن بھی اصل اور نقل میں تمیز کرنے سے قاصر رہ جاتے تھے۔

محمد خلیل کے بعد اگر کسی کا ذکر ملتا ہے تو وہ آقا عبدالرشید تھے جو شاہجہاں کے عہد میں ہندوستان آئے اور اپنے لازوال فن کی بدولت مشہور و مقبول ہوئے۔ صاحب "صحیفۂ خوشنویساں" مولوی احترام الدین شاغل عثمانی نے آقا عبدالرشید کو میر عماد الحسن "عماد الحسنی" (اوّل) کا بھانجہ اور شاگردِ سعید تحریر کیا ہے۔

آقا عبدالرشید کے شاگرد قاضی نعمت اللہ لاہوری شہزادوں کی اصلاح پر معین تھے اور حافظ نوراللہ درباری ضروریات کو پورا کرتے تھے۔ اس زمانے میں تصویروں میں سنہری بیلیں بنانے کا رواج تھا۔ چنانچہ عہدِ آصفی کی بعض تصاویر میں متذکرہ ماہرینِ فن کی قلم کاریاں موجود ہیں۔ حافظ نوراللہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر مسجد آصفی کے کنوئیں کی جگت اور مسجد کی روکار پر بہ صورت قطعات اب بھی موجود ہے۔ تحسین علی خاں کی مسجد واقع چوک لکھنؤ کا قطعۂ تاریخ بھی نوراللہ نے لکھا ہے۔ اودھ میں عبدالرشید دیلمی کے کئی شاگرد تھے مگر خصوصیت سے میر عماد الحسن "عماد الحسنی" (دوم) نے بڑا نام پیدا کیا۔ میر عماد عہد محمد شاہ میں ہندوستان آئے اور لاتعداد شاگرد بنائے جو ہندوستان کے مختلف صوبوں میں پھیل گئے۔ ان کے نامور شاگردوں میں حافظ نوراللہ، قاضی نعمت اللہ اور عباد اللہ بیگ اودھ کے حصے میں آئے۔

حافظ نوراللہ کے شاگردوں میں میاں وجیہ الدین، محمد عباس، بال چند، سید احمد طباطبائی، حافظ ابراہیم، سرب سکھ لال دیوانہ، عبدالستار سندیلوی، محمد میرزا انسؔ، حسین میرزا عشق نے بڑا نام پیدا کیا۔ میر عشقؔ کے ہاتھ کا لکھا ہوا طویل قطعۂ تاریخ آصف الدولہ کی قبر کے سرہانے آویزاں ہے۔ اسی طرح حافظ ابراہیم نے ۱۲۳۵ھ میں معتمد الدولہ آغا میر کی فرمائش پر محتشم کاشی کا مرثیہ کتابت کیا جسے مختار الملک نواب سید محمد کو پیش کیا گیا۔ یہ مرثیہ شیخ ممتاز حسین جونپوری (مصنف "تعلیم خط و املا") کے پاس تھا۔ معلوم نہیں ان کے انتقال کے بعد کہاں گیا۔

نعمت اللہ کے شاگردوں میں محمد اشرف، مولوی قل احمد تھے جنھوں نے لکھنؤ میں کافی شہرت حاصل کی۔ اسی عہد میں منشی کالکا پرشاد نحیفؔ، کالکا پرشاد موجدؔ نے بھی بڑا نام پیدا کیا۔ ان دونوں حضرات نے عہد آصفی سے محمد علی شاہ

تک کا زمانہ دیکھا۔ کالکا پرشاد تحقیق کو نواب سعادت علی خاں نے اپنا میر منشی بنالیا تھا۔ عہد بادشاہ غازی الدین حیدر تک وہ اسی عہدے پر فائز رہے۔ مصنف "فسانۂ عجائب" رجب علی بیگ سرور اور صاحب "قیصر التواریخ" سید محمد میر معروف بہ کمال الدین حیدر بھی لاجواب خوشنویس تھے۔ ان کا لکھا ہوا جلی کتبہ بہ صورت صغریٰ درگاہ حضرت عباس لکھنؤ میں موجود ہے۔

اسی عہد کے ایک باصلاحیت استاد نواب سید محمد علی عرف نواب دولھا (متوفی ۱۲۹۴ھ) بھی تھے۔ جن کی شادی اعتماد الدولہ میر فضل علی خاں وزیر نصیر الدین حیدر کی دختر جعفری بیگم سے ہوئی۔ وہ ۱۲۵۴ھ میں مع اہل و عیال لکھنؤ سے شمس آباد ہجرت کر گئے۔ وہ شاعر بھی تھے۔ ابتدا میں مجرم اور بعد کو اثر تخلص اختیار کیا۔ فن خوشنویسی میں وہ شیخ بہادر علی بن شیخ خلیل "مروارید رقم" خاں فیض آبادی کے شاگرد تھے۔ انھوں نے نسخ یاقوت رقم خانی شیخ بہادر علی سے سیکھا تھا۔ اس سلسلے میں وہ اپنی کتاب "مرغوب دل" قلمی صفحہ ۱۰۵ میں تحریر فرماتے ہیں:

"..... شیخ بہادر علی خوشنویس مرحوم بن شیخ خلیل مروارید رقم خاں فیض آبادی یہ بزرگوار گورے، بڑی آنکھ، گرد ڈاڑھی، چھوٹے قد کے صاحب علم و شیعہ و خلیق و بے پروا و پرہیزگار و عادی افیون اور خوشنویس۔ اکثر خطوں خصوص نسخ یاقوت رقم خانی کے تھے۔ چنانچہ راقم نے بھی ان سے اسی خط کو چھ مہینے لکھنؤ میں جب کہ بادشاہ مغفور غازی الدین حیدر کا عہد تھا حاصل کیا تھا۔"

نواب سید محمد علی اپنی مشق کے متعلق "مرغوب دل" کے صفحہ ۵۴۶ میں تحریر فرماتے ہیں:

"اور میں نے بفضل سوائے داہنے ہاتھ کے کبھی کبھی گھائی اور بائیں ہاتھ اور داہنے پاؤں سے بھی کلمات مناسب لکھے ہیں۔ اور خط غبار کو بعونہٖ تعالیٰ ایسا لکھا کہ ایک رُخ پر چنے کی دال کے ساری سورت قل ھو اللہ کی مع بسم اللہ و اکثر اعراب علاوہ انا اعطینٰک الکوثر کے آگئی۔ مگر پہلے طریق کو بفضلہ داہنے ہاتھ کے ہوتے ہوئے فالِ بد اور دوسرے کو ترکِ ادب سمجھ کر چھوڑ دیا۔"

سید محمد علی قرآن مجید کی کتابت روزانہ فرماتے تھے۔ ایک صفحہ یا ایک سطر یا ایک لفظ ہی سہی۔ سید محمد علی کا لکھا ہوا قرآن مجید ان کے اخلاف میں سید محمد صادق صفوی کے پاس موجود ہے۔

میر انیس کے تلامذہ میں آغا وزیر حسین خاں عطا فیض آبادی خط نسخ بہت اچھا لکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی حیات (ولادت ۱۷۹۰ء۔ وفات ۱۹۱۲ء مدفن نجف اشرف عراق) میں کئی قرآن لکھے۔

خویش میر انیس میر ضامن علی بھی عربی خط بہترین لکھتے تھے۔ ان کا لکھا ہوا قرآن مجید (۱۲۷۲ھ نبوی) خاندان انیس میں موجود ہے۔ اس قرآن کی جدولیں سبز و سرخ روشنائی سے کھینچی گئی ہیں۔ اس میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہر جگہ سرخ روشنائی سے تحریر کیا گیا ہے۔

سید محمد مہدی تاثیر نقوی (خویش آرزو لکھنوی) نے چاول پر پوری سورت قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ خطِ نسخ میں لکھی تھی جو تعلقدار ہوا راجہ غلام حیدر صاحب مرحوم کے خاندان میں اب بھی محفوظ ہے۔ اسے دیکھنے کے لیے دور دور سے لوگ آتے ہیں۔

عہد واجد علی شاہ کے معتبر خوشنویسوں میں مولوی باقر علی "جادو رقم" مصنفہ پنج نگارین (مطبوعہ ۱۳۱۲ھ) فقیر محمد حامد علی مصنف "قطعات الجواہر" در خط نسخ (مطبوعہ نول کشور ۱۸۸۴ء) مولوی گلشن علی جونپوری، اصغر حسین جونپوری، اکبر حسین جونپوری، عبدالحکیم، حافظ ابوالحسن، میر کرم علی، سید مہدی علی، حافظ مسعود، عنایت اللہ، آلِ حسن، میر امام علی، میر جلال الدین، حکیم محمد حسین، وزیر علی، میر زین العابدین، عطا حسین، میر مہدی، شاہ وارث علی، محمد مراد، محمد صالح، محمد حسن، سید ابوالحسن فرقتی امروہوی، نور محمد، معظم علی، شرف الدین، اشرف علی، میر سید علی، مرزا جعفر، محمد اکبر، محمد موسیٰ، لال خاں، مرزا محمد علی، مرزا احمد طباطبائی، غلام علی، مرزا حاتم بیگ، محمد نور خاں، حیات علی، غلام مجتبیٰ، امام الدین، ابوالبرکات خاں، رونق علی، منشی احمد حسن خاں عروج، منشی امیر اللہ تسلیم، الٰہی بخش، میر احمد حسن، منشی عبدالحی عرشی، محمد علی خوش رقم، علامہ تفضل حسین خاں، تجمل حسین خاں، حامد حسین حافظ محمد باقر، محمد احمد، مرزا محمد ہادی اکبر آبادی، وزیر علی انجم، محمد مبین علی، معین علی، مولوی ہادی علی "ہفت قلم"، نثار احمد بریلوی تھے۔

غیر مسلم خوشنویسوں میں کنور چندی سہائے نہال، پیارے لال، شیام بخش، رام دیال، کنور پریم کشور، منشی ہیرا لال مونس، چیت رام، راجہ آنند رام، لچھمی سنگھ، پنڈت لچھمی نرائن، راجہ تند رام پنڈت، رائے سدھ رائے، سرب سکھ رائے، شنکر ناتھ، نرائن داس، امید سنگھ، رام چندر نظر جواہر رقم، شیو پرساد، بالک رام، چندر بھان برہمن، لالہ درگا پرشاد مضطر، راجہ درگا پرشاد مہر تھے۔ ان شخصیتوں کے علاوہ منشی دیبی پرشاد سحر ڈپٹی انسپکٹر مدارس ضلع بدایوں نے بڑی عرق ریزی سے حسبِ فرمائش مسٹر ڈی بی کین صاحب بہادر ایک کتاب "نظم پروین" ۱۸۶۵ء

میں اصول خوشنویسی پر مبنی تحریر کی۔

خط نستعلیق کے علاوہ خط نسخ کے بھی بعض ماہرین پیدا ہوئے جن میں محمد خلیل کا تذکرہ مندرجہ بالا سطور میں ہم کر چکے ہیں۔ وہ عبدالباقی حدّاد "یاقوت رقم" کے پائے کے استادِ فن تھے۔ اس کے بعد منشی ہادی علی لکھنوی خوش نویس تھے جنھیں طغرا نویسی میں مہارت حاصل تھی۔ ہادی علی کے شاگردوں میں حامد علی اور شمس الدین ہوئے۔ اگر یہ کہا جائے کہ بیسویں صدی میں فن خوشنویسی کی بقا اور حیاتِ دوام کے یہی امانت دار ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ حامد علی کے ہاتھ کی تحریروں میں خط نسخ کی جلی چیزیں راقم کی نظر سے گذریں مگر خفی خط فراہم نہ ہو سکا۔

۱۱ر مارچ ۱۸۵۶ء کو واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد جنگ آزادی، ۵۷ء رونما ہوئی۔ مختلف فنون کے ماہران دانہ شبینہ کو محتاج ہو گئے اور مجبوراً دیار و امصار کے سفر اختیار کیے۔ اللہ نے منشی نول کشور کی صورت میں ایک باحوصلہ انسان پیدا کیا جس نے ادبا، شعرا، حکما اور ماہر مصوروں اور خوشنویسوں کی امکانی ہمت افزائی اور سرپرستی کی۔ شعرا کے دواوین، حکما کی علم طب کی کتابیں، داستان گویوں کی داستانیں اور ماہر خوشنویسوں کے فن پارے اسی مطبع سے شائع ہوئے۔ منشی نول کشور کی وفات کے بعد ان کے جانشینوں خصوصاً رائے بہادر منشی پراگ نرائن جی نے بڑی لگن سے کام کیا اور محمد شمس الدین "اعجاز رقم" سے یکے بعد دیگرے کئی کتابیں جو فن خوشنویسی سے تعلق رکھتی ہیں قلم بند کروائیں جن میں کاپی بک کے پانچ حصے تنویر شمس (مطبوعہ نول کشور ۱۹۰۰ء) مرقع نگارین، گلدستہ ریاحین، پنجہ نگارین، نظم پروین، آئینۂ خوشنویسی، اعجاز رقم (مطبوعہ نول کشور ۱۹۱۶) گلستاں، بوستاں، دیوان حافظ، کریما وغیرہ دیکھنے کے لائق ہیں۔

منشی شمس الدین لکھنوی کی تحریر کردہ جلی چیزوں میں کتابوں کے علاوہ مدرسہ عالیہ فرقانیہ کے صدر دروازے کی عبارت اور مسجد حیدر بخش چوک کے بالائی حصے کی مغربی دیوار پر موجود مسجد سے متعلق وصیت نامۂ حیدر بخش (۱۲۹۳ھ) کا پتھر جس کی لمبائی ۵ فٹ اور چوڑائی ۲½ فٹ ہے۔

منشی شمس الدین نے اپنی حیات میں لاتعداد شاگرد بنائے۔ جس میں جتنی صلاحیت تھی کسب فیض حاصل کیا۔ ان کے نامور شاگردوں میں منشی محمد افضل، محبوب علی، عاشق علی، لیاقت علی، شیخ زائر حسین، شیخ محمد باقر جونپوری شیخ علی یاور، (ذوالقدر اول) منشی الطاف، منشی عبدالحکیم، منشی آغا شباب، منشی سید علی حسین، سید محمد محسن، مرزا علی حسین، منشی نورالحسن، منشی شاہ میرزا، منشی بندہ حسن، منشی محمد نواب، منشی احمد حسین، منشی رضا حسین، منشی ساجد حسین، اشرف علی، منشی حسن مرزا، منشی حامد حسین، منشی محمد صادق غیور، منشی حمید الحسن عیش، جمیل الحسن، منشی ابوالقاسم زیدی، ابوطالب زیدی، منشی انوار احمد، سید احمد (خویش شمس الدین صاحب) منشی یاور حسین، منشی مساجد حسین، سید غلام حسین عرف نادر آغا، ابراہیم لکھنوی، منشی عبدالرحیم، منشی مرزا محمد جواد صاحبان ہوئے۔ □□

حواشی :-

۱؎ بہ عہد شاہ عباس صفوی ۱۶۱۵ء/۱۰۲۴ھ آپ کو ایران ہی میں قتل کر دیا گیا۔ شاہجہاں کو جب یہ خبر معلوم ہوئی تو بے حد افسوس کیا اور کہا کاش اس کو میرے پاس بھیج دیا جاتا۔ (ملاحظہ ہو، تذکرہ خوش نویسان ص ۱۶۵)

۲؎ "مرغوب دل" تالیف، نواب سید محمد علی خاں کے قلمی نسخہ کے آخری صفحہ پر خاتمہ کی تاریخ یہ ہے : بفضلہ شب شنبہ ۲۳ر صفر ۱۲۸۳ھ مطابق ۷ر جولائی ۱۸۶۶ء از تصحیح ایں کتاب الفراغ حاصل گردید، الحمد للہ علی ذلک الاتمام۔ اس خطی نسخہ کی فراہمی کے لیے راقم سید ظہیر حسین نجیر رئیس بہوہ کا ممنون ہے۔
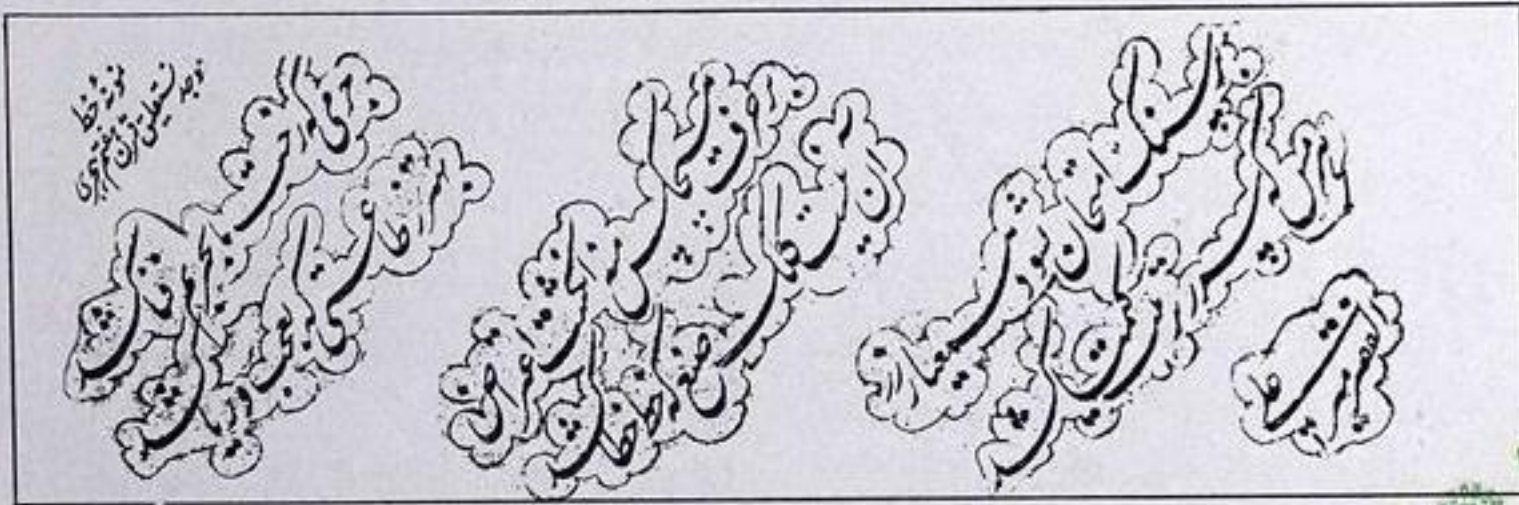
تجمّل خاں
پرنسپل بھات کھنڈے ہندستانی سنگیت
مہاودیالیہ، لکھنؤ

اودھ کے سِتارنواز : لکھنؤ گھرانہ

جناب تجمّل خاں صاحب سِتار کے ماہر ہیں اور فی الوقت لکھنؤ کے بھات کھنڈے ہندوستانی سنگیت مہاودیالیہ کے پرنسپل ہیں۔ ان کی ولادت ۲۴ اگست ۱۹۴۵ء کو لکھنؤ میں ہوئی۔ موسیقی کی تعلیم اپنے والد اُستاد رحمت حسین خاں اور بڑے بھائی اُستاد بشارت حسین خاں سے حاصل کی۔ اس کے علاوہ اُستاد کرامت اللہ خاں کے شاگرد خاص الٰہ آباد کے پروفیسر بنواری لال جی اور بمبئی کے اروند پاریکھ صاحب سے بھی ستار بجانا سیکھا۔ ۱۹۵۶ء میں استاد کی حیثیت سے سنگیت کی دُنیا میں قدم رکھا اور ۱۹۶۳ء سے ۱۹۷۰ء تک پریاگ سنگیت سمیتی، الٰہ آباد، بعد ازاں بی۔ آر۔ پی کالج، جونپور میں تین برس تک قیام رہا ہے۔

والد کی وفات کے بعد آکاش وانی لکھنؤ میں اور پھر شملہ میں۔ اسٹاف آرٹسٹ کے طور پر کام کیا۔

سپت تنتریکا (सप्त तंत्रिका) دو جلدیں، اور سنگیت کے قدیم وجدید تاریخ (संगीत युगे युगे) پر ایک کتاب تصنیف کی ہے۔ اس کے علاوہ اپنے دادا کی تصنیف 'مُعلّم نغمات' کا ہندی میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ گھرانے دار کلاکار ہوتے ہوئے بھی سنگیت کے اہم ترین شعبے یعنی شاشتر کے ہر پہلو سے پوری طرح واقف ہیں۔ (ا۔ح)

جب ۱۷۷۵ء میں فیض آباد سے اودھ کی راجدھانی لکھنؤ منتقل ہوئی تو ملک کے بہت سے صاحبِ کمال فنکار سرپرستی کے لئے لکھنؤ آگئے، جن میں پیار خاں، باسط خاں (رباب نواز)، نعمت اللہ خاں (سرود نواز)، جونپور کے باشندے محمد غلام رضا خاں (سِتار نواز)، لکھنؤ والے محمد حسین خاں (بین کار)، لکھنؤ کے استاد دولھے خاں (سادرہ گایک) وغیرہ کو نواب آصف الدولہ اور بعد میں نواب واجد علی شاہ کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی حاصل ہوئی۔[1]

اِس کی بدولت لکھنؤ سنگیت کا مرکز بن گیا۔ مذکورہ بالا فنکاروں کی مشترکہ کوششوں سے لکھنؤ میں موسیقی کی خوب مقبولیت ہوئی اور سنگیت کے کئی نئے گھرانے وجود میں آئے۔ جیسے پیار خاں کے شاگرد برکت علی سانولیا خاں کا گھرانہ جو فرخ آباد گھرانہ تسلیم کیا گیا۔ استاد نعمت اللہ خاں کا گھرانہ، استاد محمد حسین خاں کا گھرانہ، جو لکھنؤ گھرانے کے تحت شمار کیا گیا۔ اِن کے علاوہ استاد عبدالغنی خاں اور یوسف علی خاں سے لکھنؤ میں ستار نوازی کی علیحدہ روایت قائم ہوئی۔

اِن کے علاوہ اُس عہد کے دیگر ستار نوازوں میں غلام محمد خاں، سجّاد محمد خاں، غلام محمد خاں کے شاگرد نبی بخش ڈیرے دار، بریلی کے قطب الدولہ، نواب حشمت جنگ، نواب علی نقی خاں، پنا لعل باجپئی، وید ارجن داس، بالو اشوری پرساد، چھُنّے خاں، شری بنواری لال شریواستو اور استاد رحمت حسین خاں وغیرہ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان فنکاروں نے ستار کے باج کو ترقی دینے اور مقبول بنانے میں گرانقدر خدمات انجام دیں۔

محمد غلام رضا خاں

استاد محمد غلام رضا خاں جونپور کے باشندے تھے اور نواب آصف الدولہ کے عہد میں فیض آباد سے لکھنؤ آکر بس گئے تھے۔ انھوں نے اُسی زمانے میں ایک کتاب ـــــ نغماتِ آصفی ـــــ تصنیف کی تھی۔ انھوں نے ستار بجانے

کی ابتدائی تعلیم جے پور کے استاد مسید خاں جی سے حاصل کی تھی۔

نوابوں کے درباروں اور رئیسوں کی محفلوں میں منعقد ہونے والی موسیقی کی بزمِ طرب میں استاد محمد غلام رضا خاں کو متواتر شرکت کرنے کے مواقع ملے۔ انھوں نے مشاہدہ کیا کہ ان محفلوں میں عموماً دھرپد یا خیال کی ٹھمری گائیکی کو زیادہ اہمیت اور اعزاز حاصل ہے۔ دُور رَس صلاحیت کے مالک استاد محمد غلام رضا خاں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اب لکھنؤ کے نواب اور رؤسا سنجیدہ، دھیمی اور دھرپد کے ضابطوں کی پابند مسید خانی طرز سے مطمئن نہیں ہیں۔ اسی عوامی مقبولیت کی تبدیلی نے تیز رفتار دِگرگت شیلی (शैली) کے تصور کو جنم دیا۔ سامعین کی پسند اور ذہنیت کو دھیان میں رکھتے ہوئے استاد محمد غلام رضا خاں نے ٹھمری اور ترانے جیسی چَپل شیلیوں (चपल शैलियों) کی بنیاد پر دھیمی تین تال دستار خانی ٹھیکہ میں بجانے کے لائق ایک نئی گت شیلی (गत शैली) ایجاد کی جو انھیں کے نام سے یعنی رضا خانی باج کے نام سے آج بھی رائج ہے۔

کچھ ستار نوازوں کا خیال ہے کہ رضا خانی باج یا پوروی باج کی ایجاد، ترقی، شہرت و مقبولیت کا اعزاز صرف محمد غلام رضا خاں ہی کو حاصل نہیں ہے، ان کے ہی زمانے میں غلام محمد خاں سجاد محمد خاں، پیار خاں، باسط خاں بالوالشوری پرساد، نواب حشمت جنگ، قطب الدولہ، لکھنؤ کے استاد محمد حسین خاں، نعمت اللہ خاں وغیرہ متعدد ایسے فنکار بھی تھے جو رس باج کو پوری طرح فروغ دینے میں مشغول تھے اور ان سبھی کلاکاروں نے ستار خانی کے ٹھیکے کے تحت کئی گتوں (गतों) کی تخلیق کی تھی جو آج بھی اُن لوگوں کے نام سے رائج ہیں۔ کیونکہ سب سے پہلے اس طرح کے باج کا تصور محمد رضا خاں نے کیا تھا اس لیے اس طرز (शैली) کا نام رضا خانی طرز پڑا۔ چونکہ پورب کے کئی صاحبان کمال کا بھی اس طرز کے فروغ میں ہاتھ تھا اس وجہ سے اسے پوروی باج بھی کہا گیا۔

ڈاکٹر بمل کانت رائے چودھری نے خیال ظاہر کیا ہے کہ مسید خاں نے مسید خانی باج کو اپنے گھرانے کے لئے محفوظ رکھا اور اپنے شاگرد رضا خاں کے لئے ایک نئی گت شیلی کی تخلیق کی جو بعد میں رضا خانی باج کے نام سے مشہور ہوئی۔

استاد محمد حسین خاں

استاد محمد حسین خاں کی ولادت لکھنؤ میں ۱۸۷۰ عیسوی میں ہوئی تھی۔ اِن کے والد کا نام استاد دولھے خاں تھا، جو دھرپد، سادرہ، ہوری اور خیال گائیک تھے۔ استاد محمد حسین خاں کے بزرگوں میں مہدی حسن خاں، فدا حسین خاں، غلام عباس خاں اور غلام وارث علی خاں وغیرہ کے نام معلوم ہو سکے ہیں۔

استاد محمد حسین خاں کو اپنے ماموں استاد مہدی حسن خاں (جو حسن خاں امبیٹھے (अमबेठे) والے کے شاگرد تھے) سے بین کاری تعلیم ملی تھی اور گائین کی تعلیم اپنے والد استاد دولھے سے لی تھی۔ کچھ مدت تک اُلونجہ ریاست میں رہے مگر دل نہیں لگا اور کچھ ہی دنوں بعد واپس لکھنؤ آگئے اور پھر یہیں رہے۔ استاد محمد حسین خاں خوددار اور آزاد مزاج تھے لکھنؤ کے تھوڑے سے ہی رئیس ایسے تھے جن کی محفلوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔

ٹھاکر نواب علی خاں نے بارہا اِن کو اپنی محفلوں میں مدعو کیا اور اِن کی بین نوازی سے لطف اندوز ہوئے۔ استاد محمد حسین خاں گاتے بھی بہت اچھا تھے۔ ٹھاکر نواب علی خاں نے اپنی کتاب معارف النغمات کی دوسری جلد میں اِن کی بنائی ہوئی متعدد بندشوں کو جمع کیا ہے۔ اس کتاب میں زیادہ تر تخلیقات استاد محمد علی خاں (ننکو میاں ابنِ باسط خاں) کی ہیں۔ لیکن گائیک محمد حسین خاں (لکھنؤ) کے نام سے جو بندشیں ہیں وہ محمد حسین خاں بین کار کی بنائی ہوئی ہیں۔

استاد محمد حسین خاں لاولد تھے۔ اپنے بھائی خلیفہ احمد حسین کے بیٹے رحمت حسین خاں کو گود لے کر بیٹے کی طرح تعلیم دی تھی۔ انھیں بین بجانے اور گانے کے علاوہ ستار نوازی پر بھی مکمل قدرت حاصل تھی۔ بین کار ہونے کے ناطے انھوں نے کبھی کسی محفل میں ستار بجانے کا فن پیش نہیں کیا بلکہ بہت سے لوگوں کو ستار بجانے کی تعلیم دی تھی، جن میں استاد رحمت حسین خاں، ڈی۔ این۔ سانیال، بشیر خاں، ٹُوٹُو دتہ دستار سکھانے کی استاد ششی بھوشن انٹر کالج، لکھنؤ) کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ لکھنؤ ہی میں ۱۹۶۲ عیسوی میں رحلت کی۔

رضا حسین خاں

دولھے خاں صاحب کے دوسرے بیٹے استاد رضا حسین خاں پہلے لکھنؤ میں اور پھر رام پور ریاست میں رہے۔ رام پور کے ذرائع نے بتایا کہ استاد رضا حسین خاں رام پور بینڈ میں استاد کے عہدے پر تھے۔ وہ اپنے زمانے کے اچھے خیال گائیک تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ بڑے

عباس حسین خاں عرف اتن خاں ہی نے سنگیت کو پیشہ بنایا۔ یہ بھی خیال گایک تھے۔ ان کی بھی ایک بندش راجہ نواب علی خاں نے معارف النغمات جلد دوم کے صفحہ ۶۴ پر درج کی ہے۔ اتن خاں صاحب کے بیٹوں نے سنگیت کو بطور پیشہ نہیں اپنایا۔ اِن کے خاص شاگردوں میں لکھنؤ کے سکندر حسین اور نوابو خاں (دونوں شہنائی نواز) کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

استاد دولھے خاں کے تیسرے بیٹے باقر خاں بھی اعلیٰ پایہ کے گایک تھے۔ نوجوانی ہی میں فوت ہو گئے۔

استاد دولھے خاں کے سب سے چھوٹے بیٹے خلیفہ احمد حسین خاں تھے۔ انھوں نے گانے کی تعلیم بڑے بھائی رضا حسین خاں اور والد سے حاصل کی۔ خلیفہ احمد حسین خاں اپنے زمانے کے اولین مسلمان استادوں میں سے تھے جن کو صوتی تحریر (स्वर लिपि) کا مکمل علم تھا۔ انھوں نے مروجہ راگوں میں دو سو استھائیاں (स्थाईयां) حفظ کی تھیں۔ انھیں خوبیوں کی بنا پر اُس زمانے کے صاحبانِ کمال نے اُنھیں لکھنؤ گھرانے (استاد دولھے خاں کا گھرانہ) کا 'خلیفہ' قرار دیا تھا۔ انھوں نے متعدد لوگوں کو سنگیت کی تعلیم بھی دی تھی جن میں جلی خورشید اللہ رکھی 'بڑی اور چھوٹی' مشتری بائی' قمر جہاں اور محمدی کی سلمیٰ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اِن طوائفوں کو موسیقی کی تعلیم دینے ہی کی وجہ سے پیشہ ورانہ رقابت رکھنے والوں نے خلیفہ احمد حسین خاں کو یہ کہہ کر مشہور کر دیا کہ وہ صرف بائیوں ہی کے استاد ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ٹھاکر نواب علی خاں' رائے اُما ناتھ بلی اور وشنو نارائن بھات کھنڈے کی خواہش پر ایک عرصے تک لکھنؤ کے بھات کھنڈے ہندوستانی سنگیت مہا ودیالیہ میں استاد کے عہدے پر فائز رہے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں لکھنؤ کے اسّی فیصد پیشہ ور کلاکاروں کو گانے کی تعلیم دی تھی' جن میں بسم اللہ خاں (شہنائی)' اقبال خاں' امجد خاں' ایودھیا پرسائی مشرف خاں' بنّے خاں' جونپور کے محتشم حسین (مصنف انڈین میوزک' اردو) اور جہانگیر آباد کے راجہ اعزاز رسول صاحب کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

راجہ جہانگیر آباد کی فرمائش پر ایک کتاب "مُعلّمِ نغمات" تصنیف بھی کی تھی۔ انتہائی باصلاحیت ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد غصّے ور بھی تھے' جس کی وجہ سے اس زمانے کے زیادہ تر با اثر لوگوں اور فنکاروں سے اِن کی اَن بَن رہتی تھی اور یہی سبب ہے کہ خلیفہ احمد حسین خاں کو تاریخِ موسیقی کے صفحات میں جگہ نہیں ملی۔ اِن کے اکلوتے بیٹے استاد رحمت حسین خاں تھے۔

استاد رحمت حسین خاں اچھے موسیقی نواز' اچھے معلّم اور اچھے موجد بھی تھے۔ ٹھمری انگ کی بنیاد پر ستار کے لئے موزوں مدھیہ لَے کی گتوں کی بندش کی تھی یہی نہیں ٹھمری انگ کی اُن گتوں کو بجانا بھی جانتے تھے جن میں زیادہ بول نہیں ہوتے۔ اُن کے بجانے میں خاص طور پر 'مند سوروں' (मन्द स्वरों) کے اَلاپ کی کثرت ہوتی تھی اور گت کاری میں مدھیہ لَے کی گتیں ہی زیادہ بجاتے تھے۔ ان کی گتوں کی خصوصیت گت کی تہائی بن آنا تھی۔ خاں صاحب نے بھی بہت سے لوگوں کو تعلیم دی تھی' جن میں ونشرا پاؤلا سرکار' گوری شنکر' سپنا بھٹاچاریہ بھولا ناتھ (دربھنگہ)' سورج نارائن لال وِملا قانونگو اور بال کرشن نائر کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۲ر دسمبر ۱۹۷۲ء کو لکھنؤ میں بعمر ۵۷ برس وفات پائی۔

بشارت حسین خاں (ستار)

اِن کی ولادت ۱۹۴۱ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔ ستار بجانے کی تعلیم اپنے والد اور دادا خلیفہ محمد حسین خاں سے حاصل کی۔ محض بارہ برس کی عمر میں ستار نوازی کا مظاہرہ کرنے لگے تھے۔ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۷۲ء تک آکاش وانی کیندر' لکھنؤ کے کلاکار رہے۔ بعد میں دس برس تک بمبئی فلمی دنیا سے وابستہ رہے۔ اُس کے بعد نیروبی (کینیا' مشرقی افریقہ) میں ستار سکھانے کا اپنا ادارہ چلا رہے ہیں۔ پورے یوروپ میں ستار نوازی کے پروگرام پیش کر چکے ہیں۔ ستار نواز ہونے کے ساتھ ساتھ استاد بھی ہیں۔ اہم شاگردوں میں لکھنؤ کے گوپال چکرورتی' بھون موہنی نگم' سوہا رسنی وغیرہ شامل ہیں۔ کلاسیکل موسیقی کے علاوہ ستار میں سُگم سنگیت کے موجد ہیں اور دھن بجانے میں ماہر ہیں۔ ترانہ انگ کی رضا خانی گت نواز ہیں۔

مترجم: نازک جہاں

حواشی: انا الموسیقی

۱۔ موعود انا الموسیقی۔ کرم امام صفحہ ۴۵۔۴۴ ۲۔ بھارتیہ سنگیت کوش صفحہ ۱۳۶/ سنگیت بودھ صفحہ ۱۴۴ ۳۔ خسرو' تان سین اور دیگر کلاکار صفحہ ۲۰۴ ۴۔ پیارے خاں کی تخلیق 'راگ کافی' کی پوروی باج کی گت اس کا ثبوت ہے۔ ۵۔ لکھنؤ کی سنگیت پرمپرا صفحہ ۴ ۶۔ بھارتیہ سنگیت کوش صفحہ ۱۳۶ ۷۔ معارف النغمات جلد دوم طبع اول ۱۹۲۴ صفحہ ۲۵' ۲۸' ۱۰۱' ۲۰۳' ۲۱۶' ۲۲۶' ۲۲۹ وغیرہ ۸۔ خسرو' تان سین اور دیگر کلاکار صفحہ ۲۰۵

پروین طلحہ
سی۔ ۳۷، بٹلر پیلس کالونی، لکھنؤ

نیشاپوری نوابوں کے عہد میں اودھ کا انتظامیہ

اکبر کے عہد میں سلطنت مغلیہ بارہ صوبوں میں منقسم تھی۔ اودھ ان میں سے ایک تھا اودھ حکومت کے بانی سعادت خاں مغل حکومت کے امرا میں سے تھے اور ۱۷۲۲ میں اودھ کے صوبے دار مقرر کئے گئے تھے انھوں نے ہی اودھ انتظامیہ کی داغ بیل ڈالی تھی جس کا سلسلہ واجد علی شاہ کے دور تک چلا۔ حالانکہ اس انتظامیہ نے مغل قوانین وضوابط کو برقرار رکھا۔ لیکن انیسویں صدی میں اس کے ڈھانچے اور اس کے ضابطوں اور قوانین میں تبدیلیاں آئیں۔ سعادت خاں اور ان کے فوراً بعد کے دو نواب وزیر صوبۂ اودھ میں مغل شہنشاہ کے نائب کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ مگر وہ ۱۷۶۵ میں انگریزوں سے صلح کے بعد اودھ کے نواب وزیروں کے قدم خود مختاری کی طرف بڑھنے لگے۔

ابتدائی تین نواب وزیر ایک مضبوط انتظامیہ کی تشکیل میں کامیاب ہوئے جو صوبہ دار کی فوری توجہ کے بغیر بھی فرائض کی بجاآوری کی صلاحیت رکھتا تھا۔

سعادت خاں نے ایک ایسا مضبوط انتظامیہ تشکیل دیا جو مکمل طور سے ان کا وفادار تھا اس وجہ سے ان کی عدم موجودگی میں بھی اس صوبہ پر ان کی گرفت رہتی تھی۔ اس مقصد کے پیش نظر انھوں نے اپنے اعزا، اقربا اور رفقا کو انتظامیہ کی کلیدی اور اہم جگہوں پر مقرر کیا یہ اسلئے بھی کیا گیا تھا کہ اودھ کو ایک آزاد مرکز کی حیثیت حاصل رہے جہاں سے پوری سلطنت پر اثر انداز ہونے کی کوششوں کا آغاز کیا جاسکے۔

شہنشاہ اکبر نے اپنے انتظامیہ کو اس طرح تشکیل دیا تھا کہ مختلف صوبے دار مرکز سے آزادی نہ حاصل کر پائیں اس نے صوبوں کی دیوانی کے افسروں کا تقرر اپنے پاس رکھا اور اسطرح سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔ صوبے دار صرف نظامت کا سربراہ ہوتا تھا مغلوں نے اس بات پر خصوصی توجہ دی کہ صوبوں کی دیوانی اور نظامت ایک ہی فرد کے پاس نہ رہنے پائے۔ لیکن اورنگ زیب کے بعد کمزور شہنشاہ تخت پر بیٹھے ان کے پاس نہ سیاسی فراست تھی اور نہ انتظامیہ کے اہم نکات کو سمجھنے کی مہم۔ یہی وجہ تھی کہ اٹھارویں صدی میں مغل سلطنت کے مختلف صوبوں کے علاقائی حکمرانوں نے مرکزی حکومت سے اپنے کو آزاد کر کے اپنی خاندانی حکومت قائم کرلی تھی۔ صوبائی ناظم نے خود کو مغل طرز میں ڈھال لیا تھا۔ مسلم الثبوت مغل روایات کے مطابق مختلف شعبہ جات ودفاتر میں اقتدار کے خطوط اور طریقہ کار کے بنیادی عناصر وہی رہے اسی لئے انیسویں صدی میں اس انتظامیہ نے انھیں دوسری شکل دینے کی برطانوی کوششوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

اودھ کے افسروں کا تقرر مغلیہ امرا میں سے کیا جاتا تھا۔ اودھ کے انتظامیہ کے مختلف محکمے وہی تھے جو مغلوں نے بنائے تھے۔ سرکاری زمرے اور نظامت کے درمیان ایک طرح کا تناؤ رہا کرتا تھا۔ نظامت کا سربراہ صوبے دار یا گورنر ہوتا تھا۔ لیکن محکمۂ مالیات کا سربراہ دیوان کہلاتا تھا اودھ کے صوبے دار اس سے واقف تھے کہ اس طرح کے تناؤ اور اختلافات نے بنگال کے صوبے دار کو ایسٹ انڈیا کمپنی کا وظیفہ خوار بنادیا تھا۔ شہنشاہ ہندستان نے ایسٹ انڈیا کمپنی بنگال بہار اور اڑیسہ کی دیوانی عطا کی تھی۔ اس لئے اودھ میں صوبہ دار نے اختیارات کا استعمال خود کیا اور سعادت خاں کے عہدے سے دیوان اور دوسرے افسروں کا تقرر وہی کیا کرتے تھے تاکہ دیوان صوبہ دار کا ماتحت رہے۔ حالانکہ یہ مغل انتظامیہ کے بنیادی اقدار کے مغائر تھا۔ لیکن ۱۷۲۲ سے کوئی شہنشاہ ہی نہیں رہ گیا تھا جو اودھ کے صوبے داروں کے اس اقدام کے مضمرات پر غور کرسکتا چونکہ مرکز سے کوئی اعتراض

نہیں ہوا اس لئے یہ طرز عمل جاری رہا اور صوبے دار مغل بادشاہ کے تسلط سے آزادی حاصل کرتے گئے۔ آخر کار ۱۸۱۹ سے ان لوگوں نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

چونکہ صوبے دار بلا شرکت غیرے صوبائی انتظامیہ کے سربراہ بن گئے تھے اس لئے وہ لوگ اپنا ایک نائب مقرر کر دیا کرتے تھے جو انکی عدم موجودگی میں شعبۂ نظامت کا نگراں ہوتا تھا۔ نائب ایسا شخص ہوتا تھا جس پر زبردست اعتماد کیا جا سکے اور صوبے دار اس پر مکمل بھروسہ کر سکے ابتدا میں نائب کے عہدے کے لئے صرف رشتے دار مقرر کئے جاتے تھے۔ جیسے اودھ میں سعادت خاں کے نائب صفدر جنگ تھے۔ صفدر جنگ سعادت خاں کے بھانجے اور داماد تھے اور بعد میں اودھ کے نواب ہوئے تھے۔ نائب کے محکمے میں زیادہ تر افسران وہ ہوتے تھے جو حکمرانوں کے خاندان کے معتبر نوکر، غلام یا خواجہ سرا ہوں یا جن کی سعادت خاں کے خاندان سے قدیم وابستگی ہوتی تھی۔ حکومت کے اختتام تک نواب نے اس کا لحاظ رکھا کہ ان عہدوں پر شیعہ فرقے کا کوئی مسلمان مقرر کیا جائے۔ البتہ دیوانی کے محکمہ کے لئے نوابوں نے کائستھ اور کھتریوں کے خاندان سے منشیوں کا تقرر کیا۔ دیوان کے منصب پر کچھ مستثنیات کو چھوڑ کر اسی طبقات افراد مقرر کئے جاتے تھے انھیں دو برادری کے افراد دیوانی کے مختلف محکموں پر ہر سطح پر مقرر کئے گئے نوابوں کے انتظامیہ میں ایک اور اہم بات یہ رہی کہ جو بھی دیوانی کے کسی بھی عہدے پر مقرر ہوا وہ جب تک زندہ رہا اپنے عہدہ سے ہٹایا نہیں گیا اور اس کے انتقال کے بعد اس کے ورثا میں سے کوئی اس عہدے پر مقرر کیا گیا۔ آتما رام لاہور کے پنجابی کھتری تھے اور سعادت خاں کی آگرہ کی صوبے داری کے زمانے سے ان کے ساتھ رہے۔ جب سعادت خاں اودھ کے صوبے دار ہوئے تو آتما رام دیوان مقرر ہوئے کئی نسلوں تک آتما رام کے ہی خاندان میں رہی نوابی انتظامیہ میں اس طرح کی سیکڑوں مثالیں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ درحقیقت کائستھ اور کھتری دیوان اس کا التزام رکھتے تھے کہ ان کے محکموں میں انھیں کے خاندان اور برادری کے افراد مقرر ہو سکیں اس دیوانی کے محکموں میں بہت سارے نقائص کے باوصف استحکام اور مضبوطی پیدا ہوئی۔

یہاں نوابوں کی انتظامیہ مغل انتظامیہ سے بالکل الگ تھی۔ اس لئے کہ مغلوں کے یہاں حکام مسلسل تبدیل ہوا کرتے تھے۔ مغل شہنشاہ پوری سلطنت کا دورہ کیا کرتے تھے۔ انتظامیہ کے مختلف محکموں پر نظر رکھتے تھے کہ ان محکموں میں کسی مخصوص خاندان یا فرد کا کوئی آدمی زیادہ بااختیار ہو کر اپنی جڑیں مضبوط نہ کرنے پائے مغل انتظامیہ کی یہی طاقت اس وقت تک رہی جب تک لائق شہنشاہ تخت نشیں ہوتے رہے

جس طرح سعادت خاں نے اپنے منصب کو خاندانی عہدہ بنانے میں کامیابی حاصل کی ان کے ماتحت حکام نے بھی اپنے محکموں کو اسی طرز میں ڈھال لیا۔ کسی خاندان کی اس طرح کی اجارہ داری انتظامیہ کو کمزور بنانے کا ایک سبب بنی۔ ان خاندانوں کی وجہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی اودھ انتظامیہ میں دخیل ہو سکی اور صوبے پر اپنے اثرات کو مستحکم بنا سکی۔ انتظامیہ کی کمزوری کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس ڈھانچے میں زمینداروں کا کوئی مقام نہیں رکھا گیا یہ زمیندار جنہیں انتظامیہ اور دربار سے ایک فاصلے پر رکھا گیا تھا دن بہ بدن سرکش اور مختار ہوتے گئے ایک وہ بھی زمانہ آیا کہ جب اصل مالیہ کم ہوتا تھا مگر مالیہ کے بقایہ کی وصولیابی پر اصل سے زیادہ لاگت آتی تھی۔ اس طرح کے حالات میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے لئے یہ دشوار نہیں رہ گیا کہ وہ طرح طرح کے بہانے تلاش کر کے اودھ کی بادشاہت کو ختم کر دے اور انتظامیہ کا الحاق کر لے

(ترجمہ : باقر عباس)

لکھنؤ کے کوتوال

مرزا علی رضا بیگ نے دو سپاہی کوتوالی سے ساتھ کیے۔ وہ انگوٹھی اور کپڑے اس کے گھر سے منگوائے۔ انگوٹھی مُہر کی تھی۔ مرزا علی رضا بیگ نے بڑے نواب کو اس سانحے کی خبر کی۔ کپڑے اور دونوں انگوٹھیاں گھر بھجوادیں۔ امام بخش کو سزا ہو گئی۔ واہ مرزا کیا کہنا۔ کوتوال ہو تو ایسا ہو۔

—— امراؤ جان ادا : مرزا رسوا

اشفاق احمد خاں
اسٹیٹ میوزیم، لکھنؤ

نوابینِ اودھ کے زیورات اور لباس

اپنے ارتقا سے لے کر مختلف مراحل سے گذرتے ہوئے آج کے زیورات کی تاریخ ایک دلکش داستان ہے۔ یہ ایک طرف انسان کے شوق، ذوق، مہارت اور دست صناعی کی کہانی تو دوسری طرف کسی قوم کی علمی، ادبی اور جمالیاتی ذوق کے ساتھ ساتھ سیاسی، اقتصادی عروج اور زوال کی بھی عکاسی کرتی ہے۔

زیورات انسان کے تخیل کا وہ پہلا عملی جامہ ہے جسے اس نے تہذیب کے اولین دور میں اپنی محبوبہ کے تئیں محبت، خلوص اور اعتماد ظاہر کرنے کا پہلا پہلا ایک خوبصورت ذریعہ بنایا ہوگا۔ شروع میں ان گہنوں یا زیوروں کے لئے اس نے بھلے ہی آج کی طرح سونے، چاندی، ہیرے اور موتیوں کا استعمال نہ کیا ہو مگر جسم کی آرائش و زیبائش کے لئے اس کے اپنے آس پاس دستیاب قدرتی چیزیں تو تھیں ہی جیسے پھول، چڑیوں کے رنگین پر، رنگ برنگے پتھر، سوکھے اور ہرے رنگین پھل، گھاس، ہڈیاں اور دانت اور جانوروں کے ناخن وغیرہ۔ شروع میں عورت مرد دونوں ہی اپنے کو قدرت کی ان خوبصورت چیزوں سے آراستہ کرتے تھے۔ اس طرح سے ایک اندازہ ہوسکتا ہے کہ زیور کی ایجاد انسان نے تواریخ کے دھندلکے میں کب اور کیسے کی ہوگی۔ یہ زیورات اس کی زندگی میں تہذیب کی پہلی منزل سے ہی زمین کے ہر خطے اور ہر نسل و قوم میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انسان نے زیور پہلے پہنا، کپڑا بعد میں۔ آثار قدیمہ کے ماہرین کو زمانۂ قدیم کے قبرستانوں میں پائی گئی لاشوں کے ڈھانچہ کے گلے میں پڑا کسی نہ کسی قسم کا ہار ملتا ہے اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ زیورات کی اہمیت، اس کا تصور دنیا کے ہر خطے میں تھا، چاہے وہ ہندوستان ہو، مصر، روم، بابل اور چین کی تہذیبیں ہوں یا افریقہ اور یورپ کے براعظم ہوں۔ ہر جگہ آثار قدیمہ کے ماہرین کو کھدائی میں زیورات دستیاب ہوئے ہیں۔ زمانۂ قدیم کے غاروں میں بسنے والے انسانوں کے ذریعہ غاروں کی دیواروں پر پائی گئی تصویروں میں Rockcare Painting میں بھی اسی دور کے انسانوں کے گلے میں اکثر زیورات قسم کے ہار جیسی چیزیں دیکھی جاسکتی ہیں۔

ہندوستان میں زیورات کی اہمیت انسان کی پیدائش سے لے کر مرنے تک یکساں ہے۔ ایک طرف اس کا استعمال مذہبی رسموں، ٹونے ٹوٹکوں کے لئے ہوتا ہے تو دوسری طرف ان کا مقصد جسم کی آرائش بھی ہے ضعیف الاعتقادی کی وجہ سے تعویذ کی صورت میں قیمتی اور نیم قیمتی پتھر گلے اور ہاتھ میں پہنے جاتے ہیں یہی ضعیف الاعتقادی اور روحانیت بھی مختلف اقسام کے زیورات کی ذمہ دار ہے۔ اکثر دیوی دیوتاؤں کو خوش کرنے بیماروں کے مضر اثرات سے بچنے بیماری اور دیگر مصیبتوں سے حفاظت کی خاطر یہی قیمتی و نیم قیمتی پتھروں کو تعویذ کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ ان تعویذوں نے ہی آگے چل کر زیورات کی شکل اختیار کرلی۔ قدیم بابل کی پہاڑیوں پر بنے مندروں کے پجاری بری روحوں اور دیوتاؤں سے بچنے کی خاطر ہار کی شکل میں اکثر قیمتی پتھروں سے جڑے حفاظتی تعویذ گلے میں پہنا کرتے تھے۔ آج بھی قیمتی اور نیم قیمتی پتھروں کی اہمیت میں کمی نہیں آسکی ہے۔

ہندوستان میں عورتیں سہاگ کی نشانی کے طور پر گلے میں منگل سوتر پہنتی ہیں، اسی طرح ماتھے کا ٹیکہ نتھ اور چوڑیاں بھی سہاگ کی نشانیاں سمجھی جاتی ہیں۔

ہندوستان میں تاریخی دور کے زیورات کے ثبوت سانچی، امراوتی و بھارہوت کی مورتیوں اور اجنتا کے غار میں دیواروں پر بنی تصویروں سے ملنے شروع ہو جاتے ہیں۔ اس کے پہلے ہڑپہ، موہن جوداڑو اور ٹکشلہ میں آثار قدیمہ کی کھدائی سے زیورات کے نمونے ملے ہیں۔

مغل دور ہندوستان کی تاریخ میں نمایاں دور مانا جاتا ہے۔ خاص طور سے شہنشاہ اکبر سے شہنشاہ شاہجہاں تک کا زمانہ ہندوستان

کا سنہرا دور سمجھا جاتا ہے۔ اس دور میں مغل دربار میں نہ صرف ہندوستان بلکہ سارے ایشیا، خاص کر ایرانی اور مغربی ایشیا کے عظیم المرتبت فنکار اکٹھا ہو گئے تھے۔ سبھی فنون کی قدر دانی کی گئی۔ ادب، فلسفہ، موسیقی، فن تعمیر، مصوری فنون لطیفہ غرض کہ کوئی بھی فن ایسا نہ تھا جس کے پائے کے ماہرین دربار مغلیہ سے فیضیاب نہ ہوئے ہوں۔ اس عیش و طرب اور خوشحالی کے زمانے میں زیورات کہاں اچھوتے رہ سکتے تھے۔ مغل بادشاہوں، امیروں، رؤسار و دیگر بڑے منصب دوراں یہاں تک کہ درمیانی طبقہ کے اہل کاروں کو اپنی شان و شوکت، شاہی دبدبہ اور نام و نمود کا بے انتہا احساس تھا۔ اپنے اپنے مرتبہ، حشمت اور دولت کی نمائش کے لئے زیورات بھی ایک بڑا ذریعہ ہیں۔ اس فن کو بھی سبھی فنون کی طرح ہر اعتبار سے سراہا گیا۔ آئینۂ اکبری کے مطابق اکبر اعظم کے پاس ہر فن کے الگ الگ کارخانے تھے۔ فنکاروں کی حسین تخلیق کا بادشاہ بذات خود معائنہ کرتا اور فنکاروں کو انعام و اکرام سے نوازتا۔ شاہی بیگمات و دیگر امرار کی عورتیں اکثر سونے کے ہی زیور پہنتی تھیں۔

چاندی پہننا عموماً ہتک آمیز سمجھا جاتا تھا۔ طلائی زیورات کو مزید پرکشش اور خوبصورت بنانے کے لئے زیورات پر ہیرے جڑے جاتے اور مینا کاری سے سجایا جاتا۔ اس دور میں بھی زیورات کے استعمال کا عام رجحان لگ بھگ پہلے جیسا ہی رہا۔ مگر شاہی بیگمات اور دیگر رؤسار اور امرا میں دولت کی فراوانی کی وجہ سے اس کی طرز بناوٹ، نمونے اور وزن وغیرہ میں تبدیلی آئی، اس دور کے زیورات پہلے کے مقابلے ہلکے مگر بہت خوبصورت، نازک اور سبک بننے تھے۔ اب زیورات بنانے کا تصور دولت کو زیور کی شکل میں بدل کر محفوظ رکھنا نہیں، بلکہ جسم کی زیبائش کا ذریعہ مانا جانے لگا۔ ان کو ہیرے جواہرات اور موتیوں سے بھی سجایا جانے لگا۔ اس طرح جڑاؤ زیورات زیادہ بننے لگے اور ان میں ایرانی و مغربی ایشیار کے فیشن کے طرز جھلکنے لگے۔

زیوروں پر اوپری سجاوٹ پر زیادہ دھیان دیا جاتا۔ اکثر سونے کے زیور پر اوپر کوئی قیمتی پتھر اور نیچے کی طرف مینا کاری کا کام ہونے لگا۔ ہندوستان میں آگرہ اور دلّی کے علاوہ جے پور، بنارس اور لکھنؤ وغیرہ میں بھی یہ فن زندہ

رہا مگر بعد کے دنوں میں جے پور اس فن کا خاص مرکز بن گیا۔ اودھ میں نواب آصف الدولہ کے دور میں قیصر آغا نام کے فنکار نے گلابی مینا کاری کی شروعات کی تھی۔

مغل بادشاہوں کے زوال کے شروعات کے ساتھ نوابین اودھ کے عروج کی داستان شروع ہوتی ہے۔ نوابین اودھ کا خاص دور ۱۷۲۲ء سے ۱۸۵۶ء تک کا زمانہ مانا جاتا ہے۔ یہ عہد ہندوستان کی تاریخ میں بے مثال ہے۔ اس دور میں ایک عجیب انداز کی گنگا جمنی تہذیب نے جنم لیا۔ اودھ کی تاریخ جہاں ایک طرف نوابوں کی مذہبی رواداری، اخلاق، رعایا پروری نفاست و نزاکت کی کہانی ہے تو وہیں دوسری طرف انگریزوں کی ریشہ دوانیوں، مخبری اور سیاسی عیاریوں، نوابوں کی مجبوری اور لاچاری کی ایک پرسوز داستان بھی ہے۔

نوابین اودھ کے جد اعلیٰ محمد امین نیشاپوری دلی دربار کی طرف سے نواب برہان الملک کے خطاب سے سرفراز ہو کر ۱۷۲۲ء میں اودھ کے صوبہ دار مقرر ہوئے اور انھوں نے اجودھیا شہر کے پاس اپنی حکومت کا مرکز بنایا، جو بعد میں فیض آباد کے نام سے مشہور ہوا۔ انہی کے وارثوں نے اودھ پر انگریزی حکومت کے تسلط سے پہلے یعنی ۱۸۵۶ء تک حکومت کی اور نوابین اودھ و شاہان اودھ کے نام سے تاریخ میں مشہور ہوئے۔ ان نوابوں کے ساتھ ان کی اور ان کے درباریوں کی مستورات بھی دلی سے اودھ آئیں جن کے لباس اور دیگر آرائش کا سامان جیسے زیورات وغیرہ عام طور سے مغلوں کے ہی جیسے تھے۔ ان کے زیورات میں بھی فقط زینت اور آرائش کا خیال باقی رہ گیا تھا۔ نزاکت اور نفاست میں ہر قسم کے زیورات بتدریج سبک، ہلکے، نازک اور خوشنما ہوتے گئے۔ آخر وقت میں دولت مند گھرانوں کی بیویوں کی یہ وضع ہو گئی کہ شاید ہی بغیر گوٹے پٹے کے کپڑے پہنتیں اور دو ایک نہایت ہلکے اور نازک زیوروں پر ہی اکتفا کرتیں جو بہت ہی نفیس، سبک اور قیمتی ہوتے۔ گلے، ناک، کان میں اگر زیور پہننا ہوتا تو وہ بھی بہت سبک ہلکے قسم کے ہوتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اتنا ہلکا زیور بننا شروع ہوا جس کی مثال

ہندوستان کے کسی اور مقام پر نہیں ملتی۔ ہندوستان میں نتھ پہننے کا کافی رواج تھا مسلم عورتوں نے بھی اسے اپنایا مگر لکھنؤ کی مستورات نے نتھ کی جگہ پر ہلکی، باریک اور خوشنما کیل کو زیادہ ترجیح دی، جو انتہائی نفیس اور خوبصورت زیور ثابت ہوا۔ نازک پسندی نے ان کیلوں کو بھی اتنا مختصر اور سُبک کر دیا کہ اس قسم کی کیلوں کے کاریگر لکھنؤ کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتے تھے۔

محرم کے مہینہ میں مسلمانوں میں اور خصوصاً شیعہ حضرات کی مستورات میں سارے زیورات تن سے جدا کر دیئے جاتے کیوں کہ محرم غمی کا مہینہ مانا جاتا ہے، یہاں تک کہ ہاتھوں کی کلائیاں بھی چوڑیوں سے بے نیاز ہو جاتیں۔ چوڑیوں کی جگہ کلائیوں میں ریشم کی سیاہ پہونچیاں اور کانوں میں سیاہ اور زرد رنگ کے ریشم کے کرن پھول استعمال کئے جاتے۔

ملبوسات

ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے سے قبل سِلے ہوئے لباس کا رواج نہ تھا، عورتیں اور مرد دونوں بے سلی چادر، ساریاں اور دھوتیوں سے اپنی ستر پوشی کرتے تھے۔ عربوں کے بھی لباس اور وضع یہاں کے لوگوں سے کچھ خاص مختلف نہ تھے، لباس میں تبدیلی کے ساتھ تہذیب کا براہ راست نتیجہ ہے جس کا اثر بغداد کے عباسی خلفاء پر پڑا، اور وہیں سے مسلمانوں کے ساتھ ہوتا ہوا ہندوستان میں داخل ہوا، دہلی کے دربار مغلیہ کا اور ساتھ ہی اودھ میں آنے والے نوابوں کا آخری لباس یہ تھا کہ سر پر پگڑی، بدن میں نیمہ، جامہ ٹانگوں میں ٹخنوں سے اونچا تنگ مہری کا پاجامہ، کمر میں جامہ کے اوپر پٹکا اور پیروں میں جوتا۔ جامہ جو کہنی تک آدھی آستین کا شلوکہ ہوتا تھا عموماً باریک ململ اور جامدانی کا ہوا کرتا تھا، اسے خوشنما بنانے کی خاطر سفید ململ پہ چکن کا باریک اور خوبصورت کام بنایا جاتا تھا۔ ڈھاکہ کی ململ اور جامدانی اور اودھ میں ٹانڈہ کی جامدانی بادشاہوں و دیگر عالی مرتبت امیروں کے لئے مخصوص تھی۔ بعد میں ایرانی قبا سے ماخوذ کر کے بالابر ایجاد ہوا۔ اس میں گریبان بالکل کھلا ہوتا تھا۔ آگے چل کر اسی بالابر کو ترقی دے کر انگرکھا ایجاد ہوا۔ انگرکھا دراصل بالابر اور جامہ دونوں کو ملا کر بنایا گیا تھا اس طرح ایک نئی قطع پیدا کر دی گئی۔ اس میں بائیں جانب سینہ تھوڑا کھلا رہتا تھا چولی اور دامن نیچے رہتے تھے۔ لکھنؤ آنے پر اس انگرکھے میں زیادہ چستی اور قطع داری پیدا کی گئی۔ چولی گول، اونچی اور کھنچی ہوئی چست ہو گئی۔ بغلوں کی چنٹیں بالکل غائب ہو گئیں۔ انگرکھے کی مقبولیت نے نیمہ کا رواج ختم کر دیا۔ اس میں بائیں جانب سینہ کا کھلا رہنا اس دور میں معیوب نہ سمجھا جاتا۔ لکھنؤ میں انگرکھے کے نیچے نیمہ کے بجائے شلوکہ کا استعمال رائج ہوا۔ بعض حضرات رنگین شلوکہ بھی پہنتے اس لئے کہ اس کے بیل بوٹے اور رنگ تن زیب کے سفید انگرکھے کے نیچے اپنی رنگین جھلک دکھا کر ایک خاص نفاست پیدا کرتے تھے۔ بالابر میں دوسری ترمیم لکھنؤ میں یوں ہوئی کہ چپکن کے نام سے ایک چست قبا ایجاد ہوئی۔ یہ چپکن کسی بھاری کپڑے کی ہوتی جو جاڑے کے موسم کے لئے زیادہ موزوں تھی۔ یہی چپکن اہلکار، باریان دربار سلطنت کا معزز لباس بن گئی۔ اس کے بعد آخر عہد میں انگرکھا اور چپکن دونوں کو ترتیب دے کر اچکن ایجاد کی گئی، یہ اچکن لوگوں کو بہت بھائی اور اس کا رواج شہر سے نکل کر دیہاتوں اور ہندوستان کے دیگر حصوں تک پہونچ گیا۔ یہی اچکن حیدرآباد پہونچ کر تھوڑی ترمیم کے بعد شیروانی بن گئی۔ وہاں اس کی آستینیں انگریزی کوٹ کی طرح کر دی گئیں۔ انگرکھے کے نیچے شلوکہ پہنا جاتا تھا، اس کے عوض آگے چل کر پہلے ڈھیلا کرتا ایجاد ہوا، اور بعد میں مغربی اثر کے تحت قمیص نے اس کی جگہ لے لی۔

ابتدا میں مسلم حکمران کے عمامے بڑے بڑے ہوا کرتے تھے اور اسی کی مناسبت سے امراء اور درباریوں کی پگڑیاں بھی بڑی ہوا کرتی تھیں سلطنت مغلیہ کے عہد میں یہ پگڑیاں چھوٹی اور ہلکی ہوتی گئیں۔ اکثر جدت طراز امراء نے اپنی خاص بندشیں اور خاص وضع کی چھوٹی پگڑیاں ایجاد کیں۔ آگے چل کر ان پگڑیوں کو مزید مختصر اور ہلکا کرنے کی خواہش نے ٹوپیوں کی ایجاد کی۔ چند روز میں ان ٹوپیوں میں بھی ترمیم، تنسیخ کا عمل شروع ہوا اور دیکھتے دیکھتے ٹوپیوں کی باڑھ سی آ گئی۔ پگڑیاں چھوڑ کر ٹوپیوں کو اس طرح اپنایا گیا کہ سب کے سر پر ٹوپیاں ہی نظر آنے لگیں۔ چوگوشیہ، پنجگوشیہ اور دوپلی ٹوپیاں زیادہ مقبول ہوئیں، چوگوشیہ ٹوپی مہذب اور اعلیٰ درجہ کے لوگوں کے لئے مخصوص تھیں۔ دوسری ٹوپی دوپلی تھی جسے شہزادوں سے لے کر ادنیٰ طبقہ کے لوگ بھی کچھ ترمیم کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔ نواب نصیر الدین حیدر

کے وقت میں ایک گول ٹوپی کا بھی رواج تھا جو مندیل کہلاتی تھی۔ اس ٹوپی کو دربار میں بھی جگہ دی گئی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد تک چوگوشیہ، مندیلوں اور دوپلی ٹوپیوں کا خوب دور رہا، بعد میں ترکی ٹوپی نے بھی زور پکڑا، اس کے ساتھ ساتھ انگریزی ہیٹ صاحب قسم کے ہندوستانی لوگ استعمال کرنے لگے۔ ساتھ ہی انگریزوں کے اثر میں اگر مندیل کی فیلٹ کیپ بھی ایجاد ہوئی، جسے انگریزوں نے "بابوز کیپ" کا نام دے رکھا تھا۔ ٹوپیاں چاہے جتنی قسم کی رہی ہوں دوپلی ٹوپیوں کی مقبولیت کو کوئی نہ پہونچ سکی۔ سبھی لوگوں نے اس ہلکی پھلکی ٹوپی کو اپنے سروں پر بٹھایا۔

ٹوپی کی مقبولیت سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ لکھنؤ کی نازک پسندی نے پگڑیوں کو دفن کر دیا۔ خودمیاں کے حکمرانوں کے سروں پر پرانی دستار نواب سعادت علی خاں کے زمانے تک رہی، پہلے نواب برہان الملک، نواب شجاع الدولہ اور نواب آصف الدولہ کے سروں پر وہی دہلی کے عہدیداران سلطنت کی سی سفید دستار ہوا کرتی تھی۔ جس پر درباری موقعوں پر جواہرات کی قلغیاں، مرصع چوغے اور سرپیچ لگا دیئے جاتے تھے۔ اکثر قلمی تصویروں میں نواب سعادت علی خاں کے سر پر ایک نئی قسم کی پگڑی نظر آتی ہے جسے اہل لکھنؤ شملہ کہتے ہیں۔ یہی شملہ نواب نے دربار کے دیگر سبھی امراء اور وزیروں کو پہنایا۔ غازی الدین حیدر کو انگریزوں نے نواب سے بادشاہ بنا کر ان کے سر کو ایک عدد تاج کا حقدار بنا دیا۔ یہ تاج یورپ کے بادشاہوں کے تاج جیسا تھا۔ اس عہد کے شہزادے خاص موقعوں پر بھاری کام کی نوک دار ٹوپیاں پہنتے تھے۔ مگر سلطنت کے عہدیداران کو حکم تھا کہ شملہ پہن کر دربار میں حاضر ہوں۔ شملہ ٹوپی کا چلن واجد علی شاہ کے زمانے تک رہا۔ دربار کے مختلف درجہ کے اہلکاروں کے لئے الگ الگ رنگ اور قسم کی پگڑیوں کے پہننے کا حکم تھا۔ سنی علماء دین عام طور سے سر پر عمامے پہنا کرتے تھے۔ شیعہ علماء بیشتر دوپلی ٹوپی ہی پہنتے رہے مگر عام لوگوں کے خلاف ان کی سیون بجائے آگے سے پیچھے آڑی یعنی ایک کان سے دوسرے کان تک رہتی ہے۔ بدن پر لمبا کرتا مگر اس کے گریبان

کا چاک سینے کے بیچ کے بجائے بائیں شانے کے پاس ہوتا ہے۔ جو علماء ایران و کربلا ہو آتے ہیں، ان کے کرتے کے اوپر طیلسان ہوا کرتی ہے۔ جو دوپٹہ یا رومال ہوا کرتی ہے، جسے واعظ خطبہ کے وقت پہنتے ہیں پاؤں میں چھوٹے پائچوں کا پاجامہ ہوتا ہے اور پیروں میں ایک خاص جوتا (قفشہ) ہوا کرتا ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں میں دھوتی کی جگہ پاجاموں کا رواج تھا۔ اس کے پہلے صرف دھوتی ہی پہنی جاتی تھی، پائجامہ مسلمان اپنے ساتھ لائے۔ آگے چل کر پائجاموں کی قطع میں اتنا تغیر ہوا کہ پائجامہ کی مہری پنڈلی سے لپٹی رہتی۔ بعد میں مہری کسی قدر نیچی اور لمبی ہو گئی۔ مگر ٹخنوں سے آگے نہ بڑھی۔ لکھنؤ میں ڈھیلے عرض کا پاجامہ شروع ہوا آگے چل کر اُسی کاٹ کا تنگ اور چست پائجامہ پہننے کا رواج چل نکلا جسے گھٹنا (چوڑی دار) کہتے ہیں۔ یہ گھٹنا سبھی طبقوں میں یکساں مقبول ہوا۔

ہندوستان میں عورتوں کا قدیم لباس صرف بے سلی چادر تھی جو کمر سے باندھ کر آدھی اوپری حصہ پر لپیٹ لی جاتی تھی اس کے علاوہ سینہ کے اوپر باندھنے کا ایک اور لباس تھا جسے انگیا اور چولی کہتے تھے۔ سلے ہوئے کرتے پائجامے مسلمان اپنے ساتھ لائے۔ مسلمان عورتیں ڈھیلے پائجامے ساتھ لائیں جو بعد میں گھٹنے بن گئے مگر ان کا گھیر اوپر سے ڈھیلا ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس میں اوپر کا گھیر کم ہوتا گیا اور پائنچہ کی مہریاں بہت تنگ ہو گئیں۔ لکھنؤ میں مسلمان بیگمات تنگ مہری کا پائجامہ، سینے پر تنگ آستین کی کھنچی ہوئی انگیا اور دھڑ چھپانے کے لئے ایک کرتی اور دوپٹے کا استعمال کرتی تھیں۔ بادشاہ نصیرالدین حیدر کے زمانے سے گھٹنے کی جگہ بڑے بڑے گھیردار پائنچوں کے کلی دار پائجاموں نے لے لی تھی جو کمر سے بالکل تنگ ہوتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے آس پاس باریک کپڑوں اور آدھی آستین کے تنگ شلوکوں کا بھی رواج نکلا۔ اسی کے ساتھ نیچے کرتے کا بھی چلن شروع ہوا۔ جاڑے کے لباس خصوصاً امرا میں موٹے اور اونی کپڑوں کے ہوا کرتے تھے جنھیں زردوزی کے کاموں سے سجا کر ان کی خوبصورتی کو دوبالا کیا جاتا۔

خاص خدمت گار مردوں اور عورتوں کی پوشاکیں ان کے مالکان کے جیسی ہی ہوا کرتی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ خدمت گار اپنے مالکوں کی اتری ہوئی پوشاکیں ہی پہنا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ امیروں اور رئیسوں کے دیگر خدمت گاران جیسے محل داروں، مغلانیوں، کہارنوں وغیرہ کی وضع قطع مختلف ہوا کرتی تھیں اور انھیں آسانی سے پہچانا جا سکتا تھا۔

اودھ میں خصوصاً لکھنؤ اور اس میں بھی خاص کر شیعہ حضرات کے یہاں محرم کی ایک الگ اہمیت ہے اور چونکہ یہ غم کا مہینہ مانا جاتا ہے اس لئے اس ماہ میں زندگی انتہائی سادگی سے گذاری جاتی ہے۔ اظہار غم کرنے کے لئے بھڑکیلے، فیشن دار کپڑوں کو تج کر سادے کپڑے جو اکثر کالے نیلے یا سبز رنگ کے ہوتے ان کا استعمال کیا جاتا، کیوں کہ یہ رنگ غم اور سوز کا رنگ تصور کئے جاتے ہیں۔ سبز رنگ کے کپڑے اس لئے استعمال کئے جاتے تھے کہ بنی عباس کے عہد میں بنی فاطمہ کا رنگ سبز تھا۔

نوابین اودھ کا زمانہ دنیا کی پریشانیوں سے دور چین، سکون امن، عیش و طرب کا زمانہ تھا۔ یہاں کے نوابین، روسار، امرا و دیگر ذی حیثیت حضرات کو اپنی کفالت کے لئے کچھ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ وقت گذارنے کا ذریعہ گھر سے باہر ادبی محفلیں، یا گھر کے اندر بیگمات اور باندیوں کی صحبتیں ہوتیں۔ نتیجہ کے طور پر اکثر مردوں پر عورتوں کی وضع غالب آنے لگی اور لوگوں کی یہ حالت ہو گئی کہ میاں اور بیوی کی رضائیوں، دوشالوں پائجاموں وغیرہ میں بھی کوئی فرق باقی نہ رہا سوائے اس کے کہ گوٹہ، پٹہ اور زیور عورتوں کے ساتھ مخصوص تھا۔ مرد شوخ رنگوں کے نازک ریشمی کپڑے بغیر گوٹے پٹے کے پہننے لگے۔ لیکن آگے چل کر انگریزی اثر سے یہ کیفیت کم ہونے لگی۔

آج کل کے برخلاف گذشتہ نوابی عہد میں بھی گھر اور باہر ایک ہی جیسے کپڑے پہننے کا چلن نہ تھا۔ گھر سے باہر نکلتے وقت انگرکھا، چکن، پائجامہ وغیرہ پہنا جاتا تھا مگر گھر کے اندر ایک ہلکی سی لنگی، تہہ بند بھی استعمال کی جاتی تھی۔ نتیجہ کے طور پر ایک دھلا ہوا لباس مہینہ بھر چل جاتا جیسے آج ہی دھل کر آیا ہو۔ دھوبی کے یہاں سے دھلے ہوئے انگرکھے کا دامن، گوٹ اور آستین چنٹ دے کر سجائی جاتیں جن کا اثر کافی عرصہ تک باقی رہتا۔ عورتوں کے گھریلو اور باہری لباس میں کوئی فرق نہ تھا۔ گھر میں پہننے کا جوڑا صرف تھوڑا ہلکا اور باہر مہمانداری میں جانے کا جوڑا بھاری قیمتی اور کامدار ہوا کرتا تھا۔ مہمانداری میں مرد عورتیں اور بچے سبھی اپنے حسب اوقات نفیس

شامِ اودھ

مجھ کو معلوم نہیں کیا تھے عوامل، یعنی
کِس لیے دہر میں مشہور ہوئی شامِ اودھ
گومتی! تو ہی بتا، تو نے تو دیکھا ہوگا
قافلہ اہلِ سعادت کا جب اترا ہوگا
تیرے ساحل پہ رکا، پھر نہ کہیں اور گیا
اک نئے عہد کی تاریخ کی تمہید بنا

میں اسی فکر میں اک دن سرِ ساحل بیٹھا
چاہتا تھا کہ ملے میرے سوالوں کا جواب
دفعتاً ایسا لگا، کھل گئی ماضی کی کتاب
عکس ساکن ہوئے، بہتا ہوا پانی ٹھہرا
کوئی آواز نہ تھی، ہو گئی خاموش فضا
ایسے ماحول میں آئی لبِ دریا سے صدا

میرے شاعر! یہ تری فکر و تشویش بجا
واقفِ حال نہیں کوئی، فقط میرے سوا
یوں تو ساحل مرا، صدیوں سے ہے آباد رہا
جو بھی آیا وہ یہیں رہ گیا، واپس نہ گیا
اور گیا بھی تو مری یاد لیے دل میں گیا
ربط قائم رکھا، کچھ نام و نشاں چھوڑ گیا

میری دھرتی پہ ابھی باقی ہے بچپن ٹیلہ
وہ مسافر یا مہاجر ہو کہ صاحب یا گدا
راس آجاتی ہے ہر اک کو مری آب و ہوا
جڑ پکڑ لیتا ہے، ہو چاہے جہاں کا پودا

ہاں مگر شامِ اودھ کے ہیں عوامل کچھ اور
عامی کچھ کہتے ہیں، فرماتے ہیں عاقل کچھ اور
میرے شاعر! میں بتاتی ہوں کہ یہ راز ہے کیا
مجھ سے بڑھ کر تو کسی نے بھی نہ دیکھا نہ سنا
یہ مری شامِ اودھ لمحۂ فطرت بھی ہے
اس کی تخلیق میں برسوں کی ریاضت بھی ہے
اس کی تعمیر کی بنیاد، سعادت بھی ہے
اس کی تہذیب کا عنوان، شرافت بھی ہے
اس کی تاریخ، دھنک رنگ عبارت بھی ہے
اس کے باشندوں کی مشترکہ وراثت بھی ہے
علم و فن اور ہنرمندی میں رفعت بھی ہے
اس کے لہجے میں سخن ساز ملاحت بھی ہے
لذتِ گوش جسے کہیے، حلاوت بھی ہے
بات کہنے کے سلیقے کی روایت بھی ہے
خواہشِ امن و اماں، چشمِ مروت بھی ہے
یعنی مل جل کے بسر کرنے کی عادت بھی ہے

اور کچھ ایسا جسے حالِ ندرت سمجھو
یہ مری شامِ اودھ ایک علامت سمجھو

مصطفیٰ زیدی وفا
۶/۱۲ ڈالی باغ کالونی
لکھنؤ - ۱

گرو شرن لال
سورج پرنٹرس کھدرا، سیتاپور روڈ لکھنؤ - ۲۲۶۰۲۰

بیگماتِ اودھ کا درخشاں کردار

شاہانِ اودھ اپنی شان و شوکت اور تعیش کے لیے مشہور تھے۔ فنونِ لطیفہ سے والہانہ عشق کے سبب انھوں نے مختلف وضع کی پوشاکیں۔ زیورات و آرائش کے ساز و سامان بھی ایجاد کیے۔ اسکے علاوہ ان کے دورِ حکومت میں فنِ تعمیر، دست کاری صنعت اور زبان و ادب کو کافی فروغ ملا۔ بیگماتِ اودھ اِن کاموں میں برابر کی شریک رہیں۔ ان میں حُبّ الوطنی۔ رعایہ پروری کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ اُن کی ان ہی خصوصیات کی وجہ سے نسائی زندگی میں بھی تبدیلی ہوئی اور ایک نئے فکر کا آغاز ہوا۔ ان خصوصیات کی حامل بیگمات نے نوابوں کے اذہان و افکار کو بھی تبدیل کر دیا تھا۔ اپنے اس مثالی کردار کی وجہ سے بیگماتِ اودھ نے ہندوستانی تاریخ میں اپنا وجود ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا۔ اس سلسلے میں کچھ بیگمات کا ذکر حسبِ ذیل ہے۔

نواب بیگم:۔ نواب منصور خاں نے برہان الملک کی دختر سے شادی کی تھی جنھیں نواب بیگم کے نام سے جانا جاتا تھا۔ سسرال میں انھیں صفدر جہاں بیگم کا خطاب ملا۔ جو بعد میں نواب بیگم کے نام سے مشہور ہوئیں۔ یہ بہت ہوشیار خاتون تھیں ۱۷۵۵ء میں جب وہ اپنے زخمی شوہر کے ساتھ احمد شاہ کی دعوت پر فیض آباد سے دلّی جا رہی تھیں۔ راستے میں ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا لیکن انھوں نے ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے اس راز کو راز ہی رہنے دیا۔ ۱۷۶۴ء میں بکسر کی جنگ میں شجاع الدولہ کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اسکے بعد نواب سے پچاس لاکھ روپئے بطورِ جرمانہ وصول کیا گیا۔ جون ۱۷۹۶ء کو دورانِ نماز ان کا انتقال ہو گیا۔

بہو بیگم:۔ شجاع الدولہ کی بیگم امت الزہرہ دلّی کے وزیر خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کا نکاح ۱۷۴۵ء میں دلّی میں دارا شکوہ کے محل میں ہوا۔ اس یتیم بچّی کے نکاح میں شہنشاہ نے لاکھوں روپئے خرچ کئے۔ بعد میں انھیں بہو بیگم کا خطاب دیا گیا۔ دلّی سے وہ کافی مال و دولت ساتھ لائی تھیں۔ بکسر کی لڑائی میں انگریز فوج پر ہونے والے اخراجات کو بہو بیگم نے ہی پورا کیا تھا۔ وہ آصف الدولہ کے ساتھ لکھنؤ میں گومتی کے کنارے بنے بُرج میں کچھ ماہ تک قیام پذیر رہیں۔ ان کی لکھنؤ آمد پر تمام شاہراہوں پر اشرفیاں لٹائی گئیں۔ ایک بار آصف الدولہ کے سپاہیوں کی تنخواہ کی ادائیگی انھوں نے اپنی بیٹی کے جہیز کے لئے رکھے روپیوں سے کی تھی ۱۸۱۶ء میں بہو بیگم کا انتقال ہو گیا اور فیض آباد کے جواہر باغ میں اُن کے ہی قائم کردہ ٹرسٹ سے ان کا خوبصورت مقبرہ بنوایا گیا۔

بیگم شمس النساء:۔ نواب آصف الدولہ کا پہلا نکاح دلّی کے دیوان خاندان کے امام الدّین خاں عرف اقتیاز الدولہ کی دختر شمس النسائ سے ہوا تھا۔ ۱۷۶۹ء میں فیض آباد میں ہوئی اس شادی میں ۲۴ لاکھ روپئے خرچ ہوئے تھے۔ دلّی کے شاہ عالم اور شعلہ پوری بیگم نے اس شادی میں شرکت کی تھی۔ شمس النساء لکھنؤ کے شیش محل میں سات سال تک رہیں۔ بعد میں الہ آباد میں ان کا انتقال ہو گیا اور انھیں لکھنؤ میں دفن کیا گیا۔

بیگم قدسیہ محل:۔ غریب پرور قدسیہ بیگم کی رہائش گاہ چھتر منزل تھی۔ بادشاہ نصیر الدین کی اس منظورِ نظر کے پاس سے کوئی مایوس نہیں لوٹا تھا۔ معمولی خاندان سے متعلق ہونے کی وجہ سے وہ غریبوں کے دُکھ درد سے بخوبی واقف تھیں۔ بچپن میں ایک نجومی نے ان کا ہاتھ دیکھ کر یہ بتایا تھا کہ ایک دن وہ ملکہ بن جائیں گی لیکن شرط یہ ہوگی کہ وہ غریبوں کو نہ بھولیں۔

بیگم ہوتے ہی قدسیہ محل نے میر انور علی کو بلا کر دس ہزار روپے کی تھیلی عطا کی۔ وہ روزانہ پانچ سو روپئے غریبوں میں تقسیم کرنے کے بعد ہی ناشتہ کرتی تھیں۔ وہ نہایت خوددار خاتون تھیں۔ انھوں نے بادشاہ کی کسی بات سے ناراض ہو کر سنکھیا چاٹ کر خودکشی کر لی تھی۔ ۲۱ اگست ۱۸۴۳ء کو لکھنؤ کے ارادت نگر محلے کی کربلا میں انھیں دفنا دیا گیا۔

بیگم حضرت محل:۔ لکھنؤ کے اکبری دروازے کے پاس چودھرائن کا امام باڑہ ہے۔ جس کی شکل اب کافی بدل گئی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہیں سے حضرت محل کو لیجا کر شاہ عالم کے پری خانہ میں پیش کیا گیا تھا۔ شاہ عالم نے انھیں مہک پری کا خطاب دیا۔ برجیس قدر کی ولادت کے بعد انھیں بیگم کا خطاب دیا گیا۔ ۱۳ فروری ۱۸۴۷ء کو واجد علی شاہ کے برسر اقتدار ہوتے ہی انھیں حضرت محل کا خطاب ملا۔ محمدی اور جلال آباد کی جاگیریں انھیں دے کر ان کی شان میں اضافہ کیا گیا۔

حضرت محل نے ۹ جولائی ۱۸۵۷ء کو اپنے نابالغ فرزند رمضان علی برجیس قدر کو چاندی والی بارہ دری میں تخت نشین کرایا۔ شام کو تیز بارش میں ۲۱ توپوں کی سلامی کے ساتھ بیگم راج ماتا بنیں۔ اپنے بیش قیمت زیورات ملک کی خدمت میں پیش کر دئیے جب لکھنؤ میدان جنگ بن گیا اور چنہٹ، سکندر باغ، قدم رسول، بیگم کوٹھی، ریزی ڈنسی، دلکشا قلع، جلال آباد اور عالم باغ میں زبردست جنگ ہوئی جس کے نتیجے میں ۷۵ ہزار لوگ قتل ہو گئے۔ بیگم حضرت محل نے جنگ کی باگ ڈور سنبھال کر انگریزوں سے بہت دلیرانہ مقابلہ کیا۔ گومتی کے دائیں کنارے پر موسیٰ باغ میں ان کی انگریزوں سے آخری جنگ ہوئی۔

ملکہ کشور:۔ یہ امجد علی شاہ کی خاص محل تھیں۔ ملکہ کشور ان کا خطاب تھا۔ وہ نہایت شرمیلے مزاج کی تھیں۔ واجد علی شاہ انھیں کے بیٹے تھے۔ ان کے محل میں تاتاری عورتیں پستول باندھ کر ٹہلا کرتی تھیں۔ وہ مختلف موسموں میں مختلف مقامات پر رہتی تھیں۔ موسم سرما میں چھتر منزل میں، موسم گرما میں چوکھٹی میں اور موسم باراں میں حویلی باغ میں رہتی تھیں۔ جس کپڑے کو ایک بار استعمال کر لیتی تھیں دوبارہ ہاتھ تک نہیں لگاتی تھیں۔

اب دھیرے دھیرے اودھ کے شاہی خاندان کی رسائی کلکتے کے بیچ گارڈن تک ہو چکی تھی۔ کشور اپنے فرزند کو اپنے حقوق دلانے کی غرض سے وکٹوریا کے پاس جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ نواب واجد علی شاہ اس وقت بیمار تھے ملکہ کشور اور حضرت محل (ساس بہو) کے درمیان تعلقات خوش گوار نہ تھے۔ ملکہ کے ساتھ انگلینڈ جانے کے لئے ۱۴ افراد تیار کئے گئے۔ اس تاریخی اور غیر معمولی سفر کی تیاری میں دس لاکھ روپئے خرچ ہوئے کروڑوں روپئے کے تحفے وکٹوریا کو دینے کی غرض سے اکٹھا کئے گئے۔ ۱۶ جون ۱۸۵۶ء کو کشور جہاں کا یہ قافلہ رات کے بارہ بجے کو ریا کے جہاز سے روانہ ہوا۔

۲۰ اگست کو یہ قافلہ لندن پہونچا۔ چار لاکھ روپئے کے ساتھ ملکہ کشور نے وکٹوریا کے پاس اپنی اپیل بھجوائی۔ ملکہ کشور اور وکٹوریا کے درمیان دس ماہ تک ملاقات نہ ہو سکی۔ روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا۔ آخر میں ۴ جولائی ۱۸۵۷ء کو وکٹوریا نے ایک زنانہ دربار منعقد کیا جس میں ملکہ کشور کو مدعو کیا گیا۔ آٹھ ہندوستانی زبان جاننے والی عورتوں کی مدد سے ان دونوں کے درمیان بات چیت ہو سکی۔ تحائف کا انبار لگا دیا گیا۔ لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ وکٹوریا بار بار مسافرت کی تفصیل اور بچوں کی خیریت ہی پوچھتی رہیں۔ کچھ دن بعد ہندوستان میں بغاوت کی خبر انگلینڈ پہنچ گئی۔ کانپور میں انگریزوں کے اجتماعی قتل کی خبر نے انگلینڈ کو مشتعل کر دیا ۱۸۵۷ء کی بغاوت نے وکٹوریا کے رخ کو ہی بدل دیا۔ ملکہ کشور اس شکست سے ٹوٹ سی گئیں اپنی علالت کے سبب انھوں نے وطن واپس آنے کا قصد کیا۔ ۲۴ جنوری ۱۸۵۸ء کو دوپہر کے وقت پیرس میں ان کا انتقال ہو گیا اور وہیں ان کی لاش کو فوجی اعزاز کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔ ان کے مزار کے قریب فرانس کی حکومت نے ایک مسجد تعمیر کرا دی۔

اس طرح اودھ کی بیگمات کی تاریخ کا بھی خاتمہ ہو گیا اور ان کے کارنامے قصہ کہانیوں میں تبدیل ہو کر کتابوں میں محفوظ ہو گئے۔

ترجمہ: ضیا بانو

پرنس انجم قدر
(نبیرہ واجد علی شاہ و بیگم حضرت محل)
گارڈن ریچ۔ کلکتہ ۲۴

بیگم حضرت محل پارک کی تاریخی وجہِ تسمیہ

بیگم حضرت محل پارک لکھنؤ کا نام ۱۹۶۲ء میں میرے بھائی پرنس نیر قدر حال مقیم لندن کی کوششوں سے رکھا گیا تھا۔ نیر صاحب کی تحریک پر حافظ محمد ابراہیمؒ اس وقت کی حکومت یوپی کے وزیر آبپاشی (Irrigation) نے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کو ۱۸۵۷ء کی تاریخ کے ان پہلوؤں سے روشناس کرایا جو لکھنؤ اور بالخصوص قیصر باغ سے متعلق تھے۔ اس کے بعد پنڈت نہرو نے قیصر باغ وکٹوریہ پارک کا نام بدل کر "بیگم حضرت محل پارک" رکھا۔ جاہ وجلال میں غرق ملکہ وکٹوریہ کا شاہی مجسمہ کو میوزیم میں منتقل کر دیا گیا۔ اور اس جگہ ملکہ حضرت محل کا مجسمہ نصب کرنے کے لئے وزیر اعلیٰ چندربھان گپتا نے ریاستی سرکار کی جانب سے پچاس ہزار روپیہ منظور کیا۔ لیکن میرے اور پرنس نیر کے اعتراض پر کہ اسلامی رو سے مجسمہ اور وہ بھی خاتون کا نامناسب ہوگا وہ تجویز بدل دی گئی۔ حضرت محل کی مہر اور کتبہ چھتری کے نیچے سنگ مرمر کے ستون پر تانبے کی چلتیوں پر کندہ کر کے نصب کر دیا گیا اور پورے پارک کا نام "بیگم حضرت محل پارک" رکھ کر حکومت ہند کے محکمۂ آثار قدیمہ کے حوالے کر دیا گیا۔ اس محکمہ نے عوام کی اطلاع کیلئے نیلی تختی پر اپنا نوٹس لگا دیا ہے۔

ملکہ وکٹوریہ کے نام سے ایک اور وکٹوریہ پارک گول دروازہ چوک کے سامنے لکھنؤ ہی میں ہے اور اس وقت بھی موجود ہے۔ چنانچہ یہ مسئلہ بھی زیر بحث تھا کہ جب چوک والا وکٹوریہ پارک محفوظ رکھا گیا تو یہ قیصر باغ والے نام کی تبدیلی کیوں ضروری سمجھی گئی۔ حقیقتاً قیصر باغ کا پارک، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے خونچکاں داستان سے بھری ہوئی ہے یہاں کے ذرہ ذرہ میں ہندوستانی سپاہیوں اور جانبازوں کی داستانیں پیوست ہیں۔ اسی میدان جنگ میں ہندوستانی ملکہ حضرت محل نے بدیسی ملکہ وکٹوریہ کی فرنگی فوج کو شکست دیکر لکھنؤ اور اودھ کی حکومت دوبارہ حاصل کی تھی۔

اسی میدان جنگ میں برٹش کمانڈر این چیف جنرل نیل گھوڑے کی پشت پر سوار شیر دروازے سے داغے گئے توپ کے گولے سے اڑا دیا گیا تھا۔ نیل وہیں ڈھیر ہو گیا مگر اس کا زخمی گھوڑا بھاگ کر ایک فاصلہ پر گرا۔ وہیں دفن کیا گیا جہاں اب پریس کلب ہے۔ جنرل نیل کے قتل کے مقام پر انگریزوں کا لگا ہوا ایک کتبہ موجود ہے۔

اسی میدان جنگ میں بیگم کی ہندوستانی فوجوں سے فرنگی فوجیں شکست کھا کر مرتی مارتی بھاگ کر رزیڈنسی میں روپوش ہو گئی تھیں۔

اسی میدان جنگ میں حضرت باغ کے اندر واقع چاندی والی بارہ دری میں حضرت محل کے بیٹے برجیس قدر کی تاجپوشی ہوئی تھی۔ اور ان کا جلوس تاجپوشی بھی اسی میدان سے شادیانے بجاتا ہوا گزرا تھا۔

اسی میدان جنگ کے کنارے چار عالی شان کوٹھیوں کا جھرمٹ جو چولکھی کہلاتا تھا بیگم حضرت محل کی رہائش گاہ تھی۔ اور ۱۸۵۷ء میں وہ یہاں دربار بھی کرتی تھیں۔

تاجپوشی کے بعد چھ بڑے انگریز افسر قیدیوں کا مقدمہ بیگم حضرت محل کی فوجی کونسل نے اسی میدان جنگ کے اندر چولکھی میں سماعت کیا۔ یہیں سزائے موت کا حکم سنایا گیا جس کی فوراً تعمیل ہوئی۔ بیگم حضرت محل کے حکم سے وہ چھ لاشیں ایک مشترکہ قبر میں عیسائی طریقہ سے دفنائی گئیں اور اس پر ایک صلیب بھی نصب ہے۔ وہ قبر موجودہ تلسی سینما کے سامنے آج بھی موجود ہے۔ انگریزی دور

میں سنگ مرمر کا کتبہ لگا دیا گیا تھا جس پر یہ نام کندہ ہیں۔

"بیاد سر ماؤنٹ اسٹورٹ جیکسن بارٹ، کیپٹن پیٹرک
آر، لفٹننٹ برنیس، سارجنٹ میجر مورٹن، جی پی کاریو،
اور ایم جیکسن۔ ۱۸۵۷ کے مہلوکین"

دس ماہ بعد کایا پلٹ ہوئی تو انگریزی فوجوں نے بھی اسی میدان جنگ میں بیگم حضرت محل کو شکست دی۔ پانچ ہزار وفادار ہندو اور مسلم مجاہدین جنگ آزادی اسی میدان کارزار میں اپنی جانیں وطن پر نثار کر کے تاریخ بنا گئے۔ ایک بھی فرار نہ ہوا۔

یہ وہی میدان ہے جہاں خود بیگم حضرت محل ملک کو انگریزوں کے ناپاک ہاتھوں سے آزاد کرانے اور جام شہادت نوش کرنے کے جذبہ سے پردے سے باہر نکل آئی تھیں۔ مگر عین وقت پر مولانا احمد اللہ شاہ دو ہزار جانبازوں کو لے کر انگریزوں کا گھیراؤ توڑ کر گھس آئے اور بیگم اور برجیس قدر کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے بچا لے گئے اسی موقع پر حضرت محل نے کہا تھا کہ میں جانتی ہوں کہ جنگ ہار گئی ہوں۔ مگر میں یہیں میدان جنگ میں جان دے دوں گی لیکن چوکھی چھوڑوں گی نہیں۔

اسی میدان جنگ میں فتح کے بعد فرنگیوں نے بھی اپنے دو قیدیوں کو پھانسی دی۔ اور مسلمان کی لاش کو جلا کر ہندو راجہ جیالال کو نہ صرف دفن کر دیا بلکہ نشان قبر بھی مٹا کر اپنے مظالم کا اظہار کیا۔ فرنگیوں نے اپنی عیاری اور مکر و فریب کی حکمت عملی سے ۱۸۵۷ کی جنگ میں فتح کے بعد اودھ کے پایۂ تخت لکھنؤ کے اس تاریخی میدان جنگ کا نام اپنی انگریز ملکہ کے نام پر "قیصر باغ وکٹوریہ پارک" رکھا اور اس پر عالی شان مجسمہ نصب کیا تھا۔ لیکن ملک کے پہلے وزیر اعظم کو اسکی تاریخی اہمیت کی طرف جیسے ہی متوجہ کیا گیا، انھوں نے اسے ہٹوا کر میوزیم میں بھجوا دیا۔ اور اس تاریخی میدان جنگ کا نام بدل کر "بیگم حضرت محل پارک" رکھا۔

اسی کے بعد ہم لوگوں کی تحریک پر حکومت اتر پردیش نے "بیگم حضرت محل پارک" کا وہ ٹکڑا جہاں حضرت محل کے وزیر جنگ راجہ جیالال قتل کر کے مدفون کر دئے گئے تھے، "راجہ جیالال پارک" رکھ کر اور ایک تختی پر لکھ کر اس بہادر اور وطن پرست راجہ کے نام کو بھی شہرت دوام دیدی۔

چونکہ یہ میدان جنگ آزادی وطن کے لئے قربانی پیش کرنے کی ایک علامت سمجھا جاتا ہے چنانچہ جنگ آزادی کے ایک دوسرے

سورما نیتاجی سبھاش چندر بوس کا فوجی لباس میں ملبوس مجسمہ بھی اسی سابق میدان جنگ میں دوسری جگہ لگا دیا گیا ہے۔

ممکن ہے چند افراد بعض مصلحتوں کی بنا پر یا حقائق سے عدم واقفیت کے سبب اس پارک کو حضرت محل سے منسوب کرنا مناسب نہ سمجھتے ہوں یا اس سے اتفاق نہ ہو، بلکہ اس کا نام کچھ اور رکھنا چاہتے ہوں لیکن یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ ساری زمین ۱۹۶۲ء سے مرکزی حکومت کے محکمۂ آثار قدیمہ کی ملکیت ہے۔ آراضی کا مالک ہی نام بدل سکتا ہے۔

۲۔ وہ پارک قیصر باغ کے شاہی محلات کی آراضی ہونے کے سبب خاندان شاہی اودھ کی ملکیت تھا اور انگریزی سرکار بطور غاصب اس پر قابض رہی۔ اس کے بعد بھی تا ۱۹۶۲ء وہی صورت حال تھی۔ اودھ کے آخری حکمراں کے حق سے وہ زمین حضرت محل کی ملکیت تھی۔

۳۔ وہ بیگم حضرت محل کا میدان جنگ تھا۔ جس پر موصوفہ نے انگریزوں سے لڑائیاں لڑیں جیتیں اور ہاریں۔

۴۔ اس میدان جنگ میں برٹش کمانڈر ان چیف جنرل نیل کے قتل کی جگہ کی نشان دہی ہے۔ فرنگی فوجی قیدیوں کی قبر ہے۔ اور بیگم حضرت محل کے وزیر جنگ راجہ جیالال کی بھی قبر ہے۔ اور اسطرح فرنگیوں کی کم ظرفی کا مستقل مظاہرہ بھی ہے۔ یہاں آزاد ہند فوج کے کمانڈر ان چیف نیتاجی سبھاش چندر بوس کا جنگی مجسمہ بھی لگا ہوا ہے

۵۔ اسی میدان جنگ میں چاروں طرف ۱۸۵۷ کی جنگی کارروائیوں کی نشانیاں اور تاریخی شواہد موجود ہیں۔ تاجپوشی، جنگی کاؤنسل کے دربار، نامور انگریز اور ہندستانی جنگی قیدیوں پر چارہ چوبی، سزائے موت اور تعمیل، ان تمام تاریخی حقائق کی داستانیں پوشیدہ ہیں جس کے مطالعہ سے ہماری نئی نسل اپنی عظمت اور ملک اور قوم کے لئے قربانی پیش کرنے کے کارناموں سے بخوبی واقف ہو سکتی ہے۔ ان تمام باتوں سے واقف ہونے کے بعد نہ تو کسی کو اس پارک کی تاریخی اہمیت سے انکار ہو سکتا ہے نہ کسی کو یہ پسند ہو گا کہ "حضرت محل پارک" کا نام تبدیل کیا جائے۔

لازم تو یہ تھا کہ مختلف اوقات تاریخ میں پائے ہوئے ایسے نادر خطابات، افتخار النساء، ملکۂ اودھ، جناب عالیہ، راج ماتا کی حامل بیگم حضرت محل کے مانے ہوئے کارناموں اور ان کے ایثار کے مدنظر ان کے نام کی بے شمار یادگاریں مختلف طریقوں کی سارے ملک میں

مقبرہ سعادت علی خاں لکھنؤ

قائم ہوتیں۔ مگر دنیا میں صرف یہی ایک۔ بیگم حضرت محل پارک" واحد یادگار ہے جس سے موصوف کا نام نامی زندۂ جاوید ہے۔ اور روز دنیا کے اخباروں میں چھپتا ہے۔ اس کو بھی مٹا دینا یعنی حضرت محل کی یاد یکلخت محو کر دینا قوم و ملت کی احسان فراموشی ہوگی۔ یہاں چند اقتباسات مشاہیر عالم مفکرین کے بیگم حضرت محل کی اہمیت اور ان کے اعتراف میں درج کئے جاتے ہیں۔ تاکہ آزادی وطن اور ملک و قوم کے وقار کو بچانے کے لئے ان کی خدمات کو آسانی سے سمجھا جا سکے۔

ویر ساورکر

"باہمت اور قابل قدر بیگم صاحبہ کا باوجود اس قدر افراتفری کے، سارے نظام حکومت کو برقرار رکھنا ان کی لیاقت اور بے جگری کا بیّن ثبوت ہے۔"

کارل مارکس

"حضرت محل، اودھ کی بیگم نے ہندستان قومی جدو جہد آزادی میں ۱۸۵۷ء-۵۹ تک مجاہدین کی قیادت کی۔" (شائع شدہ ماسکو" دی فرسٹ انڈین وار آف انڈپنڈنس ۵۹-۱۸۵۷ء ص ۲۰۳)

سر ڈبلو، ایچ رسل

"بیگم نے سارے اودھ کو لڑنے پر آمادہ کر لیا ہے۔ اور سرداروں نے وفاداری کا حلف لیا ہے۔" (مائی انڈین میوٹنی ڈایری")

سر جادو ناتھ سرکار

"بیگمات اودھ نے تاریخ پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ ..... سلطنت کے زوال پر نمودار ہوئیں حضرت محل، بغاوت کی ہیروئین، نرم تر واجد علی شاہ کی شیر دل ملکہ۔"

("تاریخ بادشاہ بیگم" مقدمہ ۱۵ جون ۱۹۳۸ء)

وزارت اطلاعات حکومت ہند

"اودھ کے معزول پادشاہ کی بڑی بیوی حضرت محل غیر معمولی صلاحیت کی خاتون تھیں اور آزادی کی جدوجہد میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا۔ اپنے کم سن لڑکے برجیس قدر کو اس کے باپ کا جانشیں کی حیثیت سے انھوں نے اس کی سرپرستی میں حکومت کے نظم و نسق کو سنبھالا۔ لکھنؤ کی مدافعانہ جنگ میں وہ خود شریک ہوئیں اور اپنی فوجوں میں اکثر حرکت کرتی دیکھی گئیں۔ انگریزوں نے اودھ کو جب دوبارہ فتح کیا تو انھوں نے نیپال میں پناہ لی اور اپنے لڑکے کے حقوق سے دستبردار ہونے سے صاف انکار کر دیا۔"

(ترجمہ: پکچوریل پریزنٹیشن مطبوعہ حکومتِ ہند)

انگریز سرپرست فخر محل

"میں نہیں سمجھتی تھی کہ حضرت محل ایسی آفت کی پرکالہ ہے۔ خود ہاتھی پر بیٹھ کر تلنگوں کے آگے آگے فرنگیوں کا مقابلہ کرتی ہے آنکھ کا پانی ڈھل گیا ہے۔ اس کو ہراس مطلق نہیں ہے۔"

بیگماتِ اودھ کے خطوط

شیدا بیگم بنام واجد علی شاہ

"حضرت محل نے ایسی بہادری دکھائی کہ دشمن کے منھ پھر گئے۔ بڑی جیدا عورت نکلیں۔ سلطان عالم کا نام کر گئیں کہ جس کی عورت ایسی ہو جو مردانہ وار مقابلہ کرے تو اس کا مرد کیسا بہادر اور شجاع ہوگا۔"

(بیگماتِ اودھ کے خطوط)

اور بھی حقائق ہیں جن کے پیش نظر "حضرت محل" کو یاد رکھنا قومی و تہذیبی ضرورت ہے۔

□□

نوابین اودھ کے زیورات اور لباس

... صفحہ ۱۸۰ کا بقیہ

اور قیمتی لباسوں میں جایا کرتے جس سے محفلیں بھڑکیلی اور بارونق نظر آتیں۔ لباس کے ساتھ ساتھ مغل فیشن کے جوتوں میں لکھنؤ کے لوگوں نے تراش خراش کر نئی جوتیاں پیدا کیں۔ اکثر جوتے سبک، ہلکے اور انتہائی نفیس بنے ہوتے اور انھیں سجانے کے لئے کارچوبی اور بروکیڈ وغیرہ استعمال کئے جاتے۔ بعد میں ان جوتوں اور جوتیوں کی جگہ سلیپروں، چپلوں اور انگریزی طرز کے شوز نے لے لیں۔

□□

حاشیہ:

[1] زیورات اور دوسری قیمتی دھات کی اشیاء کی اوپری سطح کو مختلف قدرتی رنگوں سے سجانے کے فن کو میناکاری کہتے ہیں۔ اس کی ہلکی جھلک مثال تو ٹکسلا کی کھدائی سے حاصل قدیم عہد کے زیورات میں بھی ملتی ہے۔ مگر اس فن کو نکھرنے کا پورا موقع مغل دور میں ہی حاصل ہوا۔

سید امجد حسین
سوچیتا بھون، لکھنؤ

اُنیسویں صدی کا لکھنؤ

لکھنؤ کا ذکر آتے ہی تہذیب معاشرت کے نہ معلوم کتنے امتیازی پہلو نظروں کے سامنے آجاتے ہیں چنانچہ نوابین اودھ نے اگر ایک طرف یہ کوشش کی کہ اس کو ایسی مرکزیت حاصل ہو جائے کہ شیراز و اصفہان کا حسن و نفاست ذہنوں سے محو ہو جائے تو دوسری طرف عوام کو فنونِ لطیفہ اور خاص کر شعر و ادب سے ایسی دلچسپی پیدا ہو گئی کہ انیسویں صدی کے نصفِ اول تک پہونچتے پہونچتے لوگوں کے ادبی و فنی ذوق کا یہ عالم تھا کہ ادب بولتے تھے اور شاعری میں باتیں کرتے تھے۔ اتنا ہی نہیں معاشرتی زندگی کے ہر پہلو میں ایک مخصوص کیفیت اُبھر کر سامنے آرہی تھی۔

سماجی اور عوامی زندگی میں کتنی رنگینی و رعنائی بسی تھی عوام نے اپنے ذوق کی تسکین کے لئے کیا کیا ذرائع مہیا کر لئے تھے اور فنکاروں نے مختلف فنون کو کتنی وسعت اور بلندی تک پہنچا دیا تھا۔ ان کیفیات کے مطالعہ کے لئے اسی دور کے بہت سے مصنفین کی تصانیف سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ یوں تو لکھنوی معاشرت سے متعلق جو کتابیں لکھی گئیں ان کی تعداد بہت ہے لیکن خاص طور سے فسانۂ عجائب، فسانۂ آزاد، اُمراؤ جان ادا اور گذشتہ لکھنؤ کو زیادہ مقبولیت اور اہمیت حاصل ہے۔ لیکن راقم الحروف کا مقصد یہ ہے کہ انیسویں صدی میں ہی لکھی گئی تصانیف کے ذریعہ اس عہد کی معاشرت کے امتیازی پہلوؤں کو پیش کیا جائے اس لئے اس مطالعہ میں گذشتہ لکھنؤ کو شامل نہیں کیا جا رہا ہو۔

یوں تو ان میں سے ہر تصنیف روحِ عصر کی مکمل ترجمانی کرتی ہے جن میں کہیں نہ کہیں براہ راست تعین زمانی کے ساتھ لکھنؤ کی جیتی جاگتی، چلتی پھرتی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن فسانۂ عجائب اپنی عبارت آرائی اور صناعانہ نثر کی وجہ سے مخصوص انفرادیت کا احساس دلاتی ہے چنانچہ اس کے دیباچہ سے اس بیان کی تلخیص پیش کی جا رہی ہو جو ۱۸۵۷ء سے پہلے کے لکھنؤ کا بولتا ہوا تذکرہ ہے۔

سُنا رضواں بھی جس کا خوشہ چیں ہے
وہ بے شک لکھنؤ کی سر زمیں ہے

سُبحان اللہ وبحمدہٖ! عجب شہر گلزار ہے۔ ہر گلی دلچسپ، جو کوچہ ہے باغ و بہار ہے۔ ہر شخص اپنے طور کا باوضع قطع دار ہے۔ دو رویہ بازار کس انداز کا ہے! ہر دکان میں سرمایہ ناز و نیاز کا ہے۔ گو، ہر محلہ میں جہان کا ساز و سامان مہیا ہے۔ پر اکبری دروازے سے جلو خانہ اور پکّے پل تک کہ صراطِ مستقیم ہے۔ کیا جلسہ ہے! نان بائی خوش سلیقہ۔ شیرمال، کباب، نان نہاری بلکہ جہاں کی نعمت اس آب داری کی، جس کی بو باس سے دل طاقت پائے، دماغ معطر ہو جائے۔ فرشتہ گزرے تو سونگھے مست ہو جائے، غنودگی میں اونگھے۔ کیسا ہی سیر ہو، ذرا نہ دیر ہو، دیکھنے سے بھوک لگ آئے۔ وہ سرخ سرخ پیاز سے نہاری کا بگھار، سریلی چھنکار، شیرمال شنگرف کے رنگ کی خستہ، بُھربُھری، ایک بار کھائے نانِ نعمت کا مزہ پائے، تمام عمر ہونٹ چاٹتا رہ جائے۔

سر چوک ہمیشہ شانے سے شانہ چھلا نسیم و صبا کو سیدھا رستہ نہ ملا شیخ کول کی مٹھائی جس نے کھائی جہان کی شیرینی سے دل کھٹا ہوا۔ بنارس کا کھجلا بھولا، متھرا کے پیڑے کا مٹھا ہوا، برفی کی نفاست، بو باس کھوئے نے ہوش کھوئے۔ وہ اس کا ذرہ ذرہ پن، نقرئی ورق کا جوبن۔ کسی اور شہر کا رکاب دار اگر دیکھ پائے یا ذائقہ لب پر آئے زندگی تلخ ہو جب تک جیتا رہے۔ ہاتھ کاٹ کاٹ کر کھائے۔ امرتی مسلسل کا ہر پیچ ذائقے کو پیچ و تاب دیتا۔ یاقوتی مفرح کا جواب دیتا۔ جب منہ میں رکھا۔ اصل تو یہ ہے عسل مصفیٰ جنت کی نہر کا حلق سے اترا۔ پراچیوں کی گلی کی کھجور لذت ٹپکتی

ذائقے میں چور، بہتر از انگور نہایت آب و تاب، ہم خرما ہم ثواب۔

اگر برسات کا موسم ہے تو شہر کا یہ عالم ہے۔ ادھر مینہ برسا، پانی بہا بجا ہے بہ گیا۔ گلی کوچہ صاف رہ گیا ہے۔ ساون بھادوں میں زرد وزی جوتا پہن کر پھرے سلیقہ شرط ہے، کیچڑ تو گیا مٹی نہ برے۔ باغ بہار کے صنعت پروردگار کے رضوان جن کا شائق دیکھنے کے لائق۔ روز عیش باغ میں تماشے کا میلہ، ہر وقت چین کا جلسہ موتی جھیل کا پانی چشمۂ زندگانی کی آب و تاب دکھاتا، پیاسوں کا دل لہراتا، سڑک کے درختوں کی فضا، جدھا، کھجوا موجیں مارتا، ہارسنگار کے جنگل میں لوگوں کا جمگھٹا رنگا رنگ کی پوشاک، آپس کی جھانک تاک، تختۂ لالہ نافرمان۔ آم کے درختوں میں ٹپکا لگا۔ خاص جھولا وہیں پڑا، جھولنے والوں پر دل ٹپکا پڑتا، محبت کے پینگ بڑھتے۔ دیکھنے والے درود پڑھتے۔ باغ میں کوئل، پپیہے، مور کا شور جھولے پر گھٹا رہی اور بھی گھنگھور، ساون بھادوں کے جھالے، وہ رنگین جھولنے والے۔ رومی دروازہ اس رفعت و شان کا ہے۔ گذرگاہ ایک جوان کا ہے اگر اس پر چڑھ جائے بام فلک پست معلوم ہو۔ فرشتوں کا مشورہ کان میں آئے سپہر اولیں اس کی زمیں ہے شش جہت میں دوسرا نہیں ہے۔ مسجد انتخاب ہے، امام باڑہ لاجواب۔

شہر نفیس، مجمع رئیس ہر فن کا کامل یہاں حاصل ہے۔ خوش نویس حافظ ابراہیم صاحب سا۔ اس قطع کا قطعہ لکھا: جو میر علی یا آغا جیتے ہوتے اپنے لکھے کو روتے، اشک حسرت سے وصلیاں دھوتے۔ مرزائی صاحب کی مشق کا کوئی پرچہ اگر نظر پڑ جاتا، نیریز پریز پریز کہتا، یاقوت رقم ہیرا کھاتا۔

مرثیہ خواں جناب میر علی صاحب نے وہ طرز نو مرثیہ خوانی کا ایجاد کیا کہ چرخ کہن نے مسلّم الثبوت استاد کیا۔ علم موسیقی میں یہ کمال بہم پہونچایا۔ اس طرح کا دھرپت، خیال، ٹپا گایا اور بنایا کہ کبھی کسی نایک کے وہم و خیال میں نہ آیا۔ ایک رنگین احاطہ کھینچا ہے جو اس میں آیا، پھولا پھلا، وہ ان کا پیرو ہوا اور جس نے ڈھنگ جدا کیا۔ وہ ٹکسال باہر بدرنگ ہوا۔ اگر تان سین جیتا ہوتا۔ ان کے نام پر کان پکڑتا، بھیک مانگ کھاتا مگر نہ گاتا۔

ہزاروں شاگرد جگت استاد ہوا، مولوی سب میں پری زاد ہوا۔ امیروں میں حسین علی خاں، بلبل ہزار داستاں، خوش الحان، مرثیہ گو بے نظیر میاں دلگیر صاف باطن، نیک ضمیر، خلیق، فصیح، مرد مسکین، مکروہات زمانہ سے کبھی افسردہ نہ دیکھا۔ اللہ کے کرم سے ناظم خوب، دبیر مرغوب۔ سکندر طالع، بصورت گدا بار احسان اہل دول کا نہ اٹھایا۔ عرصۂ قلیل میں مرثیے سلام کا دیوان کثیر فرمایا۔ شہر میں جتنے رئیس تھے ان کے انیس، جلیس تھے۔

چالیس سال جہان کی دیکھ بھال کی۔ ایسا شہر، یہ لوگ نظر سے نہ گزرے چنانچہ میاں محمد اشرف نواب معتمد الدولہ بہادر کے زمانے میں باورچی خانے کے داروغہ تھے، آدمیت، مروت، ہمت ہزاروں مرد آدمی ان کی ذات سے فیض پاتا تھا۔ جہان کی نعمت کھاتا تھا، کاریگر ایسے: معتمد الدولہ بہادر کے دسترخوان پر سوا امرا ہوتے تھے، چھ مہینے تک جو چیز ایک دن روبرو آئی دوسرے دن تکرار نہ ہونے پائی۔

اور تو اور، شہدا پیر بخارا کا، ٹماسا، سید الشہدا کا شیدا، برس روز میں جو پیدا کیا عشرۂ محرم میں محتاجوں کو نذر حسینؑ کھلا دیا۔

مشائخ، فقیروں کے مزار خوب، خواب راحت میں آسودہ سالکؒ مجذوب، شاہ مینا، شاہ پیر محمد، شاہ خیر اللہ ایک سے ایک سبحان اللہ بظاہر مردہ، حقیقت میں جیتے ہیں۔

یہ شہر ایسا تھا جیتے جی یہاں سے نہ نکلے مر گئے، پر یہیں رہے اور یوں تو، ؎ کس نگوید کہ دروغ من ترش است

بس کہ خامۂ مولف اختصار رقم ہے مگر جتنا اس کی صفت میں لکھئے بہت کم ہے لہذا اس غزل پر مطلب کو اختتام دیا۔ یہ داستان وہ نہیں جو لکھی جائے۔ ناچار تمام کیا۔

غزل

گو ملے جنت بھی رہنے کو بجائے لکھنؤ
چونک میں اٹھتا ہوں اس پر کہ کے ہائے لکھنؤ

رشک کھا کھا، گو فلک مجھ سے چھڑائے لکھنؤ
تب میں جانوں دل سے جب میرے بھلائے لکھنؤ

دشت غربت میں کیا برباد وحشت نے تو کیا
دل سے اڑتی ہے کوئی اپنے ہوائے لکھنؤ

یہ رہے آباد یارب تا بہ دور مشتری
میں کہیں ہوں مانگتا ہوں پر دعائے لکھنؤ

بلبل شیراز کو ہے رشک ناسخ کا سرور
اصفہاں اس نے کیے ہیں کوچہ ہائے لکھنؤ

الٰہی! بہ حرمت سید ابرار احمد مختار و بہ تصدق ائمۂ اطہار لکھنؤ کو آباد رکھ۔ جب تک گنگا جمنا میں پانی بہے، یہ خطۂ دل چسپ، شاید سرشار سے بہتر اس عہد اور ماحول کی تنقید کوئی دوسرا نہیں کر سکتا تھا جس میں زندگی کے حقائق بھی پیش کر دئے گئے ہیں۔ اور غیر حقیقی تصویریں بھی۔ سرشار نے محسوس کر لیا تھا کہ لکھنؤ کی تہذیبی زندگی میں وہ استحکام باقی نہیں رہ گیا تھا جو پہلے تھا بلکہ اب سوائے زوال اور انحطاط کے کچھ نہیں تھا۔ چنانچہ وہ مٹتی ہوئی

تہذیب پر آنسو ضرور بہاتے ہیں لیکن یہ احساس بھی دلاتے ہیں کہ اس حقیقت کو ماننا پڑے گا کہ ایک نیا معاشرہ اُبھر رہا ہے۔ اسی لئے انھوں نے اس دور کی خوبیاں اور خامیاں پوری بیباکی سے پیش کردی ہیں۔ کسی نے لکھا ہے کہ سرشار ایک جادوگر ہیں جن کی جھولی میں ہر طرح کے سامان موجود ہیں چنانچہ اس عہد کی لکھنوی معاشرت کے ہر پہلو فسانۂ آزاد میں دیکھے جاسکتے ہیں البتہ خوجی کے کردار کے ذریعہ زیر نظر تصنیف کی مقبولیت و اہمیت میں غیر معمولی اضافہ پیدا ہوگیا ہے۔ دوسری طرف یہ چیز بھی قابل توجہ ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد بھی لکھنؤ میں جو چہل پہل تھی اور جو تہذیبی نقوش کی چمک دمک تھی اس کی بہترین تصویر فسانۂ آزاد میں ملتی ہے۔ یہ لکھنؤ کے انیسویں صدی کی چھٹی، ساتویں اور آٹھویں دہائی کا زمانہ ہے۔ فسانۂ آزاد کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ اس نے ہندوستانی ادب بلکہ ہندوستانی عوام کے مزاج اور اس کی روایات کو ایک لڑی میں پیوست کردیا جس کے اثرات آج تک دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس کا مصنف اردو کے دو اہم مراکز لکھنؤ اور حیدرآباد کا نقطۂ اتصال تھا۔ راقم الحروف نے صرف وہ اقتباسات منتخب کئے ہیں جس سے لکھنؤ کی تین اہم تقریبات پر روشنی پڑتی ہے۔ ان میں دو تقریبات یعنی عید اور محرم مذہبی رنگ بھی رکھتی ہیں لیکن ان کا بیان قومی یکجہتی کا بے مثال نمونہ ہے۔ اس کے علاوہ اس عہد کے مزاج، نفسیات طرز فکر اور اہل لکھنؤ کے فلسفۂ اجتماعیت پر بھی روشنی پڑتی ہے

ان تمام اقتباسات میں صرف تقریبات ہی نہیں ہیں بلکہ ان سے اس عہد کا لباس، وضع قطع، مختلف پیشے کے افراد کا پہناوا، مزاج، نفاستیں، عیش پرستیاں، رنگینی، مختلف علوم و فنون کے نکات و رموز اور صنّاعی سے بھرپور سرشار کے سحرکارانہ اسلوب پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

لکھنؤ کا محرم الحرام

سینوں میں جگر پہ تیر غم چلتے ہیں — رخساروں پہ اشک شمعساں ڈھلتے ہیں
کیوں تعزیہ خانوں میں نہ رونق ہو زیادہ — دل بھی تو چراغوں کی طرح جلتے ہیں

میاں آزاد سیلانی آدمی سیر سپاٹے پر ادھار کھائے ہوئے اٹر گشتی کی دھن جو سمائی تو ریل کے انجن کی طرح چل کھڑے ہوئے اور سوچے کہ چل کر محرم لکھنؤ کا دیکھ لیں۔ دیکھتے کیا ہیں کہ گھر گھر شیون و شین، گھر گھر بکا و بین گریہ وزاری، اشکباری، ہجوم غفیر، مجمع کثیر اور کیوں نہ ہو مجالس عزا کی دھوم دھام ہے۔ لکھنؤ کا محرم الحرام ہے۔ لکھنؤ کی سوزخوانی، لکھنؤ کی خوش بیانی، لکھنؤ کی عزاداری، لکھنؤ کی سوگواری از شام تا روم مشہور مرز و بوم ہے۔ تعزیہ خانوں میں دھوم، امام باڑوں میں ہجوم ہے اور ان سب میں حسین آباد مبارک کالبدر فی النجوم ہے۔ ان کے ساتھ ان کے دوست بھی ہولئے تھے۔ ان کی بے قراری کا حال کچھ نہ پوچھئے۔ وہ لکھنؤ سے واقف نہ تھے۔ لوٹے جاتے ہیں کہ شہید کربلا کا واسطہ، آل مصطفےٰ کا صدقہ۔ ہمیں لکھنؤ کا محرم دکھادو مگر کوئی جگہ چھوٹنے نہ پائے۔ ایک شخص نے ایک آہ سرد کھینچ کر کہا میاں اب وہ لکھنؤ کہاں، وہ لوگ کہاں، وہ دل کہاں۔ لکھنؤ کا محرم رنگیلے پیا جان عالم کے دور میں دیکھتا تو ارن گوئے اوج طور بھی غش کھا کر گر جاتا بانکوں کی شمشیر دو پیکر جب دکھیوریان سے دو انگل باہر کسی نے ذرا تیکھی چتون کی اور انھوں نے کھٹ سے سر ہی کا تلا ہوا ہاتھ چھوڑا۔ بھنڈارا کھل گیا۔ ایک ایک گھنٹوں میں بیس بیس خانہ جنگیوں کی خبر آتی تھی۔ دوکان دار جوتیاں چھوڑ کر سٹک جاتے تھے۔ وہ دھکم دھکا وہ بھیڑ بھڑکا ہوتا تھا کہ واہ جی واہ! انتظام کرنا خالہ جی کا گھر نہ تھا۔

اب کوئی چوں بھی نہیں کرتا۔ ادنیٰ ادنیٰ آدمی ہزار دل لٹاتا تھا۔ اب کوئی بھی اندر حسین نہیں نکالتا۔ اب انیسؔ ہیں نہ دبیرؔ، مونسؔ ہیں نہ شمشیرؔ ضمیرؔ ہیں نہ دلگیرؔ۔

ایک ہی رباعی پڑھی اور سامعین چار موجہ حیرت میں غرق ہوگئے کہ اللہ اللہ یہ فصاحت یہ بلاغت۔

مداح امیر ابن امیر آتا ہے — دربار امین شاہوں کے فقیر آتا ہے
مشتاق سخن خلق چلی آتی ہے — لو مرثیہ پڑھنے کو دبیرؔ آتا ہے

اور انیسؔ مغفور خدا بخشے باللہ العظیم کلام کیا جواہرات کے ٹکڑے قند و بنات کے ریزے نور کے مرثیے ہیں۔ فصحائے خطۂ پاک ایران تک کہتے ہیں کہ کجا انیسؔ کجا فردوسی کجا کر بند مرصع کجا شال طوسی، بزم میں وہ ڈھنگ رزم میں وہ رنگ کہ ؎

مضمون انیسؔ کا نہ جبریل اُترا — اترا بھی تو کچھ بگڑے کا نقشہ اُترا
نقاش نے سو طرح کی خفت کھینچی — تصویر نہ کھینچ سکی تو چہرا اُترا

لیکن ہاتھی لٹے گا بھی تو کہاں تلک۔ اب بھی اس شہر کی ایسی عزاداری ہفت اقلیم میں نہیں ہوتی۔

پوتڑے چلے جاتے تھے راہ میں وہ بھیڑ، وہ ریل پیل کہ عیاذاً باللہ!

شانے سے شانہ چھلتا تھا۔ ہوا جب بد خرابی بصر کہیں گذر پائے توفیق النفس ہو جائے۔ بانکے ترچھے ثقات مقدس، کس و ناکس، غریب امیر، برنا و پیر اُمڈے چلے آتے ہیں۔ جدھر دیکھو نرالی سج دھج، سوسن پاک مثل کعبہ سیاہ پوش۔ کوئی ماتم حسین میں برہنہ سر چلا جاتا ہے۔ کوئی حلہ پوشان بہشت کی طرح ہرا ہرا جوڑا پھڑکاتا ہے۔

لیجئے آغا باقر کے امام باڑے میں کھٹ سے داخل۔ اُہو ہو ہو خدا کی قدرت مجسم نظر آتی ہے۔ واہ میاں باقر کیوں نہ ہو۔ نام کر گئے۔ چکا چوند کا عالم ہے لیکن گلی تنگ تماشائیوں کی عقل دنگ، جائے تنگ است مرد ماں بسیار۔ گھس بیٹھ کر خلقت وہاں سے جو طرارہ بھرا تو حسین آباد مبارک میں پہنچے۔ سبحان اللہ سبحان اللہ۔ یہ امام باڑہ ہے یا روضۂ رضوان۔ الٰہی یہ مکان ہے یا باغ جناں۔ ہر در و دیوار سے محمد علی شاہ فردوس آرام گاہ کا نام روشن ہے۔ امام باڑہ سجا سجایا دلہن کا ایسا جوبن ہے۔ برجوں پر ضیائے حور تو منار نور علی نور۔ حیرت تھی کہ یہ کوہ نور ہے یا شعلہ طور ہے۔ سرخ و قندیل پر یاقوت احمر پیرا کھائے۔ چراغاں کی قطار پر مہتاب پروانہ ہو جائے پھر نہر مصفا جو نظر آئی تو آنکھوں نے عجب طراوت پائی۔

ماتم داران جناب سید الشہدا علیہ التحیتہ والثنا اور زائرین مصائب خاصی آلِ عبا کی اشک باری اور گریہ وزاری سے یقین کامل ہو گیا کہ ماتم داری لکھنؤ پر ختم ہے۔ عاشورہ کی رات تو نچوڑ کا دن تھا۔

چہل پہل عید

نواب گردوں مدار مع یاران موافق و احباب صادق عیدگاہ تشریف لے گئے۔ دیکھا کر ساکنین بناؤ چناؤ کر کے ٹھسے کے ساتھ بیٹھیں۔ تختوں پر سفید سفید چاندنیاں بچھی ہیں۔ سامنے پاندان رکھا ہے۔ برنجی حقے لگے ہوئے ہیں۔ دائیں بائیں ایک ایک لگن آگ کے نیچے روشن۔ چلمیں بھرنے کے لیے دو آدمی حاضر ہیں۔ یاران سر پل کا جھرمٹ ہے۔ پالوں اور پھولداریوں میں گھس گھس کے دم لگاتے ہیں۔ آسمان تک لو پہنچاتے ہیں۔ کسی کی پھولداری میں دائرہ بج رہا ہے۔ کہیں ساقن کے سامنے نٹنی ڈھولکی پر گاتی ہے اور چمک دمک کے تماشائیوں کو لبھاتی ہے۔ ساتھی چکارہ بجاتے ہیں۔ بیفکرے پھبتیاں سناتے ہیں۔ حلوائیوں کی دکانوں پر دھوم ہے۔ افیمیوں اور دٹھوروں کا ہجوم ہے۔ کھلونے والے، بھولے بھالے کھلونے رکھے دکان جمائے۔ دونوں ہاتھوں سے لوٹتے ہیں۔ ننھے ننھے بچے مچل رہے ہیں کہ ہم تو ٹٹی کا بوا لیں گے۔ دو پیسے دیں گے۔ عیدگاہ کے پھاٹک پر پہونچے تو ہوادار گاڑی اور نٹن اور گھوڑوں کا تانتا لگا ہوا۔ حوض پر بیٹھے منہ ہاتھ دھویا دست پاک سے ہاتھ پوچھا۔ اتنے میں آواز آئی (الصلوٰۃ الصلوٰۃ)

نمازی جھک پڑے۔ صفیں بندھیں پیش نماز آگے کھڑے ہوئے نواب صاحب بھی ایک صف میں داخل ہو گئے۔ نماز پڑھ کر احباب سے بغل گیر ہوئے۔

حضور نواب صاحب روانہ ہوئے چٹکیوں میں گھر پہنچے۔ باہر کمرہ میں بیٹھے۔ رفقا نے نذر دکھائی۔ اس کے بعد اندر تشریف لے گئے محل دار نے پردہ اٹھایا۔ خدمتگاروں اور چوبداروں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہا۔

دو قابوں میں نان خطائی، ایک قاب میں جوزی۔ کسی میں نہایت خستہ پٹیرے میں آٹھ سیر گھی کھپایا ہوا۔ اچاری میں پیٹھے کی سرخ سرخ مچھلیاں معلوم ہوتا تھا کہ سچ مچ کی مچھلیاں ہی تیر رہی ہیں۔ قوام آبدار اور برف کا سا سفید۔ اچاری پر سرخ اطلسی اور کلابتوں کی ڈوری بندھی ہوئی۔ ادھر ادھر مقیش کے پھندے لٹکے ہوئے بڑی بیگم صاحب کے سامنے ڈالی لگائی گئی۔ اس کے بعد رحیم بخش باورچی آیا۔ ایک قاب میں شامی کباب ایک میں پراٹھے بلدار مغلئی خستہ، کسی میں پسندے کباب، کسی میں کوفتے کباب سرخ عمدہ باقر خانی ایک قاب میں ہوا کی روٹی، ایک میں نان بشیر۔ کوری کاغذی ہنڈیا میں شکر قند کی گلتھی۔ برابر کی بالائی دی ہوئی، کیوڑا پڑا ہوا۔ یہ ڈالی بھی بیگم کے سامنے پیش ہوئی۔

امراؤ جان ادا ۱۸۹۹ء میں منظر عام پر آئی۔ رسوا کا لکھنؤ ان کا معاصر لکھنؤ ہے۔ امراؤ جان کے حالات کم و بیش ۱۸۲۷ء سے شروع ہوئے لیکن ان کا سلسلہ غدر کے بعد تک ہے —— امراؤ جان سے صرف وہ حصے منتخب کئے گئے ہیں جن سے ایک خوشحال دیہات، دیہات سے شہر اور پھر انتزاع سلطنت کے واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔ در اصل ناقدین نے امراؤ جان کو طوائف کی حیثیت سے پیش کرنے پر زیادہ توجہ دی ہے اور یہی موضوع زیادہ تر زیر بحث رہا۔ راقم الحروف کے اس کردار میں متحرک کیمرہ نظر آتا ہے جو معاصر لکھنؤ کے تقریباً ہر گوشے کو روشنی میں لاتا ہے۔

شہر سے دیہات تک

شہر سے نکل کے جنگل کا ساماں قابلِ دید تھا۔ جدھر نگاہ جاتی ہے سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ بادل چاروں طرف گھرے ہوئے ہیں۔ مینہہ برس رہا ہے۔ درختوں کے پتوں سے پانی ٹپک رہا ہے۔ نالے ندیاں بھری ہوئی ہیں۔ مور ناچ رہے ہیں۔ کوئل کوک رہی ہے۔ بات کہتے میں تالاب تک پہونچ گئے۔ بارہ دری میں فرش کیا گیا۔ چولھے بن گئے، کڑھائیاں چڑھ گئیں۔ پوریاں تلی جانے لگیں۔ نواب چھٹن صاحب برساتی ہرن کے شکار کو نکل گئے۔ گوہر مرزا آموں کی کھانچیاں چکالائے۔ اتنی دیر میں نوکروں نے سڑک کے کنارے باغ میں پھولداریاں گاڑ دیں۔ گاؤں سے چارپائیاں آگئیں۔ یہاں اور ہی لطف تھا آم ٹپک رہے ہیں۔ ایک ایک آم پر چار چار آدمی ٹوٹے پڑتے ہیں۔ پانی میں چھپکے لگا رہے ہیں۔ کوئی اُدھر دوڑا جاتا ہے کوئی اِدھر۔ آپس میں دھینگا مشتی ہو رہی ہے۔ اب اس میں اگر کوئی گر پڑا تو کیچڑ میں لت پت۔ تھوڑی دیر پانی میں جا کے کھڑے ہوگئے پھر ویسے ہی صاف۔ جن کے مزاج میں کسی قدر احتیاط تھی جیسے باجی بیگا جان وہ پھولداری میں بیٹھی رہیں۔ دو گھڑی دن رہے ہماری قسمت سے آسمان کھل گیا۔ دھوپ نکل آئی۔ ہم لوگ احتیاطاً ایک ایک جوڑا گھر سے لے آئے تھے۔ سب نے کپڑے بدلے جنگل کی سیر کو نکلے۔

میں بھی اکیلی ایک طرف کو روانہ ہوئی۔ سامنے گنجان درخت تھے سورج انھیں گنجان درختوں کی آڑ میں ڈوب رہا تھا۔ سبزے پر سنہری کرنوں کے پڑنے سے عجیب کیفیت تھی۔ جا بجا جنگلی پھول کھلے تھے۔ چڑیاں سبزے کی تلاش میں ادھر اُدھر اڑ رہی تھیں۔ سامنے جھیل کے پانی پر آفتاب کی شعاع سے وہ عالم نظر آتا تھا جیسے پگھلا ہوا سونا تھلک رہا ہے۔ درختوں کے پتوں کی آڑ میں سورج کی کرنیں اور ہی عالم دکھا رہی تھیں۔ آسمان پر سرخ شفق پھولی ہوئی تھی۔ اس وقت کا سماں ایسا نہ تھا کہ ایک خفقانی مزاج کی عورت جیسی کہ میں ہوں۔ جلدی سے پھولداری میں چلی آتی۔ یہ تماشہ دیکھتی ہوئی خدا جانے کتنی دور نکل گئی۔ آگے جا کر ایک کچی سڑک ملی اس پر کچھ گنوار رستہ چل رہے تھے کسی کے کندھے پر ہل تھا۔ کوئی بیلوں کو ہانکتا ہوا چلا آتا تھا۔ ایک چھوٹی سی لڑکی گائے بھینس لئے ہوئے چلی جاتی تھی۔ ایک لڑکا بہت سی بھیڑیں اور بکریوں کے پیچھے تھا۔ یہ سب آنکھوں کے سامنے آئے اور پھر نظروں سے غائب ہو گئے۔ میں پھر اکیلی رہ گئی نہیں معلوم کس دھن میں تھی مگر اب میں سڑک پر چلنے لگی۔ اپنے نزدیک میں اب گویا تالاب کی طرف چل رہی ہوں اب اندھیرا ہوتا جاتا ہے۔ سورج ڈوبنے ہی کو ہے۔ اب میرا قدم جلد جلد اٹھ رہا ہے آگے چل کر ایک فقیر کا تکیہ ملا یہاں کچھ لوگ بیٹھے حقہ پی رہے تھے یہاں میں نے تالاب کا راستہ پوچھا۔ معلوم ہوا کہ میں لکھنؤ کی سڑک پر جا رہی ہوں تالاب داہنے کو چھوٹ گیا ہے۔

ادبی نشست

اس میں شک نہیں کہ منشی صاحب نے آج کے جلسے کے لئے بڑے سلیقے سے انتظام کیا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ مہتابی پر دو گھڑی دن رہے چھڑکاؤ ہوا تھا تاکہ شام تک زمین سرد رہے اسی پر دری بچھا کے اُجلی چاندنی کا فرش کر دیا گیا تھا۔ کوری کوری صراحیاں پانی بھر کے، کیوڑا ڈال کے منڈیر پر چنوا دی گئی تھیں۔ ان پر بالو کے آبخورے ڈھکے ہوئے تھے۔ برف کا انتظام علیحدہ کیا گیا تھا۔ کاغذی ہنڈیوں میں سفید پانوں کی سات سات گلوریاں سرخ صافی میں لپیٹ کر کیوڑے میں بسا کر رکھ دی گئی تھیں ڈھکنیوں پر تھوڑا تھوڑا کھانے کا خوشبودار تنباکو رکھ دیا تھا۔ ڈیڑھ نیچے حقے کے نیچوں میں پانی چھڑک چھڑک کر ہار لپیٹ دیے تھے۔ چاندنی رات تھی اس سے روشنی کا انتظام زیادہ نہیں کرنا پڑا۔ صرف ایک سفید کنول دورے کے لئے روشن کر دیا گیا تھا۔ آٹھ بجتے بجتے سب احباب میر صاحب، آغا صاحب خان صاحب، شیخ صاحب، پنڈت صاحب وغیرہ وغیرہ تشریف لائے پہلے شیر فالودہ کے ایک ایک پیالے کا دور چلا پھر شعر و سخن کا چرچا ہونے لگا۔

لکھنؤ کا ایک دیہات

میری پھوپی کے لڑکے کے ساتھ ٹھہری ہوئی منگنی نو برس کے سن میں ہوگئی تھی۔ اب ادھر سے شادی کا تقاضہ تھا۔ میری پھوپی نواب گنج میں بیاہی ہوئی تھیں۔ پھوپا ہمارے زمیندار تھے۔ پھوپی کا گھر ہمارے گھر سے زیادہ بھرا پرا تھا منگنی ہونے سے پہلے میں کئی مرتبہ اپنی ماں کے ساتھ وہاں جا چکی تھی۔ وہاں کے کارخانے ہی اور تھے۔ مکان تو کچا تھا مگر بہت وسیع۔ دروازے پر چھپر پڑے تھے۔ گائے بیل بھینس بندھتی تھیں۔ گھی دودھ کی افراط تھی۔ اناج کی کثرت۔ بھٹوں کی فصل میں ٹوکروں بھٹے چلے آتے ہیں۔ کناروں کی پھاندیاں پڑی ہوئی ہیں۔ ادھر

کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ کوئی کہاں تک کھائے۔

گالیاں

آپ کے لکھنؤ میں تو رنڈیاں گالیاں نہیں گاتیں۔ ڈومنیاں البتہ گاتی ہیں وہ بھی عورتیں ہیں۔ دیہات میں رنڈیوں کو گانا پڑتی ہیں۔ مردوں میں واقعی مرزا صاحب شہر ہو یا دیہات یہ رسم تو کچھ اچھی نہیں ہے۔

آپکے کہنے سے اچھی نہیں ہے۔ ہم نے ان آنکھوں سے دیکھا ہے اور ان کانوں سے سُنا ہے۔ اچھے اچھے شریف مرد آدمی اور عورتیں میں گھس کے شوقیہ گالیاں سُنتے ہیں۔ ماں بہنیں تو لی جارہی ہیں اور یہ خوش ہیں باچھیں کھلی جاتی ہیں۔ آج خدا نے یہ دن دکھایا۔ کاش خدا یہ دن نہ دکھاتا۔ اس کے علاوہ برات کی رات اور صبح جو بیہودگیاں باعصمت بہو بیٹیوں میں ہوتی ہیں ان کا ذکر ہی کیا۔ خیر ان باتوں کو رہنے دیجئے۔ اپنی بیتی کہئے۔ ہم کوئی مصلح قوم نہیں جو ان باتوں پر نکتہ چینی کریں۔

غدر کا ھنگامہ

دیکھئے پہنچے کہاں تک شورشِ دل کا اثر
صرصرِ وحشت کا یہ شعلہ ہے بھڑکایا ہوا

نواب ملکہ کشور کی سرکار میں سوز خوانی کا سلسلہ انتزاع سلطنت کے زمانے تک رہا۔ اس اثنا میں شہزادے مرزا اسکندر حشمت عرف جرنیل صاحب کے مجرائیوں میں میرا بھی نام ہو گیا تھا۔ جناب عالیہ اور جرنیل صاحب کلکتہ چلے گئے وہ تعلق منقطع ہو گیا۔

جس زمانے میں مرزا برجیس قدر کو مسند ریاست پر بٹھایا۔ میں بہ لحاظ قدامت اور اس وجہ سے بھی کہ میرا نام شاہی محلات میں اکثر کی زبان پر تھا مبارکباد دینے کے لئے طلب ہوئی۔ شہر میں ایک اندھیر تھا۔ آج اس کا گھر لٹا۔ کل وہ گرفتار ہوا پرسوں اس کے گولی لگی۔ چاروں طرف قیامت کا سامان نظر آتا تھا۔ سید قطب الدین نامی ایک صاحب افسران فوج میں تھے۔ ان کا تعین در دولت پر تھا میرے حال پر بہت عنایت کرتے تھے۔ اس لئے اکثر وہیں رہنا پڑتا تھا مجرے کے لئے بھی وقت بے وقت طلب ہو جاتی تھی۔

اس چند روزہ حکومت کے زمانے میں برجیس قدر کے گیارہویں سال کی سالگرہ کا جلسہ بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ اس جلسہ میں کشمیریوں نے یہ غزل گائی تھی۔

غیرت مہتاب ہے برجیس قدر
گوہر نایاب ہے برجیس قدر

رسوا:۔ بھلا کچھ یاد ہے کہ کس دن بیگم صاحب قیصر باغ سے نکلی تھیں؟

امراو:۔ دن تو یاد نہیں۔ ہزاری روزے کے دو یکر یا تیسرے دن

رسوا:۔ ہاں تمہیں یاد رہا۔ رجب کی انتیسویں تاریخ تھی بھلا فصل کون سی تھی؟

امراو:۔ آخیر جاڑے تھے نوروز کے چار پانچ دن باقی رہے ہوں گے۔

رسوا:۔ بالکل درست۔ مارچ کی سولہویں تاریخ تھی۔ اچھا تم بیگم صاحب کے ساتھ قیصر باغ سے نکلیں۔

امراو:۔ جی ہاں بونڈی تک ہمراہ گئی۔ راستے میں نمک حرام اور بزدل افسران فوج کے غزے اور بیگم صاحب کی خوشامد عمر بھر نہ بھولے گی۔ ایک صاحب کہتے ہیں۔ "تو صاحبان کے راج میں ہم پیدل چلیں"۔ دوسرے صاحب فرماتے ہیں "بھلا کھانے کا انتظام تو درست ہوتا"۔ تیسرے صاحب افیم کو پیٹ رہے تھے چوتھے اپنی جان کو رو رہے تھے کہ حقہ وقت پر نہیں ملتا۔ جب بہرائچ سے انگریزی فوج نے بونڈی پر حملہ کیا ہے اس میں سید قطب الدین مارے گئے بیگم صاحب نیپال کی طرف روانہ ہوئیں۔ میں اپنی جان بچا کے فیض آباد چلی آئی۔

□□

طلسمِ شامِ اودھ کا چراغ روشن ھے

یہ لکھنؤ کی چکن یہ زری کی شام و سحر
ہر ایک تار میں سو بار اُلجھے تارِ نظر
یہ جامدانی ہے یا کہکشاں کی راہ گزر
یا ایک تختۂ گل رات بھر کی اوس میں تر

سیاہ رات بھی آئے تو صبح گلشن ہے
طلسمِ شامِ اودھ کا چراغ روشن ہے

ڈاکٹر راہی معصوم رضا

چھوٹا امام باڑہ حسین آباد لکھنؤ